رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳

مقرر کردہ زیر پنجاب ایکٹ ۲، ۱۹۵۴

المعروف

منیر انکوائری رپورٹ

نیا زمانہ

نیا زمانہ پبلیکیشنز

ابتدائیہ

منجانب:۔

عدالت تحقیقات فسادات پنجاب۔لاہور

بخدمت:۔

جناب ہوم سیکرٹری صاحب حکومت پنجاب لاہور

لاہور، مؤرخہ ۱۰راپریل ۱۹۵۴ء

جناب والا!

ہم اس عدالت تحقیقات کے صدر اور رکن کی حیثیت سے جو فسادات پنجاب (تحقیقات عامہ) ایکٹ ۱۹۵۳ء کے تحت وجود میں لائی گئی۔ آپ کی خدمت میں ذیل کی رپورٹ پیش کرتے ہیں:۔

عدالت کی ترکیب

مارچ ۱۹۵۳ء کے آغاز میں پنجاب کی سرزمین پر وسیع فسادات پھوٹ پڑے۔ جو بعض مقامات پر اپریل ۱۹۵۳ء کے وسط تک جاری رہے۔ ان فسادات نے ایسا ہولناک رنگ اختیار کیا اور ایسی پرخطر شکل پکڑ لی کہ متعدد مقامات پر ملٹری کو طلب کرنا پڑا اور لاہور میں تو مارشل لاء کا اعلان کیے بغیر چارہ نظر نہ آیا۔ جو مئی ۵۳ء کے وسط تک نافذ رہا۔ مارشل لاء کے اعلان سے پیشتر پولیس کو کئی مقامات پر گولی چلانی پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو آدمی ۴ر مارچ کی رات کو اور دس نفوس ۵ر مارچ کو

…ارے گئے، گولی چلنے سے مزید چھیاسٹھ افراد ضرور زخمی ہوئے ہونگے کیونکہ لاہور کے ہسپتالوں میں جو زخمی داخل کیئے گئے ان میں چھیاسٹھ ایسے تھے جن کے جسموں پر گولی کے زخم تھے، لاہور کی آتش فسادات کو فرو کرنے میں ملٹری کو جو کچھ کرنا پڑا اس میں ملٹری کے اعتراف کے مطابق گیارہ ہلاک اور ۴۹ زخمی ہوئے۔ دوسرے شہروں میں بھی پولیس یا فوج کے گولی چلانے سے چند اشخاص ہلاک اور زخمی ہوئے۔

یہ فسادات کیوں ہوئے؟ بات یوں ہوئی کہ ۱۶ر جنوری سے لے کر ۱۸ر جنوری ۵۳ء تک کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن منعقد ہوئی۔ جس نے ایک مجلس عمل ترتیب دے دی۔ اس مجلس عمل نے چند علماء کو یہ اختیار دیا کہ وہ ایک وفد کی صورت میں وزیر اعظم پاکستان کو بتاریخ ۲۱ر جنوری ۵۳ء بمقام کراچی ایک الٹی میٹم دے دیں چنانچہ اس وفد نے الٹی میٹم دے دیا جس کو خواجہ ناظم الدین (تب وزیر اعظم پاکستان) نے رد کر دیا۔ یہی استرداد فسادات کے پھوٹ پڑنے کا باعث ہوا۔ الٹی میٹم یہ تھا کہ اگر ایک مہینے کے اندر اندر قادیانی احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار نہ دے دیا گیا، چوہدری ظفر اللہ خان احمدی وزیر خارجہ کو موقوف نہ کر دیا گیا اور دوسرے احمدی جو مملکت میں کلیدی عہدوں پر فائز ہیں ملازمت سے علیحدہ نہ کر دیئے گئے تو مجلس عمل ڈائرکٹ ایکشن (راست اقدام) کرے گی۔ ۲۷ر فروری کی صبح کی ابتدائی ساعتوں میں مرکزی حکومت کے وزرا اور مغربی پاکستان کے صوبوں کے نمائندہ حضرات کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ الٹی میٹم کو رد کر دیا جائے اور مجلس عمل کے ممتاز ممبروں کو کراچی میں اور تحریک کے بعض لیڈروں کو پنجاب میں گرفتار کر لیا جائے۔ اس فیصلے پر عمل ہونے کے ساتھ ہی فسادات شروع ہو گئے جو براہ راست ان گرفتاریوں کا نتیجہ تھے۔

۱۹ر جون ۱۹۵۳ء کو گورنر پنجاب نے آرڈی نینس (۳) ۱۹۵۳ء صادر کیا۔ جو ہماری تجویز کردہ بعض ترمیمات کے بعد فسادات پنجاب (تحقیقات عامہ) ایکٹ ۱۹۵۳ء بن گیا۔ جس میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ فسادات کے متعلق تحقیقات عامہ کرنے کی غرض سے ایک عدالت قائم کی جائے۔ آرڈینینس کی دفعہ ۳ کی ذیلی دفعہ (۱) کے ماتحت جو اختیارات گورنر کو حاصل ہیں ان کو استعمال کرتے

صوبے کے گورنر تھے۔ان کے بعد مسٹر آئی، آئی چندریگر مقرر ہوئے جو مارشل لاء کے اعلان کے بعد تک اس عہدے پر فائز رہے۔صرف چند مہینے مسٹر فدا حسین چیف سیکرٹری حکومت پنجاب کے عہدے پر متمکن ہوئے۔باقی عرصہ حافظ عبدالمجید چیف سیکرٹری رہے۔یہی صاحب ۳۰ ستمبر سے ۷/ دسمبر ۱۹۵۱ء تک ہوم سیکرٹری بھی تھے۔سید احمد علی ۷ ار مارچ ۱۹۴۹ء سے ۳ر ستمبر ۱۹۵۱ء تک ہوم سیکرٹری رہے اور مسٹر غیاث الدین احمد ۷/ دسمبر ۱۹۵۱ء سے ہوم سیکرٹری چلے آتے ہیں۔مسٹر قربان علی خاں ۱۱ر فروری ۱۹۵۳ء تک انسپکٹر جنرل پولیس رہے۔ان کے عہدے کا چارج مسٹر انور علی نے لیا جو انسپکٹر جنرل پولیس کے فرائض کے ساتھ ساتھ اپنے اصلی عہدے یعنی ڈی آئی جی سی آئی ڈی کے وظائف بھی برابر ادا کرتے رہے۔حافظ عبدالمجید، مسٹر غیاث الدین، مسٹر انور علی، مسٹر ایس این عالم، سید اعجاز حسین شاہ اور مرزا نعیم الدین اپنے عام سرکاری فرائض کی بجا آوری کی وجہ سے فسادات کے آغاز اور ان کی ترقی کے متعلق تازہ ترین اور صحیح ترین معلومات کے حامل تھے اور آخری تین تو زمانہ متعلقہ میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل لاہور رینج ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور اور سنئیر سپر نٹنڈنٹ پولیس کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔اس لئے ان سب افسروں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ تحقیقات کے دائرہ شروط کے متعلق اپنے بیانات پیش کریں۔مذکورہ بالا پولیس افسروں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ تحقیقات کے دائرہ شروط کے متعلق اپنے بیانات پیش کریں۔مذکورہ بالا پولیس افسروں کو یہ بیان کرنے کی بھی ہدایت کی گئی کہ فسادات کے دوران میں گولی بارود کی کتنی مقدار حقیقتاً دی گئی اور استعمال کی گئی اس کے علاوہ پولیس کی فائرنگ سے کتنے آدمی ہلاک و مجروح ہوئے۔سید اعجاز حسین شاہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ ان مجسٹریٹوں کے متعلق مکمل بیان پیش کریں جن کے دوران فساد میں روزانہ ڈیوٹیاں لگائی گئیں۔ان کے نام کیا کیا ہدایات جاری کی گئیں اور انہوں نے کیا کیا رپورٹیں پیش کیں۔مزید براں شاہ صاحب سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ ان تمام احکام کی نقلیں پیش کریں جو زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری صادر کئے گئے۔ان احکام کی کیا کیا خلاف ورزیاں کی گئیں اور ان پر کیا کاروائی کی گئی۔اس کے علاوہ ہم نے ان کو یہ بیان کرنے کا بھی حکم دیا کہ آیا زیر دفعہ ۱۲۹ ضابطہ فوجداری ملٹری طلب کی گئی یا نہیں۔اگر طلب کی گئی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔اور اگر طلب نہیں کی گئی تو اس کی وجوہ کیا تھیں۔

ان افسروں کے بیانات کا معائنہ کرنے کے بعد ہم نے ضروری سمجھا کہ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کو جو دورانِ فسادات میں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ تھے اپنی وزارت کی جانب سے ایک تحریری بیان داخل کرنے کی ہدایت کریں۔ اور ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ اگر وہ کاروائی مقدمہ میں ایک فریق کی حیثیت سے شامل ہونا چاہیں تو عدالت کو اپنی اس خواہش کی اطلاع دیں۔ اس نوٹس کے جواب میں میاں دولتانہ نے ایک درخواست کے ذریعے استدعا کی کہ انہیں ایک فریق قرار دیا جائے۔ ہمارے نزدیک ان کی یہ استدعا قدرتی تھی۔ چنانچہ ہم نے ان کو ایک فریق قرار دے دیا اور ہدایت کی کہ وہ ایک تحریری بیان پیش کریں۔

چونکہ فسادات سے راولپنڈی، سیالکوٹ، لائل پور، گوجرانوالہ اور منٹگمری کے اضلاع متاثر ہوئے تھے اس لئے ہم نے ان اضلاع کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے اپنے اضلاع میں ہونے والے فسادات کے مفصل حالات پیش کریں اور یہ بھی بتائیں کہ فسادات کیونکر شروع ہوئے اور کس طرح بڑھ گئے ان کے دبانے کے لئے کیا کیا تدبیریں اختیار کی گئیں ان فسادات کے دوران میں اور ان سے متعلق کن کن جرائم کے ارتکاب کی اطلاعیں موصول ہوئیں۔ علاوہ ازیں ان تمام جرائم کی ابتدائی رپورٹوں کی نقلیں بھی پیش کریں۔ مزید براں ان افسروں سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ انہوں نے اینٹی احمدی شورش اور اس سے پیدا ہونے والے فسادات کے متعلق یکم جنوری ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۵ر مئی ۱۹۵۳ء تک جو روزانہ صورت حال کی رپورٹیں اور ہفتہ وار رپورٹیں حکومت کو یا کسی اعلیٰ حاکم کو ارسال کیں۔ ان کے اقتباسات کی نقلیں بھی پیش کریں ان سے بالخصوص یہ استدعا بھی کی گئی کہ افراد یا جماعتوں کی طرف سے تشدد پر اکسانے کے جو واقعات پیش آئے ان کا ذکر بھی کریں اور یہ بھی بتائیں کہ انہوں نے صورت حال کے متعلق کیا کیا اطلاعات حکومت کو دیں اور حکومت کی طرف سے کیا کیا ہدایات ان کو وصول ہوئیں۔

ہم نے میجر جنرل محمد اعظم خان جنرل آفیسر کمانڈنگ دہم ڈویژن سے بھی جنہوں نے اپنے آپ کو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر لیا تھا یہ استدعا کی کہ وہ مارشل لا کے اعلان کے وقت کی صورت حالات بے کم وکاست بیان کریں اور وہ وجوہ بتائیں جن کی بناء پر انہوں نے مارشل لا کا

نے صد ہا صفحوں کا ایک بیان پیش کیا جسے ہم نے نہایت احتیاط سے پڑھ لیا۔

حکومت پنجاب کا تحریری بیان صرف چند سطر کا تھا جس میں عدالت کو بتایا گیا تھا کہ حکومت کا اس معاملے کے متعلق کوئی نقطہ نگاہ نہیں۔ لیکن وہ عدالت کی امداد کے لئے اس امر کا ذمہ لیتی ہے کہ جس قسم کا مواد عدالت کو مطلوب ہوگا وہ اس کی خدمت میں پیش کر دے گی۔ اس وعدے پر پوری پابندی سے عمل کیا گیا عدالت نے جب بھی حکومت پنجاب سے بعض دستاویزوں، بعض معلومات اور بعض عملیات کے لئے استدعا کی حکومت نے نہایت سرعت اور مستعدی سے اس پر عمل کیا۔ اگر حکومت ایسی مستعدی کا اظہار نہ کرتی تو خدا جانے ہماری تحقیقات کسقدر طول کھینچ جاتی۔ شہادت کے خاتمہ پر حکومت پنجاب کے وکیل مسٹر فضل الٰہی نے حکومت کے اس رویے کا اعادہ کیا، کہ وہ اس معاملے میں کوئی رائے یا کوئی نقطہ نگاہ نہیں رکھی۔ لیکن جو مواد ریکارڈ پر موجود تھا اس کی بناء پر وکیل مذکور نے تین دن کی بحث کے دوران میں اپنے ذاتی خیالات عدالت میں پیش کر دیے باقی رہی مسلم لیگ تو اس کے خلاف یہ الزامات لگائے گئے کہ ڈائریکٹ ایکشن کی فتنہ انگیز تحریک کے خلاف مسلم لیگ نے کوئی اصولی اور نظریاتی مزاحمت نہیں کی۔ ہم نے ان الزامات کو کافی حد تک صحیح پایا ہے بلکہ ہم پر یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ متعدد اضلاع میں لیگ کے عہدہ داروں نے خود بھی اس شورش میں نمایاں حصہ لیا۔ صوبہ مسلم لیگ کی طرف سے جو تحریری بیان داخل کیا گیا ہے وہ نہایت مایوس کن ہے کیونکہ اس میں صرف وہ قرار دادیں نقل کر دی گئی ہیں جو پنجاب مسلم لیگ کی کونسل یا مجلس عاملہ نے اینٹی احمدی شورش کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار کے لئے منظور کی تھیں۔

ایکٹ کی دفعہ ۵ کی ذیلی دفعہ ۲ کے رو سے اس عدالت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی پولیس افسر کو جو سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کم درجے کا نہ ہو کسی ایسی تفتیش کی ہدایت دے جو عدالت کے نزدیک تحقیقات کے مقاصد کے لئے ضروری ہو۔ ہم نے اس اختیار کو اکثر استعمال کیا ہے اور مسٹر محمد حسین سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کو متعدد ایسے امور کی تفتیش پر مقرر کیا ہے جن کی براہِ راست سماعت اگر عدالت میں کی جاتی تو بہت سا روپیہ بھی صرف ہوتا اور خاصی تاخیر ہو جاتی۔ مسٹر محمد حسین نے حسب معمول مستعدی اور ہمہ گیری سے اپنے فرائض کو انجام دیا۔

دورانِ فسادات میں خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم تھے مسٹر چندریگر گورنر پنجاب تھے اور سردار عبدالرب نشتر مرکزی کابینہ کے ایک وزیر تھے ان کے علاوہ چوہدری ظفر اللہ خان وزیر خارجہ سردار بہادر خان وزیر مواصلات، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، وزیر اطلاعات ونشریات اور مسٹر مشتاق احمد گورمانی وزیر داخلہ تھے کسی نہ کسی فریق کی استدعا پر عدالت نے ان سب حضرات کو طلب کر کے ان کے بیانات قلم بند کیے۔ البتہ مسٹر دولتانہ نے خود اپنے آپ کو اپنے گواہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ ان تمام گواہوں کی شہادت بند کمرے میں قلمبند کی گئی لیکن اس کے بعض حصے اخباروں کو اشاعت کے لئے دے دیئے گئے۔

کون سے مضامین زیر بحث آئے

تحقیقات کی عقائدی حیثیت اور دوسرے متعلقہ مذہبی موضوعات کے متعلق ہم نے ایک طرف ممتاز علما کو اور دوسری طرف مرزا بشیرالدین محمود احمد (قادیانی احمدیوں کے موجودہ امام) کو عدالت میں طلب کیا۔ تحقیقات کے اس حصے میں علم انسانی کی تقریباً ہر شاخ اور ہر شعبے پر نظر ڈالی گئی۔ مذہب، فلسفہ، سائنس، اخلاقیات، صفات الٰہی، تشبیہ وحلول، عقل، الہام، تفسیر، علم کائنات، تخلیق، زمان ومکان، انسان کی ابتداء اور اس کی منزل مقصود زندگی کے مقصد، مملکت اور دینی اداروں کے وظائف، حاکمیت، جمہوریت، دینی حکومت، یہ تمام مضامین جیسا کہ تفصیل سے ظاہر ہوگا کسی اعتبار سے بھی تحقیقات سے بے تعلق نہ تھے، تحقیقات کے اندرونی امور تنقیح طلب جو اکثر اپنی پوری وضاحت اور اپنے تمام متعلقات کے ساتھ سامنے آئے، وہ اس قدر گہرے اور بنیادی ہیں کہ ان کے جوابات پاکستان کی نئی مملکت کو بنانے یا بگاڑنے کا باعث ہو سکتے ہیں اور اس کی تاریخ آئندہ رفتار کو کاملاً تبدیل کر سکتے ہیں۔

ہم نہ صرف ان تمام موجودہ اور سابقہ عزت مآب وزیروں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنے خیالات ہمارے سامنے پیش کرنے کیلئے طویل سفر کی زحمت برداشت کی، بلکہ وہ احکام اور علماء بھی ہمارے دلی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے اس طویل تحقیقات کے دوران میں اول سے آخر تک ہماری امداد کی۔ مجلس عمل کی طرف سے مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، احرار کی طرف سے مولانا

مظہر علی اظہر اور جماعت اسلامی کی طرف سے مسٹر سعید ملک نے یقیناً اس کام کی انجام دہی میں محنت شاقہ برداشت کی ہوگی، جو ان کی جماعتوں نے ان کے سپرد کیا تھا۔ ان فاضل حضرات کے ساتھ کام کرنا ہمارے لئے ایک بالکل نیا اور نہایت خوشگوار تجربہ تھا۔ جو ہمارے حافظہ میں مدت دراز تک محفوظ رہیگا، ہم پیشہ وکالت کے بعض حضرات کے بھی ممنون ہیں، مسٹر یعقوب علی خاں، مسٹر نذیر احمد خاں، مسٹر اسد اللہ خاں مسٹر عبدالرحمٰن خادم اور مسٹر فضل الٰہی اپنے اپنے موکلوں کے مقدمات پیش کرنے میں ہمارے لئے بیش بہا امداد و اعانت کا باعث ہوئے۔

ان اشارات کے بعد ہم اپنے قانونی کام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

حصوں میں تقسیم

بحث کے دلائل کی سماعت کے بعد ہم دونوں اس امر پر متفق ہو گئے کہ ہمیں شروط تحقیقات کے جوابات کس طریق سے دینے چاہئیں، اس کے بعد ہم نے کام تقسیم کر لیا یعنی ہم میں سے ایک تو عمومی ذمہ داری کے مسئلے پر غور و بحث کرے اور دوسرا خاص کر نظام حکومت کی کارروائیوں پر نظر ڈالے، پہلے تین حصوں میں ہم نے متعلقہ واقعات کے متعلق ایک واقعاتی بیان قلمبند کر دیا ہے۔ مثلاً

حصہ اول:۔ تقسیم ملک سے لیکر آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقدہ لاہور مؤرخہ ۱۳ جولائی ۵۲ء تک

حصہ دوم:۔ کنونشن سے ۲۱ رجنوری ۱۹۵۳ء تک جب وزیر اعظم کو الٹی میٹم دیا گیا

حصہ سوم:۔ الٹی میٹم کی تاریخ سے لیکر فسادات کے خاتمے تک

حصہ چہارم:۔ وہ کوائف جو مارشل لا کا باعث ہوئے

حصہ پنجم:۔ فسادات کی ذمہ داری

حصہ ششم:۔ سول حکام کی انتظامی کارروائی کافی تھی یا نہیں

حصہ ششم کے مقاصد کے لئے مدت زیر مشاہدہ کو چار ذیلی حصوں میں تقسیم کیا گیا، ہر ذیلی حصہ جو خاص مسئلہ پیش کرتا ہے، اس کے اعتبار سے اس کو علیحدہ اور ممتاز رکھا گیا ہے۔

تے تھے۔ مرزا غلام احمد ۱۳ر فروری ۱۸۳۵ء کو بمقام قادیان پیدا ہوئے۔ یہ ضلع گورداسپور کا ایک گاؤں ہے جس میں واحد مالک کی حیثیت اسی خاندان کو حاصل تھی۔ مرزا غلام احمد نے فارسی اور عربی زبانوں کی تعلیم گھر پر پائی۔ کسی قسم کی مغربی تعلیم کے حصول کا سراغ نہیں ملتا۔ ۱۸۶۴ء میں ان کو عدالت ضلع سیالکوٹ میں ایک نوکری مل گئی۔ جہاں وہ چار سال تک کام کرتے رہے۔ جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے اپنے آپ کو از سر تا بہ دینیات کے مطالعہ کے لیے وقف کر دیا اور ۱۸۸۰ اور ۱۸۸۴ کے درمیان اپنی مشہور کتاب ''براہین احمدیہ'' چار جلدوں میں لکھی۔ کچھ مدت بعد چند اور کتابیں بھی تصنیف کیں اس زمانے میں شدید مذہبی مناقشے اور مناظرے جاری تھے۔ اسلام پر نہ صرف عیسائی مشنری ہی پے در پے حملے کر رہے تھے بلکہ ہندوؤں کی مقبول عام تحریک آریہ سماج کے پرچارک بھی اسی مشغلے میں مصروف تھے۔

مارچ ۱۸۸۲ء میں مرزا غلام احمد نے دعویٰ کیا کہ انہیں الہام ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خاص مقصد تفویض کیا ہے دوسرے لفظوں میں گویا وہ مامور من اللہ ہیں۔ ۱۸۸۸ء میں انہوں نے پھر ایک الہام کی بناء پر اپنے مویدین سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ ۱۸۹۰ء کے اواخر میں مرزا صاحب کو پھر الہام ہوا کہ یسوع ناصری (عیسیٰ ابن مریم) نہ صلیب پر فوت ہوئے نہ آسمان کی طرف اٹھائے گئے بلکہ وہ صلیب پر زخمی ہو گئے تو ان کے شاگردوں نے انہیں اسی مجروح حالت میں صلیب پر سے اتار لیا اور ان کے زخموں کا علاج کیا، اس کے بعد وہ کشمیر چلے گئے اور وہیں طبعی موت مر گئے۔ یہ عقیدہ غلط ہے کہ وہ روز قیامت کے قریب اپنے اصلی جسم عنصری کے ساتھ دوبارہ ظاہر ہوں گے۔ ان کے دوبارہ ظہور کے وعدے کا مطلب صرف یہ ہے کہ عیسیٰ ابن مریم کے صفات و اخلاق رکھنے والا ایک اور شخص امت محمدیہ میں پیدا ہو گا یہ وعدہ پورا ہو چکا ہے اور مرزا غلام احمد ہی وہ مثیل عیسیٰ اور مسیح موعود واقع ہوئے ہیں، اس عقیدے کی اشاعت پر مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہو گیا کیونکہ یہ اس عام مسلمہ عقیدے کے منافی تھا کہ عیسیٰ ابن مریم جسم عنصری کے ساتھ آسمان سے اتریں گے۔ چنانچہ علمائے دین نے اس کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ اسکے بعد مرزا نے ''مہدی معہود'' ہونے کا دعویٰ بھی کیا اور اعلان کیا کہ میں ایسا مہدی نہیں جو جنگ و خونریزی میں مصروف ہو جاؤں بلکہ میں مہدی

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کہلاتی ہے دونوں پارٹیاں غیر ممالک میں وسیع پیمانے پر تبلیغ واشاعت کا کام کرنے میں مصروف ہیں۔

احرار

قوم پرست مسلمانوں کی ایک ٹولی نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر کے ۴رمئی ۱۹۳۱ء کو لاہور میں ایک جلسہ منعقد کیا اور مجلس احرار اسلام کی بنیاد رکھ دی۔احرار سب سے پہلے ۱۹۳۱ء کی تحریک کشمیر میں نمایاں ہوئے۔ اسی سال ۳۰/اکتوبر کو مظہر علی کی سرکردگی میں ایک سو رضا کاروں کا ایک جتھا سیالکوٹ سے جموں کے علاقے میں داخل ہونے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ پنجاب میں تحریک کشمیر اس لئے پیدا ہوئی کہ ڈوگرہ دربار نے کشمیری مسلمانوں کو انتہائی جبر وظلم کا نشانہ بنا رکھا تھا اور مسلمانانِ پنجاب کو ان سے نہایت گہری ہمدردی تھی۔ کشمیری مسلمانوں کی شکایات یہ تھیں کہ ریاست نے متعدد مسجدوں، قبرستانوں اور دوسرے مقدس مقامات پر قبضہ کر رکھا ہے مسلمانوں کو سرکاری دفاتر میں ملازمت نہیں دی جاتی۔ان کی مذہبی رسوم کی بجا آوری پر قیود عائد کی جاتی ہیں اور ریاست میں کوئی باقاعدہ اور آئینی قانون ساز مجلس موجود نہیں جس میں مسلمان ریاست کے اندر اپنے تناسب اعداد کے مطابق نمائندگی حاصل کر سکیں۔ جب اخباروں میں ان شکایات کے تدارک کے لئے مہم جاری کی گئی تو نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳جولائی ۱۹۳۱ء کو سری نگر میں بلوہ ہو گیا۔اس بلوے سے جو شورش عام پیدا ہوئی اس کا چارج لینے کی کوشش دو جماعتوں نے کی جن میں ایک تو مجلس احرار تھی اور دوسری ایک اور انجمن موسومہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی تھی جو ۲۶ جولائی کو وجود میں آئی اور جس میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، نواب سر ذوالفقار علی خاں، خواجہ حسن نظامی، نواب ابراہیم علی خان، مرزا بشیر الدین محمود احمد (موجودہ امام جماعت احمدیہ) شامل ہوئے۔ اور ایک احمدی عبد الرحیم درد اس کے سیکرٹری قرار پائے۔ چونکہ احرار اور احمدی شورش کشمیر کے دوران میں مخالف کیمپوں میں ہونیکی وجہ سے ایک دوسرے کے خلاف ہو رہے تھے، لہٰذا اس سے دوسرے دن باقاعدہ اعلان کر دیا کہ انہوں نے کشمیری مسلمان بھائیوں کی حمایت میں تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے

کتوبر کو مظہر علی اظہر کی سرکردگی میں ایک سو رضا کاروں کا ایک دستہ علاقہ جموں میں داخل ہو گیا اس ڈرامائی اقدام سے احرار کی حیثیت بہت نمایاں ہو گئی۔

اگر چہ احراری کانگرس سے الگ ہو گئے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تقسیم ملک تک برابر کانگرس سے ساز باز کرتے ہی رہے۔ مجلس احرار کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ۳/ مارچ ۱۹۴۰ء کو دہلی میں منعقد ہوا اس اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں پاکستان کی تجویز کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور بعد میں بعض احرار لیڈروں نے اپنی تقریروں میں پاکستان کو ''پلیدستان'' بھی کہا۔ ۲۰/ نومبر ۱۹۴۰ء کو مولانا داؤد غزنوی نے اخباروں میں ایک بیان شائع کرایا۔ جس میں احرار کے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ وہ اپنے آپ کو کانگرس میں جذب کر دیں گے پنجاب پراونشل احرار کانفرنس منعقدہ گوجرانوالہ (از ۷/ تا ۱۹/ مارچ ۴۳ء) میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ اور پھر اسی سال سہارنپور میں بھی ریزولیشن پاس کیا گیا ان دونوں موقعوں پر احرار نے مجوزہ تقسیم کی مخالفت کی اور اس کو وطن کی چیر پھاڑ قرار دیا۔ احرار کے ہر لیڈر نے اپنی ہر اہم تقریر میں مسلم لیگ پر تنقید کی۔ اس کے لیڈروں پر نکتہ چینی کی۔ یہاں تک کہ قائداعظم کو بھی نہ چھوڑا۔ جن سے وہ سخت متنفر تھے حالانکہ ان کی شخصیت ان دنوں مسلمان قوم کے واحد اور مسلمہ رہنما کی حیثیت سے قلوب عوام میں گھر کر چکی تھی۔ چونکہ قائداعظم روشن خیال آدمی تھے اور مذہبی امور میں کسی نمود و نمائش کے قائل نہ تھے، اس لئے احرار نے ان کی اس خصوصیت سے ناواجب فائدہ اٹھا کر انہیں کافر کہنا شروع کر دیا۔ یہ شعر مولانا مظہر علی اظہر سے منسوب ہے جو تنظیم احرار میں ایک ممتاز شخصیت ہیں۔

اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا
یہ قائداعظم ہے کہ ہے کافر اعظم

مولانا مظہر علی اظہر نے ہمارے سامنے (عدالت میں) نہایت خیرہ چشمی سے یہ اظہار کیا کہ (قائداعظم کے متعلق) وہ اب تک اسی خیال پر قائم ہیں۔ احرار نے اپنی تقریروں میں صرف یہی نہیں کہا کہ قائداعظم نے ایک پارسی خاتون سے شادی کی تھی بلکہ یہ اعتراض بھی کیا کہ قائداعظم اب تک حج کے لئے مکہ معظمہ کیوں نہیں گئے۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے شیعہ سنی تنازعہ کی آگ بھڑکانے کی

کوشش بھی کی۔ اور مولانا مظہر علی اور ان کے بیٹے قیصر مصطفٰی تحریک مدح صحابہ کے احیاء کے لئے ۱۶ر نومبر کو لاہور سے لکھنو روانہ ہوئے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں تین احرار امیدوار مسلم لیگی امیدواروں کے مقابلے میں کھڑے ہوئے۔ لیکن ان سب کو شکست کھانی پڑی۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے پنجاب میں جو ''ڈائریکٹ ایکشن'' شروع کیا اس سے احرار، کاملاً الگ رہے۔

احرار کی بڑی بڑی سرگرمیوں میں ایک یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں احمدیوں کی مخالفت کرتے رہتے تھے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ احرار کی پیدائش ہی احمدیوں کی نفرت سے ہوئی۔ ابھی مجلس احرار کی تاسیس پر دو ہی سال گزرے تھے کہ انہوں نے ایک قرارداد منظور کی جس کا منشا یہ تھا کہ کوئی قادیانی کسی مجلس عامہ کا ممبر منتخب نہ کیا جائے۔ قادیان تقسیم سے پہلے تقریباً خالص احمدی قصبہ تھا۔ ۱۹۳۴ء میں احرار نے قادیان میں ایک کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ لیکن جب اس جلسے کو ممنوع قرار دیا گیا تو انہوں نے اسی سال ۲۱ر اکتوبر کو قادیان سے صرف ایک میل کے فاصلے پر ایک گاؤں اجادہ کے دیانند اینگلو ویدک ہائی سکول کی گراؤنڈ میں کانفرنس منعقد کرلی۔ جس میں حاضرین کی تعداد ہزاروں تک پہنچی۔ اس کانفرنس میں احرار کے مقبول عام خطیب سید عطا اللہ شاہ بخاری نے احمدیوں کے خلاف پانچ گھنٹے کی ایک نفرت آمیز تقریر کی، جس میں انہوں نے ایسی باتیں کہیں جن سے صرف یہ مقصود تھا کہ سننے والوں کے دلوں میں احمدیوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھے، انہوں نے اپنی تقریر میں امن وامان کے دعاوی کے ساتھ ہی ساتھ نہایت پست قسم کی دشنام طرازی اور مسخرگی سے کام لیا۔ اس تقریر کی بنا پر بخاری کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ جس کی سماعت کے دوران میں اتنی سنسنی پیدا ہوئی اور احمدیوں کے خلاف جذبات اتنے برانگیختہ ہوئے کہ خود تقریر سے بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ اس مقدمے میں بخاری کو سزا دی گئی۔ وہ دن اور یہ دن ہر قابل ذکر احراری مقرر احمدیوں، ان کے رہنماؤں اور ان کے عقیدوں کے خلاف ہر قسم کی باتیں کہتا رہا ہے۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم اور پاکستان کا قیام احرار کے لئے بہت بڑی مایوسی کا پیغام تھا۔ کیونکہ اس سے ہر قسم کا اقتدار کانگرس یا مسلم لیگ کی طرف منتقل ہوگیا۔ اور احرار کے لئے ہندوستان یا پاکستان میں سیاسی سرگرمی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ پاکستان کی نئی مسلم مملکت کے قیام سے انہیں شدید

صدمہ ہوا۔ ان کے نظام عقائد کی عمارت متزلزل ہوگئی اور وہ ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے بالکل ختم ہوگئے۔ کچھ مدت تک وہ اسی ناکامی و مایوسی کی حالت میں رہے۔ انہیں اپنے مستقبل کے متعلق کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ان کے دو لیڈروں یعنی مولوی عبدالغنی ڈار اور مولانا حبیب الرحمٰن نے بھارت میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک اور اہم حیثیت کے لیڈر شیخ حسام الدین کچھ مدت تک تو گومگو کی حالت میں رہے آخرانہوں نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا اور لاہور میں ''ویرا ہوٹل'' کا چارج لے لیا جو ایک کانگریسی مسمی پربودھ چندر نے ان کے سپرد کردیا تھا۔ ماسٹر تاج الدین لدھیانوی اور مولوی محمد علی جالندھری بھی پاکستان چلے آئے۔ ماسٹر صاحب نے سیالکوٹ میں اور مولوی صاحب نے ملتان میں سکونت اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری بھی جو گجرات کے رہنے والے ہیں ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں منتقل ہوگئے۔ مولانا مظہر علی اظہر سیاسیات سے دست بردار ہوگئے اور صاحبزادہ فیض الحسن نے اپنے گاؤں آلومہار ضلع سیالکوٹ میں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں احرار نے اپنی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس خان گڑھ میں منعقد کیا جہاں سید عطا اللہ شاہ بخاری مقیم ہوگئے تھے۔ اجلاس کا مقصد یہ تھا کہ احرار کے آئندہ پروگرام پر غور وخوض کیا جائے لیکن وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچے یہی حشر اس اجلاس کا ہوا جو دسمبر ۱۹۴۷ء میں بمقام لاہور منعقد کیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں تین ممکن راہ ہائے عمل پر غور کیا گیا۔ اول:۔ جماعت کو ختم کردیا جائے۔ دوم:۔ سیاسی سرگرمیوں کو ترک کرکے صرف مذہبی مشاغل اختیار کئے جائیں۔ سوم:۔ جماعت کو بدستور زندہ رکھا جائے۔ لیکن غورو بحث کے بعد فیصلہ صرف یہ ہوا کہ ایک ''آل پاکستان مجلس احرار'' کی بنیاد رکھی جائے۔ اس کے بعد مئی ۱۹۴۸ء میں بمقام لائل پور جو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں احمدیوں کے متعلق ہلکے ہلکے اشارے کئے گئے اور پاکستان کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا گیا۔ جب اس کے بعد جون ۱۹۴۸ء میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ تو پاکستان کی حمایت میں زیادہ وضاحت سے اظہار جذبات کیا گیا اور اس کے ساتھ یہ اشارہ بھی کیا گیا کہ احرار مسلم لیگ میں شامل نہیں ہوسکتے کیونکہ اس میں چوہدری ظفر اللہ خان اور میاں افتخار الدین جیسے لوگ بھی ہیں جن کے عقائد اسلام کے خلاف

تقسیم کے بعد احرار کا سب سے بڑا اور اہم اجتماع وہ تھا جو ''احرار ڈیفنس کانفرنس'' کے موقع پر ۱۲ رجنوری سے ۱۴ جنوری ۱۹۴۹ء تک بمقام لاہور منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں احرار نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ مجلس احرار اب ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے ختم کر دی گئی ہے اور آئندہ صرف ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے گی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ سیاسی امور میں وہ مسلم لیگ کی پیروی کرینگے۔ اس کے بعد انہوں نے ''تبلیغ کانفرنس'' کے نام سے اپنی کانفرنسیں منعقد کرانا شروع کر دیں۔ چنانچہ اوکاڑہ، لائل پور، مگھیانہ، چنیوٹ، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گجرات، پنڈ دادن خان، جہلم، شجاع آباد، بورے والا اور ملتان میں کانفرنسوں کا ایک سلسلہ جاری ہوگیا، احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے راولپنڈی کی ایک کانفرنس میں کیا گیا اور اس کے بعد یکم مئی ۱۹۴۹ء کو پنڈ دادن خاں کے ایک جلسہ عام میں اس کا اعادہ کیا گیا۔ بعدازاں احرار اپنی تمام تقریروں میں جماعت احمدیہ کے بانی اور چوہدری ظفر اللہ خان پر باقاعدہ نکتہ چینی کرنے لگے اور محسوس کرنے لگے کہ انہیں مسلم لیگ کی امداد طلب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور وہ آئندہ ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت سے اپنے وظائف بجالا سکتے ہیں۔ مسلم لیگ نے بھی احرار کے متعلق دوستانہ رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ جب ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو کراچی میں پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو جو انیس جماعتیں مسلم لیگیوں کے لئے ممنوع الداخلہ قرار دی جا چکی تھیں ان میں سے احرار کو مستثنٰی قرار دے دیا گیا۔ (یعنی مسلم لیگی مجلس احرار کے ممبر بن سکتے تھے)

دو احراری لیڈروں کی گرفتاری

احرار کو اس حقیقت کے احساس میں کوئی مشکل پیش نہیں آنی چاہے تھی کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد ان کی سابقہ سیاست متروک ہو چکی ہے اور نئی مملکت میں ان کے لئے اپنی پرانی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن احراری اس مٹی کے بنے ہوئے نہ تھے وہ پرانے باراں دیدہ شورش پسند تھے جن کو اپنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں اضافہ کرنے کے لئے بڑی بڑی

مہمیں چلانے اور ہنگامے برپا کرنے کا تجربہ حاصل تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایسے طریقوں پر غور وخوض شروع کر دیا جن سے کام لے کر وہ نئے ماحول میں اپنی سرگرمیوں کے لئے کوئی مخرج پیدا کر سکیں۔ کسی موجودہ شورش سے فائدہ اٹھانا کسی نئی شورش کی تخلیق کے مقابلے میں دوسرے درجے کی چال ہے۔ آگے چل کر معلوم ہو جائے گا کہ احراریوں نے اپنی ہستی کا ثبوت دینے اور جماعت کی حیثیت سے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کیلئے اسی چال سے کام لیا۔

ابھی قیام پاکستان پر ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ مخدوم شاہ بنوری سیکرٹری مجلس احرار پاکستان ۱۵ر جولائی ۱۹۴۸ء کو زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کر لئے گئے۔ ان کی گرفتاری کے معین وجوہ تو شہادت میں واضح نہیں کئے گئے لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ ان پر کسی خلافِ عدالت سرگرمی کا شبہ تھا جو ان کی گرفتاری کا باعث ہوا۔ ان کے بعد ایک اور احراری لیڈر شیخ حسام الدین ۲۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اسی ایکٹ کے ماتحت گرفتار کئے گئے آخر جب ان دونوں نے لمبے لمبے بیانات دے دیئے تو انہیں رہا کر دیا گیا۔

میجر محمود کا قتل

مرزا بشیر الدین محمود احمد ۱۹۴۸ء کے، موسم گرما میں بمقام کوئٹہ مقیم تھے۔ ان کی موجودگی میں ایک نوجوان فوجی افسر میجر محمود جو احمدی تھا، نہایت وحشیانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔ ریلوے کے مسلم ملازمین کی ایسوسی ایشن نے ایک جلسہ عام کا اعلان کیا تھا جو ۱۱ اگست ۱۹۴۸ء کو منعقد ہوا۔ اس جلسے میں بعض مولویوں نے تقریریں کیں اور ہر شخص نے اپنی تقریر کے لئے ایک ہی موضوع یعنی ''ختم نبوت'' اختیار کیا۔ ان تقریروں کے دوران میں قادیانیوں کے کفر اور اس کے نتائج کی طرف بار بار اشارے کئے گئے۔ ابھی یہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا کہ میجر محمود ایک مریض کو دیکھنے کے بعد واپس آتے ہوئے جلسہ گاہ کے پاس سے گزرے۔ اتفاق سے ان کی موٹر کار جلسہ گاہ کے قریب پہنچ کر خراب ہو گئی تھی اور اس کو دوبارہ چلانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔ عین اس موقع پر ایک ہجوم موٹر کار کی طرف بڑھا اور اس نے میجر محمود کو گھسیٹ کر نیچے اتار لیا۔ میجر محمود نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ان کا تعاقب کیا گیا اور آخر پتھر اور چھرے مار مار کر ان کو ہلاک کر دیا گیا۔ ان کی پوری انتڑیاں پیٹ سے باہر نکل آئی

تھیں۔ان کی نعش کے پوسٹ مارٹم معائنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جسم پر کند اور تیز دھار والے ہتھیاروں سے لگائے ہوئے چھبیس زخم تھے اور موت ایک تو صدمے سے اور دوسرے داخلی جریان خون سے واقع ہوئی۔ جو بائیں پھیپھڑے بائیں گردے اور جگر کے دائیں کنارے کے زخموں سے جاری ہوا تھا۔کوئی شخص بھی ''اسلامی شجاعت'' کے کارنامے کی نیک نامی لینے پر آمادہ نہ ہوا اور بے شمار عینی شاہدوں میں ایک بھی ایسا نہ نکلا جوان غازیوں کی نشان دہی کرسکتا یا کرنے کا خواہشمند ہوتا جن سے یہ ''بہادرانہ فعل'' صادر ہوا تھا۔لہٰذا اصل مجرم شناخت نہ کئے جا سکے اور مقدمہ بے سراغ ہی دفتر کردیا گیا۔ پولیس کے کاغذات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیظ سے بھرے ہوئے لوگ چھوٹی ڈاڑھیوں والے اشخاص کی تلاش میں دیوانے ہو رہے تھے تا کہ انہیں ہلاک کر دیں۔(واضح رہے کہ احمدی چھوٹی ڈاڑھیاں رکھتے ہیں)

جب حکومت پاکستان کے انٹیلی جنس بیورو کو اس ہولناک قتل کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی چھٹی نمبر p(6)- 48 / B / 10 مورخہ اکتوبر ۱۹۴۸ء بنام مسٹر ذوالقرنین خاں سپرنٹنڈنٹ پولیس (A) سی آئی ڈی پنجاب لاہور میں حکام صوبہ کی توجہ مجلس احرار کی خفیہ سرگرمیوں کی طرف مبذول کرائی جو بیورو کے نزدیک پاکستان کے مفاد کے لئے مضرت رساں تھیں۔ بیورو نے لکھا کہ مجلس احرار کے بڑے بڑے لیڈر اپنی تحریروں اور تقریروں میں مملکت کی وفاداری کے جو عہد پیمان باندھ چکے ہیں وہ سب محض لیپ پوت اور دھوکہ ہے۔آخر میں مرکزی حکومت کی اطلاع کے لئے حکومت صوبہ کی رائے طلب کی گئی تھی کہ آیا احرار کی ان سرگرمیوں کے پیش نظر بحالت موجودہ ان کے خلاف کسی سخت کاروائی کی ضرورت ہے یا نہیں۔اس کے جواب میں ملک حبیب اللہ نے اپنی چھٹی نمبر ۲۲۴۵۱۔BDSB مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۴۸ء میں احرار کے متعلق پنجاب سی آئی ڈی کا رویہ نہایت تفصیل سے بیان کیا۔اس چٹھی میں اس تقریر کا اقتباس دیا گیا ہے جو عبدالرحمن میانوی نے چونڈہ ضلع سیالکوٹ میں ۷ مئی ۱۹۴۸ء کو کی تھی اور جس میں بتایا تھا کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کی ذمہ داری قائداعظم مرحوم پر ہے پھر صاحبزادہ فیض الحسن کی تقریر کا ذکر ہے جو انہوں نے موضع بھلر ضلع شیخوپورہ میں کی اور جس میں بیگم لیاقت علی خاں اور دوسری تعلیم یافتہ خواتین پر جو

33

پردے کی پابند نہیں۔ بازاری حملے کئے گئے تھے اس چٹھی میں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ مخدوم شاہ بنوری اور شیخ حسام الدین کی گرفتاری کے بعد سے احراری لیڈروں کے دماغ درست ہو رہے ہیں اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ماسٹر تاج الدین پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداری کے اعلان کا اعادہ کر کے حکومت کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ احرار کی شدید نگرانی کی جارہی ہے اور جب کبھی ان سرگرمیوں میں ایسے آثار نظر آئے کہ وہ مفاد مملکت کے منافی ہیں ان کے خلاف فوری اقدام کیا جائے گا اور ان کی جمعیت توڑ دی جائے گی آخر میں حکومت پنجاب کا یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ موجودہ مرحلے پر احرار کی تنظیم کو ممنوع اور خلافِ قانون قرار دینے کی سخت کاروائی مناسب نہیں ہے۔

احرار لیڈروں کی تقریریں

صاحبزادہ فیض الحسن کی جس تقریر کا ذکر ملک حبیب اللہ کی چٹھی میں کیا گیا ہے اس کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبزادہ نے یہ تقریر ۲۷ اگست ۱۹۴۸ء کو موضع بھلر میں سید امام علی کے عرس کے موقع پر کی تھی۔ جس میں بتایا تھا کہ بیگم لیاقت علی خاں اور دوسری عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں سب بازاری عورتیں ہیں۔ اور مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے جو ایک لاکھ مسلمان عورتوں کو اغوا کرلیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ قائداعظم پاکستان کے گورنر جنرل بننے کے لئے بے حد مضطرب تھے۔

۸/اگست ۱۹۵۰ء کو حکومت پاکستان کے انٹیلی جنس بیورو کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اپنی چٹھی نمبری (۲۵)۔۵۰/B/9 بنام سپرنٹنڈنٹ پولیس (B) سی آئی ڈی پنجاب کے ساتھ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے ایک خطبہ کی نقل بھیجی۔ جس میں انہوں نے اپنے پیروؤں کو آگاہ کیا تھا کہ وہ آج کل ایک نہایت خوفناک خطرے سے دوچار ہیں۔ اس خطبے میں امام جماعت احمدیہ نے یہ کہا تھا کہ صورت حالات کی پوری پوری اطلاع حکومت تک نہیں پہنچائی جارہی ہے جماعت کو نیست و نابود کردینے کا کھلم کھلا پروپیگنڈا کیا جارہا ہے حکومت اس پروپیگنڈا کی روک تھام کے لئے کوئی تدابیر اختیار نہیں کررہی ہے ہمارے جان و مال سخت خطرے میں ہیں افراد جماعت کو چاہیے کہ اگر ضرورت

پڑے تو اپنے دفاع کے لئے نہایت چست و مستعد رہیں۔ اس چٹھی کے جواب میں ملک حبیب اللہ نے اپنی خفیہ چٹھی نمبری BDSB-9931 مورخہ ۳۱/اگست ۱۹۵۰ء کے ذریعے سے بیورو کو اطلاع دی کہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے خطبے میں غالباً احرار کی ان تقریروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو مجلس احرار کو مسلم لیگ میں مدغم کر دینے کے بعد سے برابر جاری ہیں اور جن میں احمدیوں کے خلاف دشنام طرازی کی مسلسل مہم چلائی جا رہی ہے۔ اس چٹھی میں یہ بھی لکھا گیا کہ احرار کی ان سرگرمیوں کی اطلاع بارہا حکومت کو دی جا چکی ہے لیکن قانون و انتظام کے مشیر نے فوری کاروائی کرنے سے انکار کر دیا ہے کہ مبادا احرار اس گیر ودار کی وجہ سے سستی شہادت حاصل کر لیں۔ احراری لیڈر ماسٹر تاج الدین کو تنبیہ کی جا چکی ہے اور اس تنبیہ کا کوئی اثر اس لیڈر کی سرگرمیوں پر نہیں پڑا۔ اب گورنر نے ایک تازہ تنبیہ کی ہے جس کے نتائج کا انتظام ہے۔

احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے یکم مئی ۱۹۴۹ء کو پنڈ دادن خان کے ایک احراری جلسے میں کیا گیا۔ اس کے بعد سے احرار کے تمام جلسہ ہائے عام میں صرف احمدی ہی ہر تقریر کا موضوع قرار پائے۔ اور نہ صرف احمدی جماعت کے لیڈر بلکہ چوہدری ظفر اللہ خان وزیر خارجہ بھی ان کی دشنام و بدگوئی کا سب سے بڑا نشانہ بن گئے۔ ۲۶، ۲۷ نومبر ۱۹۴۹ء کو احرار نے سیالکوٹ میں جو تبلیغ کانفرنس منعقد کی اس میں گیارہ ہزار حاضرین کے سامنے ماسٹر تاج الدین، مولوی محمد حیات، مولوی محمد علی جالندھری، شیخ حسام الدین، قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور سید عطا اللہ شاہ بخاری نے تقریریں کیں اور ان سب نے احمدیوں کو، احمدیت کے بانی کو، احمدی لیڈروں کو اور چوہدری ظفر اللہ خان کو گالیاں دیں۔ اس جلسے میں جو تقریریں کی گئیں ان کا ایک نمونہ مولوی محمد حیات کی تقریر کی روداد میں ملے گا۔ آپ نے کہا

> ”اگر چہ مرزا غلام احمد جھوٹا تھا لیکن ہم اس کو الزام نہیں دیتے کیونکہ صرف کبھی کبھی زنا کرتا تھا ہمارا اعتراض موجودہ خلیفہ پر ہے جو ہر روز زنا کاری کا مرتکب ہوتا ہے“۔

پراسیکیوٹنگ پولیس افسر نے جب قانونی کاروائی کی غرض سے اس تقریر کا مطالعہ کیا تو یہ

ائے دی کہ اس قسم کے بیانات تو سیاسی مقررین کا شیوہ عام ہیں جن سے کسی کی بھی دل آزاری نہیں ہوتی۔

اس کے بعد احرار نے ۷ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو نوشہرہ ورکاں میں اہل السنّت والجماعت کے نام سے ایک جلسہ عام منعقد کیا جس میں مولوی غلام اللہ خان نے یہ کہا کہ مرزا غلام احمد دجال تھا جس کو انگریز نے مسلمانوں کے اتحاد کے توڑنے کی غرض سے پیدا کیا تھا۔ قادیانی لوگ خصوصاً چوہدری ظفر اللہ خان پاکستان اور ملت مسلمہ کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں اور قادیان کے لئے کشمیر کو فروخت کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ تقریر زیر دفعہ ۱۵۳ الف مجموعہ تعزیرات اور زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ قانونی کاروائی کے قابل بتائی گئی اور میاں انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یہ کیس ہوم سیکرٹری کی خدمت میں بھیجتے ہوئے دریافت کیا کہ آیا حکومت کا یہ ارادہ ہے کہ جو لوگ چوہدری ظفر اللہ خان کو گالیاں دے رہے ہیں اور جمہور کے ایک خاص حصے کے خلاف نفرت پھیلا رہے ہیں ان کے خلاف کوئی کاروائی کی جائے۔ مسٹر انور علی نے اپنے تبصرہ میں ایک معاہدے کا ذکر بھی کیا جس احراریوں کے قول کے مطابق ان کے اور وزیر اعظم کے درمیان ہو چکا ہے اور اس معاہدے کا مقصد یہ ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان جو ایک سیاسی خطرہ بن چکے ہیں وزارت مرکز سے نکال دیئے جائیں جب یہ کیس شعبہ قانون کے مشیر کے پاس پہنچا تو اس نے ایک اور کیس میں اپنی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے حکم صادر کیا کہ فی الحال احرار لیڈروں کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی جائے گی اور حکومت ابھی حالات کا انتظار کرے گی۔

اس کے بعد مجلس احرار نے ایک اہم تبلیغ کانفرنس ۱۷، ۱۸ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو لائل پور میں منعقد کی جس میں کوئی پانچ ہزار حاضرین کے سامنے مولوی غلام غوث سرحدی، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولوی محمد علی جالندھری، شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری نے تقریریں کیں جو مسٹر انور علی کی یادداشت مؤرخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کے رو سے زیر دفعہ ۱۵۳ الف مجموعہ تعزیرات اور زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ قانونی کاروائی کے قابل تھیں۔ شعبہ قانون کے مشیر نے ۲ جنوری ۱۹۵۰ء کو اس کیس پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا۔

تقریریں کیں۔ ان مقررین میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی، غلام نبی جانباز اور مولوی محمد علی جالندھری بھی شامل تھے۔ اس جلسے میں حاضرین کی تعداد خاصی زیادہ تھی اس میں مقررین نے مرزا غلام احمد کو ماسٹر تارا سنگھ سے تشبیہ دی۔ چوہدری ظفر اللہ خان کے خلاف توہین آمیز اشارات کئے گئے اور انہیں مسلمان قوم کا غدار بتایا گیا۔ اس کے علاوہ جماعت احمدیہ کے بانی اور اس کے موجودہ امام کے متعلق فحش باتیں کہی گئیں۔ جنرل نذیر احمد کو بھی تبصرہ کا نشانہ بنایا گیا۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری نے بیان کیا کہ ڈپٹی کمشنر ملتان نے بعض مسجدیں مسلمانوں سے چھین کر مرزائیوں کو دے دی ہیں۔ جب اس اجتماع کی روداد ۱۱ رفروری ۱۹۵۰ کو شعبہ قانون کے مشیر کے سامنے آئی تو انہوں نے اپنی وہی پرانی دلیل دہرادی کہ اگر وزیر خارجہ اور احمدیوں کو گالیوں دینے کی پاداش میں احراریوں کے خلاف کوئی اقدام کیا گیا تو احراری مرتبہ شہادت حاصل کر لیں گے اور عوام کو ان سے بے انتہا ہمدردی ہو جائے گی حالانکہ وہ عوام کی نگاہوں میں ایسا محترم مقام حاصل کرنے کے مستحق نہیں ہیں۔ جب ۱۳ رفروری ۱۹۵۰ء کو یہ کیس سردار عبدالرب نشتر نے ملاحظہ کیا تو لکھا کہ میرے نزدیک مجلس احرار کے صدر کو طلب کر کے اس کو آگاہ کر دیا جائے کہ احرار نے مملکت کے فوجی اور غیر فوجی معززین کے خلاف دشنام طرازی کی جو مہم جاری کر رکھی ہے اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ آپ نے لکھا کہ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ مذہب کا نام لے کر مملکت کی بنیادوں کو کمزور کرے۔ میں نے مسئلے کے اس پہلو پر قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولوی غلام غوث سرحدی سے بات چیت کی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اس اشارے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ آپ نے ہدایت کی کہ اب احراریوں کے ساتھ ذرا کھلی کھلی بات ہو جانی چاہیے اور اگر قانون کے مشیر صاحب احراریوں سے گفتگو کرنے میں کوئی دشواری محسوس کرتے ہوں تو میں خود ان سے بات کروں گا۔ چنانچہ ۲۰ فروری ۱۹۵۰ء کو شعبہ قانون کے مشیر نے ماسٹر تاج الدین صدر مجلس احرار کو طلب کر کے تنبیہ کی کہ چوہدری ظفر اللہ خان اور جنرل نذیر احمد جیسے معزز و مقتدر ارکان مملکت کو گالی گلوچ کا نشانہ بنانے کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ ماسٹر صاحب سے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ حکومت اسی تنبیہ کے نتیجے کو دیکھے گی اور اگر اس کا کوئی اثر نظر نہ آیا تو حکومت مجبور ہوگی کہ احرار کے خلاف شدید اقدامات کا حکم دے۔

افغانستان میں احمدیوں کی سنگساری اور ''الشہاب''

بعض ممتاز علمانے ہمارے سامنے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا موت ہے اس لئے اگر احمدی کافر ہیں تو جو شخص احمدی ہو جاتا ہے وہ گویا اپنے آپ کو سزائے موت کا مستوجب بنالیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ افغانستان میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہے چنانچہ وہاں بہت سے اشخاص اپنے غیر اسلامی عقائد کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔ پہلا احمدی جس کو اس قانون کے ماتحت جان دینی پڑی ایک شخص عبدالرحمان خان تھا جو امیر عبدالرحمٰن خان کے عہد حکومت میں ہلاک کیا گیا۔ دوسرا عبداللطیف تھا جو ۱۹۰۳ء میں امیر حبیب اللہ خان کے دورِ حکومت میں سنگسار کیا گیا۔ عبداللطیف افغانستان کا باشندہ تھا اور کچھ مدت تک قادیان میں مرزا غلام احمد کی صحبت میں رہ کر خود احمدی ہو گیا تھا۔ جب وہ ۱۹۰۳ء میں افغانستان کو واپس آیا تو علمانے اس کو احمدی ہو جانے کی وجہ سے مرتد قرار دیا اور اس کو موت کی سزا دے دی۔ چنانچہ وہ کمر تک زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا اور اس کے بعد پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ یہی حشر نعمت اللہ خان کا ہوا جس کو علمائے افغانستان نے احمدی ہونے کی وجہ سے مرتد قرار دیا۔ چنانچہ وہ ۳۱ راگست ۱۹۲۴ء کو بمقام شیراکوٹ برسرِ عام سنگسار کر دیا گیا۔

نعمت اللہ خان کی سزائے موت پر ہندوستان میں اس امر کے متعلق نزاع پیدا ہوا کہ آیا اسلام میں مرتد کی سزا موت ہے یا نہیں۔ دیوبند کے ایک عالم مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس مسئلہ پر ایک کتابچہ ''الشہاب'' کے نام سے لکھا۔ جس کے پہلے حصے میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ احمدی مرتد ہیں اور دوسرے حصے میں اس دعوے کے دلائل دے گئے تھے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا موت ہے۔

یہ کتابچہ کوئی تیس سال تک گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا لیکن مارچ ۱۹۵۰ء سے کچھ پہلے قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے اس کے مصنف سے (جواب شیخ الاسلام پاکستان بن گئے تھے) اس کو دوبارہ چھاپ کر شائع کرنے کی اجازت طلب کی جو عطا کر دی گئی۔ اور اب احراریوں کی تقریروں

ہوئی۔اس کانفرنس میں محمد علی جالندھری نے چوہدری ظفر اللہ خان کو"دیوانہ کتا" کہا، ملک حبیب اللہ نے یہ رپورٹ ۱۹ ؍جون ۱۹۵۰ء کو ڈی آئی جی، سی، آئی، ڈی کو بھیجی اور لکھا کہ اگر احرار کی تقریروں کے لہجے پر کوئی قید عائد نہ کی گئی تو عنقریب حکومت کو بلوے اور قتل کے چند واقعات کا سامنا کرنا پڑے گا۔مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یہ کیس شعبہ قانون کے مشیر کو بھیجا، مشیر نے اس کو سردار عبدالرب نشتر گورنر کی خدمت میں پیش کر دیا۔اور گورنر صاحب نے ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو اس مسئلے پر گفتگو کرنے کیلئے طلب فرمایا۔اس مرحلے پر مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے پوری صورت حال کا جائزہ لیا اور ذیل کی یادداشت لکھی:

> مجلس احرار احمدیت کے بانی اور اس کے موجودہ امام کے متعلق فحش اور غلیظ باتیں تو کرتی ہی ہے اب اس نے دانستہ بھی اور نادانستہ بھی تشدد کی حمایت شروع کر دی ہے۔ یاد ہوگا کہ پچھلے سال ایک نوجوان احمدی افسر جو کپتان کا درجہ رکھتا تھا کوئٹہ میں نہایت وحشیانہ طور پر قتل کر دیا گیا کیونکہ اس نے احمدیت کے خلاف بعض مظاہرہ کرنے والوں کے کردار پر اعتراض کیا تھا۔مجلس احرار برصغیر ہند کی تقسیم کے خلاف تھی احرار لیڈروں پر کانگرس اعتبار کرتی تھی اور احراری ہمیشہ کانگرس کے کارکنوں سے خلاملا رکھتے تھے تقسیم کے بعد یہ لوگ منقار زیر پر ہو گئے۔کچھ مدت تک وہ عوام کے غیظ و غضب سے خائف رہے۔اور کبھی کبھی اس مطلب کے بیانات دیتے رہے کہ وہ پاکستان کے وفادار ہیں ان کی حکمت عملی اس زمانے میں خالص دفاعی تھی اور وہ پناہ گیروں کے کیمپوں اور دوسرے مرکزوں میں خدمت اور امداد کا کام کر رہے تھے چونکہ ممبر ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اس لئے کچھ مدت تک پارٹی شکستہ و منتشر رہی۔سید عطاء اللہ شاہ بخاری لاہور سے اٹھے اور ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں پناہ گزیں ہو گئے۔شیخ حسام الدین نے اعلان کیا کہ ان کی سیاسی زندگی ختم ہو چکی ہے اور پھر انہوں نے بھارت اور پاکستان کے درمیان تجارت کرنے کے لئے مشترک راس المال کی ایک کمپنی قائم کر لی کچھ مدت تک شیخ حسام الدین زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ نظر بند رکھے گئے

کیونکہ پاکستان سے ان کی وفاداری مشتبہ تھی۔ ان کا ایک رفیق کار مخدوم شاہ بنوری بھی کچھ مدت تک نظر بند رہا۔

۲۔ جب اس صوبے کی مسلم لیگ میں اختلافات بڑھ گئے اور اس کے اثر واقتدار کو شدید صدمہ پہنچا تو احرار نے خیال کیا کہ سیاسی میدان میں ان کے داخلے کا یہ وقت نہایت مناسب ہے۔ چنانچہ اسی خیال سے انہوں نے پے در پے تبلیغ کانفرنسیں منعقد کرنی شروع کر دیں۔ اب احراری مقررین کی تقریروں کے خصوصی نکات یہ تھے کہ ہم پاکستان کے وفادار ہیں، مسلم لیگ کو ملک بھر کی واحد سیاسی جماعت تسلیم کرتے ہیں، جہاد کشمیر بالکل حق بجانب تھا اور ملک کے دفاع کو مضبوط کرنے کے لئے عوام کی سعی و جہد کو منظّم کرنا چاہیے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے احمدیوں کے خلاف بھی تقریریں شروع کر دیں۔ مجلس میں بعض نہایت موثر خطیب شامل ہیں چنانچہ سید عطاءاللہ شاہ بخاری اپنے گوشہ عزلت سے نکل آئے اور انہوں نے ایک دفعہ پھر اپنی شعلہ بیانی سے جماعت میں جوش عمل پیدا کر دیا۔ جتنا وقت گزرتا گیا تقریروں کا لہجہ بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ پروگرام کے دوسرے نکات فراموش کر دیئے گئے۔ احرار نے اپنی پوری توجہ احمدیوں کی بدگوئی پر مرتکز کر دی اور نہایت شرمناک دشنام طرازی کا آغاز کر دیا۔ جب ان کی ساکھ کسی قدر عود کر آئی تو انہوں نے سر ظفر اللہ خان پر حملہ کرنا اور انہیں غدار بتانا شروع کر دیا اب احرار کا رویہ مدافعانہ نہیں رہا بلکہ قطعی طور پر جارحانہ ہو چکا ہے حالات بہت زیادہ بگڑ چکے ہیں اور شائستگی اور سیاسی اخلاق کی حدود و قیود توڑی جا چکی ہیں اب تک مندرجہ ذیل قابل ذکر باتیں ظہور میں آئی ہیں:۔

(۱) مرزا غلام احمد کی تحریروں کے اقتباسات ناگوار حد تک نقل کئے جا رہے ہیں اور ان کو توڑ مروڑ کر ان سے فحش اور غلیظ مطالب نکالے جاتے ہیں۔

(۲) مرزا غلام احمد اور موجودہ خلیفہ کو زناکار اور خلاف وضع فطرت حرکات کا مرتکب ظاہر کیا جا رہا ہے۔

(۳) احمدیوں کو غدار کہا جا رہا ہے اور دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ وہ پاکستان کے وفادار نہیں ہیں۔

(۴) سر ظفر اللہ کے خلاف بدگوئی اور دشنام طرازی جاری ہے ان کو اکثر ''گدھا'' اور ''مکار'' بتایا جاتا ہے اور ان پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ قادیان میں احمدی مفادات کے تحفظ کی خاطر کشمیر کو فروخت کر دیں گے۔

(۵) یہ کہہ کر عوام کو دہشت زدہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان پر احمدیوں کی حکومت ہے جو ملک کے غدار ہیں۔

اس مقصد کی خاطر فوجی اور غیر فوجی احمدی عہدہ داروں کی فہرستیں اکثر شائع کی جاتی ہیں۔

(٦) سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بارہا کہا ہے کہ اگر مرزا غلام احمد نے ان کی زندگی میں نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو وہ ان کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتے۔

(۷) پچھلے دنوں احراریوں کے ایک جلسے میں جذبات اس قدر مشتعل کیے گئے کہ حاضرین میں سے ایک شخص نے اٹھ کر اعلان کیا کہ میں مرزا بشیر الدین کو قتل کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔

(۸) ملتان کے ایک جلسے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سن کر ایک شخص اٹھا اور کہنے لگا کہ اگر حکم ہو تو میں جا کر سر ظفر اللہ کو قتل کر دوں۔

(۹) ''الشہاب'' کے نام سے ایک کتابچہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھا تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ احمدی مرتد ہیں لہٰذا ہر مسلمان ان کو قتل کر سکتا ہے یہ کتابچہ دوبارہ چھپ کر شائع کیا جا رہا ہے (یہ کتابچہ مولانا مرحوم نے اس زمانے میں لکھا تھا جب افغانستان میں دو احمدیوں کے ہلاک کیے جانے پر ملک میں ایک بحث چھڑ گئی تھی)

(۳) احرار نے ان بے شمار اقتصادی معاشرتی اور سیاسی مسائل کے متعلق جو پاکستان کو درپیش ہیں کبھی کوئی تعمیری خدمت انجام نہیں دی۔ عملاً ان کے پاس کوئی سیاسی پروگرام نہیں سوائے اس خواہش کے کہ آئندہ انتخابات میں انہیں عوام کی حمایت حاصل ہو جائے۔

(۴) عوام کا حافظہ دردناک حد تک کمزور ہوتا ہے باوجود اس کے کہ آج سے دو سال پہلے

43

احرار لیڈر شک وشبہ اور بے اعتباری کی نظر سے دیکھے جاتے تھے آج وہ جب کبھی عام جلسوں میں تقریریں کرتے ہیں تو بے شمار حاضرین ان کو سننے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو ان احرار لیڈروں کی نیت پر اعتراض کریں یا ان سے اتنا ہی پوچھ لیں کہ آخر وہ احمدیوں کے خلاف اتنا شور کیوں مچا رہے ہیں۔ احرار جزوی طور پر اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہیں انہوں نے اپنے آپ کو دوبارہ عوام کی نظروں میں مقبول بنا لیا ہے اور وہ عنقریب ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اٹھیں گے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ جماعت مسلم لیگ کی حامی ہو اگر وہ مخلص ہوتے تو اپنی تنظیم کو ختم کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو جاتے۔

(۵) احرار لیڈروں کو غالباً اس امر کا احساس نہیں ہے کہ وہ آگ سے کھیل رہے ہیں۔ مسخرا پن کو تو کسی حد تک نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن جب عوام کے جذبات کو اس حد تک مشتعل کر دیا جائے کہ قتل بلوے اور توہین وتضحیک وغیرہ کے خطرات پیدا ہو جائیں تو اس کو روکنا قطعی طور پر لازمی ہے۔ ممکن ہے احرار لیڈروں کے خلاف قانون تعزیرات کے ماتحت مقدمات چلانا مناسب نہ ہو۔ (تا کہ مزید بحث ونزاع پیدا نہ ہو) لیکن چونکہ ان کی سرگرمیاں سلامتی عامہ اور امن عامہ کے قیام کے منافی ہیں، اس لئے مندرجہ ذیل تجاویز پر غور کرنا ضروری ہے۔

(الف) جب عملی تشدد کی تلقین کی جائے، یا اس تلقین کی اعانت کی جائے تو زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کاروائی کی جانی چاہیے۔

(ب) احرار لیڈروں کی طرف سے سر ظفر اللہ خان کے خلاف دشنام وبدگوئی کسی حالت میں برداشت نہ کی جائے۔ ہر شخص کابینہ کے کسی وزیر کی علی الاعلان توہین کرے اس امر کا مستوجب ہونا چاہیے کہ اس کے خلاف زیر دفعہ ۲۱ پنجاب ایکٹ پبلک سیفٹی ایکٹ کاروائی کی جائے۔

(ج) غیر شریفانہ اور فحش تقریریں جن سے اخلاق عامہ کی تخریب ہوتی ہو اور عوام کی حس شائستگی کو صدمہ پہنچتا ہو ہرگز برداشت نہ کی جائیں احراری مقررین نے بارہا کہا ہے کہ مہاتما گاندھی اور احمدیوں کے خلیفہ ہم بستر ہوئے تھے، اس قسم کی نفرت انگیز اور مکروہ ترین ظرافت علی الخصوص ایک اسلامی مملکت میں ہرگز قابل برداشت نہ ہونی چاہیے۔

جائز تنقید تک محدود نہیں رہیں ۔ ان میں سے بعض مقرر ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن کا نتیجہ فساد کی اختیار کر سکتا ہے ۔ حکومت اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتی اور اگر احرار نے اپنا رویہ ترک نہ کیا تو حکومت مجبور ہوگی کہ صوبے کے قانون وانتظام کی حفاظت کے لئے ان کے خلاف یہ مناسب اقدام کرے ۔ میں نے ان کو یہ بھی بتادیا ہے کہ عام خیال یہ ہے (اور میرے نزدیک یہ صحیح بھی ہے) کہ احراری ''ختم نبوت'' کے پردے میں جو کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں ان سے اپنے سیاسی مقاصد کا حصول مقصود ہے ۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان عوام میں (جو قبل تقسیم کی احراری سرگرمیوں کی وجہ سے طبعاً بیزار ہیں ، از سر نو ہر دلعزیز ہو جائیں ۔ میں نے یہ بھی کہا کہ عوام اتنے احمق نہیں ہیں کہ اس کھیل کو سمجھ نہ سکیں جسے بعض احراری کھیل رہے ہیں ۔ وہ آئے دن پاکستان کے وزیر خارجہ کو اور بہت سے اعلیٰ فوجی اور غیر فوجی عہدہ داران حکومت کو جو احمدی ہیں نشانہ دشنام بنا رہے ہیں اگرچہ اس پروپیگنڈے کو مذہبی رنگ دیا جا رہا ہے لیکن اس کا اصل مقصد یہی سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں حکومت پاکستان کے خلاف نفرت وحقارت پیدا کی جائے جس نے یہ ذمہ داری کے عہدے ایسے اشخاص کے سپرد کر رکھے ہیں ۔ ابھی تھوڑی ہی مدت گزری ، کہ احراریوں کے ایک حامی اخبار نے ایسے فوجی افسروں کی ایک طویل فہرست شائع کی تھی جن کو قادیانی بتایا گیا تھا اگر اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اس طریقے سے احراری عساکر پاکستان کے متعلق مسلمانوں کے جوش وتپاک کو کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ بے جا نہ ہوگا اور جب احرار ، احمدیوں کے متعلق حکومت افغانستان کی پالیسی کا ذکر کرتے ہیں تو یہ امر اور بھی زیادہ مشتبہ ہو جاتا ہے تقریروں میں یہ کہا جاتا ہے کہ حکومت افغانستان احمدیوں کو سزائے موت دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ حکومت پاکستان کا رویہ احمدیوں کے متعلق کیا ہے ۔ اس مقابلے اور موازنے کا یقیناً یہ مطلب سمجھا جا سکتا ہے کہ حکومت پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ میں نے صدر مجلس احرار کو یہ بھی بتادیا کہ اب تک مسلم لیگی حکومت احراریوں کی سرگرمیوں کو بے نقاب کرنے کے لئے میدان میں نہیں آئی لیکن اگر احرار کا شیوہ یہی رہا تو ارکان حکومت کو سامنے آنا پڑے گا اور وہ عوام کو احرار کی گزشتہ سرگرمیاں اس انداز سے یاد دلائیں گے کہ

میرے نزدیک احراری ہمیشہ کے لئے مردود قرار پائیں جائیں گے۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ ایک حد تعجب انگیز بات یہ ہے کہ احراری پاکستان کے مسلمانوں کے جذبات کو احمدیوں کے خلاف اس بنا پر برانگیختہ کررہے ہیں کہ اگر احرار کے بیان کے مطابق احمدی ایک خاص رویہ اختیار نہ کرتے تو ضلع گورداسپور کا ایک حصہ جواب بھارت کا جزو ہے پاکستان کو مل گیا ہوتا حالانکہ احراری خودزندگی بھر تقسیم ہند کی مخالفت اور کانگرس کی حمایت کر کے پورے کا پورا پاکستان ہندوؤں کے حوالے کرنے میں کوشاں رہے ہیں۔

(۲) ماسٹر تاج الدین نے جواب دیا کہ ہماری سرگرمیوں کے متعلق آپ کا یہ خیال سن کر مجھے بے حد اذیت ہوئی ہے میں تو ہمیشہ ہی احراری مقررین کو تلقین کرتا رہا ہوں کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے حکومت کو کسی قسم کی پریشانی ہو یا امن و امان درہم برہم ہو جائے۔ ماسٹر صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ میرے خیالات اپنی جماعت کے لیڈروں تک پہنچا دیں گے اور مجھے یقین دلایا کہ آئندہ پوری کوشش کی جائے گی کہ حکومت کو کسی قسم کی وجہ شکایت پیدا نہ ہو۔

مزید واقعات قتل

''الشہاب'' کی وسیع اشاعت اور احمدیوں کے خلاف احرار کی نفرت انگیز مہم کے نتائج قطعی اور قدرتی تھے۔ انیس سال کے ایک نوجوان محمد اشرف نے اوکاڑہ میں ایک احمدی مدرس غلام محمد کو قتل کر دیا اس قتل کی کہانی درج ذیل ہے:۔

یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء کو ایک احمدی مولوی نوردین سات دوسرے احمدیوں کے ساتھ تبلیغی مہم پر چک نمبر ۵ میں گیا۔ یہاں کے غیر احمدیوں نے ان مبلغوں کو گھیر لیا پھر ان پر کیچڑ پھینکی، ان کے چہروں پر کالک ملی، اور گندے پانی میں سے انہیں ہنکا کر ریلوے سٹیشن اوکاڑہ تک پہنچایا۔ پولیس میں اس واقعہ کی رپورٹ لکھائی گئی جس پر ایک شخص مولوی فضل الٰہی زیر دفعات ۱۴۷ اور ۳۴۲ زیر حراست لے لیا گیا۔ اس گرفتاری کے خلاف احتجاج کے طور پر اوکاڑہ میں دکانیں بند ہو گئیں اور ۳ اکتوبر کی رات کو ایک جلسہ عام ہوا، جس میں ہزاروں اشخاص شامل ہوئے بہت سے مقررین نے تقریریں

48

کیں جو بے انتہا اشتعال انگیز تھیں۔ ایک مقرر نے جلسے کے نوجوان حاضرین سے اپیل کی کہ مرزائی سے قوم کو نجات دلاؤ۔ دوسرے دن محمد اشرف نے جو تقریریں سن چکا تھا ایک چھرے سے مسلح ہو کر غلام محمد کا تعاقب کیا جبکہ وہ اوکاڑہ جارہا تھا۔ محمد اشرف نے غلام محمد کو ایک نہر کے قریب جا لیا، اور اس کے چھرا گھونپ دیا۔ غلام محمد کا زخم کاری تھا چنانچہ وہ تھانے کو لے جانے سے پہلے ہی مر گیا۔ محمد اشرف ایک مجسٹریت کی عدالت میں پیش کیا گیا جہاں اس نے یہ بیان دیا:

پہلے یہ کہا کہ ستمبر میں، پھر کہا کہ اکتوبر کی تیسری تاریخ کو اوکاڑہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں رضوانی بشیر احمد، مولوی ضیاء الدین، قاضی عبدالرحمٰن چوہدری محبوب عالم اور صدر جلسہ نے جو غالباً قاضی تھے پر جوش تقریریں کیں۔ جن میں بتایا کہ مرزائی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گالیاں دیتے ہیں ہم حضورؐ کی عظمت کے لئے اپنی جانیں دے دیں گے۔ تقریروں میں یہ کہا گیا کہ جو لوگ ان کو (احمدیوں کو) پہچان کر نابود کرنے پر آمادہ ہیں وہ اپنے ہاتھ اٹھائیں، جلسے میں علم دین غازی کا ذکر بھی کیا گیا اور اس کی سرگزشت سنائی گئی میں نے اس سے پہلے بھی علم دین غازی کی سرگزشت پڑھی تھی اور ایک دفعہ اس کے مقبرے پر بھی گیا تھا اس کے بعد جلسہ ختم ہو گیا میں گھر واپس آ گیا تقریروں کے الفاظ رات بھر میرے دماغ میں گونجتے رہے۔ صبح اٹھ کر میں سائیکل پر چک نمبر ۴۸ گیا جہاں ماسٹر تفریحی چھٹی پر اپنے گھر گیا ہوا تھا میں چک میں ٹھہرا رہا تاوقتیکہ وہ سکول میں نہ آ گیا، گاؤں کے چوک کی ایک دکان پر میں نے ایک سگریٹ پیا، جب میں باہر نکلا تو ماسٹر سکول میں نہ تھا مجھے یقین تھا کہ ماسٹر مرزائی ہے اور میں اسی نیت سے آیا تھا۔ چک میں، میں نے ایک سید سے پوچھا کہ آیا حضور نبی کریمؐ کے زمانے میں ہمارے بچوں کو پڑھانے پر کوئی کافر مقرر تھا؟ اس ماسٹر کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارے چک میں مقیم ہے۔ زمین الاٹ کرا رکھی ہے، اور بچوں کو پڑھا رہا ہے، اس کے بعد میں نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ ماسٹر کہاں گیا اس نے بتایا کہ وہ چک ۴۰/۳ آر کو گیا ہے، میں نے پوچھا سائیکل پر یا پیدل، جواب ملا، سائیکل پر، میرے پاس ایک چھرا تھا میں نے اس کو دو میل کے فاصلے پر جا لیا وہاں میں نے اپنے سائیکل سے اتر کر اس کے سائیکل کو دھکا دیا اور اسے گرا لیا۔ میں نے ماسٹر کو چھرے سے ایک ضرب لگائی اور وہ بھاگ کر چھوٹی نہر کے پانی میں گھس گیا۔ چھرا ٹھیک نہ رہا۔ میں

کر کے سزائے موت کی منسوخی کو جائز قرار دے دے۔

51

اگر ہم اسی اصول کی پیروی کرتے ہیں جو مذکورہ بالا دو مقدموں میں قائم کیا گیا ہے تو ہمارے لیئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا کہ ہم عمر قید کی سزا کو بڑھا کر موت دیتے لیکن یہ دونوں قبل تقسیم زمانے کے مقدمات ہیں اور ان دونوں میں اصل فیصلے پر حکومتی مصالح کا اثر پڑا ہے موجودہ مقدمے میں ہم اس حقیقت کی طرف سے آنکھ بند نہیں کر سکتے کہ قتل کا ارتکاب کسی پست مقصد سے نہیں کیا گیا، مجرم نوجوان ہے، اور اثر قبول کرنے والی عمر میں ہے اس کو یقین دلایا گیا کہ ان حالات میں قتل ایک فریضہ ہے جس کی بجا آوری سے اس کو بڑا ثواب ہوگا۔ ۳/اکتوبر کے جلسے میں جو تقریریں کی گئیں ان میں احمدیوں کو اسلام کے لئے خطرہ بتایا گیا اور اس قسم کے خوفناک فتوے کا لازمی نتیجہ ہلاکت ہے۔ جب کبھی کوئی نوجوان اپنے بزرگوں کے زیر اثر قتل کا مرتکب ہوا ہے ہم نے ہمیشہ یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کو موت کی سزا نہ دی جائے اور ہم اس قسم کے مقدمات اور موجودہ مقدمے کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ موجودہ مقدمے میں بزرگوں کی جگہ علمائے دین نے لے لی ہے جنہوں نے علی الاعلان ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت سے تشدد کی تلقین کی ہے۔ اس کے علاوہ قتل کی ایک اور قسم بھی ہے جس میں عدالتیں عام طور پر موت کی سزا نہیں دیتیں یعنی جب جرم کسی ایسے خلل دماغی کے زیر اثر کیا گیا ہو جو قانون کے نزدیک دیوانگی کی حد تک نہ پہنچتا ہو۔ ہمارے نزدیک ایک مذہبی جوشیلے اور دیوانے آدمی کا معاملہ جرم کی اس قسم سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ اس مقدمے کی سزا میں اضافہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ بہر کیف اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کوئی عمومی قاعدہ قائم کر رہے ہیں بلکہ اگر اس قسم کے جرم کا اعادہ کیا گیا۔ جس سے مذہب کی رسوائی کا احتمال ہو اور جس سے مذہب اضحوکہ روزگار بن جائے تو ہو سکتا ہے کہ ہم اس سے مختلف نقطہ نگاہ قائم کریں اور قتل کی وہی سزا تجویز کریں جو معمول عام ہے۔

اوکاڑہ کے قتل کے بعد اسی مہینے میں ایک اور احمدی قتل کر دیا گیا دونوں وارداتوں کے درمیان صرف چند روز کا وقفہ تھا راولپنڈی کے باغ گوالمنڈی میں ایک شخص ولایت خاں نے بدر دین احمد کو گولی سے مار ڈالا۔ اس قتل کا مقصد کچھ واضح نہیں ہوا لیکن عینی شاہدوں میں سے ایک

نے جس پر سیشن جج اور ہائی کورٹ دونوں نے اعتبار کیا ہے یہ بتایا کہ جب مجرم کو عین موقع پر گرفتار کیا اس نے خود یہ اعتراف کیا تھا کہ میں نے بدرالدین کو اس لئے ہلاک کیا ہے کہ وہ احمدی ہے۔

ان واقعات قتل پر احمدی جماعت نے شدید صدائے احتجاج بلند کی اور اس سلسلے میں مرکزی حکومت کے پاس بعض عرضداشتیں بھیجیں۔ وزارت داخلہ نے اپنی چٹھی نمبری 50 / S(I)-109 مؤرخہ ۲ رنومبر ۱۹۵۰ء کے ساتھ ایک قرارداد چیف سیکرٹری حکومت پنجاب کو بغرض تبصرہ بھیجی۔ جو احمدیہ مسلم ایسوسی ایشن کراچی نے ۲۰ راکتوبر ۱۹۵۰ء کو منظور کی تھی، قرارداد حسب ذیل ہے:۔

جماعت احمدیہ کراچی کا یہ جلسہ عام اوکاڑہ میں ماسٹر غلام محمد احمدی اور راولپنڈی میں چوہدری بدرالدین احمدی کے قتل کے خلاف شدید ملامت کا اظہار کرتا ہے اور ان واقعات کو ان اشتعال انگیز تقریروں کا نتیجہ سمجھتا ہے جو احراری لیڈر احمدی جماعت کے خلاف کررہے ہیں یہ جلسہ اس امر پر گہری تشویش ظاہر کرتا ہے کہ صوبائی اور مرکزی حکومتیں پاکستانی شہریوں کے ایک طبقے کے خلاف احراریوں کی شرارت آمیز سرگرمیوں کی طرف اب تک توجہ نہیں کرسکیں۔ یہ جلسہ دونوں حکومتوں کی توجہ اس خطرناک صورتحال کی طرف مبذول کراتا ہے جو اس قسم کی سرگرمیوں سے پیدا ہو چکی ہے اور دونوں حکومتوں سے اصرار کرتا ہے کہ اس معاملے میں مناسب اقدام کریں۔

مرکزی حکومت نے پنجاب سے یہ بھی سوال کیا کہ آیا اس کے نزدیک واقعی صوبہ پنجاب میں احمدیوں کے لئے عام خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔ اس پر حکومت پنجاب کا جواب یہ تھا کہ احمدیوں کے خلاف کسی متشددانہ ہنگامے کا کوئی خطرہ نہیں۔ دونوں واقعات قتل کے مقدمات کی سماعت عدالت میں ہو رہی ہے اور اگر احرار (حسب اطلاع) مسلم لیگ کے ساتھ تعاون پر رضامند ہو گئے۔ تو جس فرقہ بندانہ تبلیغ میں وہ مصروف ہیں، خود بخود ختم ہو جائے گی۔

مارچ ۱۹۵۱ء میں ایک سازش کا انکشاف ہوا جس میں بڑے بڑے فوجی افسر شریک تھے اور جس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت پاکستان کا تختہ الٹا دیا جائے۔ اس مقدمے کے ملزموں میں جسے بعد میں مقدمہ سازش راولپنڈی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ایک میجر جنرل نذیر احمد بھی تھے جو احمدی ہیں۔ مولوی محمد علی جالندھری نے ۱۵ راپریل ۱۹۵۱ء کو منٹگمری کی جامع رشیدیہ کے سالانہ اجلاس میں

تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ پاکستان کی ہوائی فوج میں اسی فیصدی پائیلٹ احمدی ہیں راولپنڈی کی سازش کے انکشاف سے احمدی افسروں کی غداری بے نقاب ہو چکی ہے۔ اس سازش نے حکومت کو حقائق کی طرف سے خبردار کر دیا ہے میرے پاس تحریری شہادتیں موجود ہیں جن سے اس سازش میں احمدیوں کی شمولیت ظاہر ہے اور چوہدری ظفر اللہ خان نے مملکت پاکستان کے روپیہ سے امریکہ میں پریزیڈنٹ ٹرومن کے محل کے عین سامنے ایک عظیم الشان عمارت خریدی ہے تاکہ وہاں احمدیت کی تبلیغ کی جائے۔ جب اس تقریر کی روداد مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی کے سامنے آئی تو انہوں نے لکھا کہ اس قسم کی تقریروں سے امن عامہ پر نہایت مضر اثر ہوگا۔ اور احمدیوں کے خلاف غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ آپ نے یہ بھی لکھا کہ اگر اس قسم کا پروپیگنڈا جاری رہا تو مجلس احرار کو ایک دفعہ رسمی تنبیہ کرنی پڑے گی۔ یہ یادداشت چیف سیکرٹری اور پھر وزیر اعلیٰ کے ملاحظہ میں لائی گئی جنہوں نے اس پر دستخط کر دیئے۔ لیکن جب فائل واپس اے ڈی آئی جی کے پاس پہنچی تو انہوں نے یہ لکھا کہ اس کیس کے متعلق کوئی احکام تو صادر نہیں کئے گئے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کسی اقدام کا منشا نہیں رکھتی۔

یوم تشکر

احرار نے اپنی قرارداد لاہور (جنوری ۱۹۴۹ء) کے رو سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ مجلس احرار ایک خالص مذہبی جماعت بن جائے اور تمام سیاسی معاملات میں مسلم لیگ کی امداد و اعانت کیا کرے۔ انہوں نے یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کی حمایت کرینگے بشرطیکہ لیگ کا نامزد کردہ امیدوار احمدی نہ ہو۔ انتخابات کا ہنگامہ ابتدائے سرما ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا اور نتائج مارچ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئے۔ مسلم لیگ نے بہت بڑی اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ مسلم لیگ نے بعض احمدیوں کو اپنے امیدواروں کی حیثیت سے نامزد کیا تھا لیکن وہ سب کے سب ہار گئے۔ احرار کی اپنی سرگرمیاں دورانِ انتخاب میں کچھ انمل بے جوڑ سی رہیں۔ مسٹر دولتانہ کی شہادت مظہر ہے کہ اگرچہ احرار نے بعض مسلم لیگی امیدواروں کی تائید کی لیکن بعض کی مخالفت تھی۔ حالانکہ وہ احمدی نہ تھے۔ مسلم لیگی وزارت ابتداء کے اپریل ۱۹۵۱ء میں برسر اقتدار آئی۔ مسٹر دولتانہ

وزیر اعلیٰ قرار پائے۔

54

چونکہ مجلس قانون ساز میں کوئی احمدی منتخب نہ ہوا تھا اس لئے احراریوں نے اعلان کیا کہ ایک یوم تشکر منایا جائے گا تا کہ اس فتح پر خوشی منائی جائے جو ہم نے اپنے مخالفین پر حاصل کی ہے۔ یہ یوم مارچ سے لیکر مئی ۱۹۵۱ء تک مختلف مقامات پر مختلف ایام میں منایا گیا۔ لائل پور میں یہ یوم 20 اپریل 51ء کو منایا گیا جہاں ایک بہت بڑے جلسے میں غلام نبی جانباز نے ایک احمدی دکاندار فضل دین کو دھمکی دی کہ تمہارا حشر برا ہوگا۔ چنانچہ ۷ مئی کو دن دہاڑے اس دکاندار پر اس کی دکان کے اندر ہی حملہ کیا گیا۔ ۱۳ مئی کو ایک ہجوم نے سمندری میں ایک احمدیہ مسجد کو آگ لگا دی اور نمازیوں کو زدوکوب کیا۔

گوجرانوالہ میں اس یوم کا اشتہار ۲۹ کو دیا گیا اور جلسہ ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو منعقد ہوا۔ جس انداز سے اس جلسے کا اعلان کیا جا رہا تھا اس کی وجہ سے ایک احمدی اور ایک غیر احمدی کے درمیان جھڑپ ہوگئی جس میں غیر احمدی زخمی ہوا۔

لاہور میں یوم تشکر ۲۵، ۲۶ مئی ۱۹۵۱ء کو منایا گیا۔ چونکہ اس سے قبل سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور میں اور محمد علی جالندھری نے جامع رشیدیہ منٹگمری میں احمدیوں پر سازش راولپنڈی میں شریک ہونے کا الزام لگایا تھا اور اس سلسلے میں میجر جنرل نذیر احمد کا نام خاص طور پر لیا تھا اس لئے احرار لیڈروں کو یہ تنبیہ کی گئی کہ اگر اس الزام کا اعادہ کیا گیا تو ایک بے قصور جماعت کے خلاف تشدد مخالفت کا جذبہ بھڑک اٹھے گا اور جو مقرر اس موضوع کی طرف کوئی اشارہ کرے گا اس پر توہین عدالت کا مقدمہ چلایا جاسکے گا چنانچہ مسٹر قربان علی خاں انسپکٹر جنرل پولیس نے ۲۳ مئی ۱۹۵۱ء کو ماسٹر تاج الدین انصاری کو طلب کر کے تنبیہ کر دی کہ اس موضوع پر کچھ کہا گیا تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

یوم منانے کے سلسلے میں پہلے دن تمام پنجاب اور صوبہ سرحد کے اضلاع پشاور وہری پور ہزارہ کے احراری رضاکاروں کے دستے لاہور کے بازاروں سے بشکل جلوس گزرے ان کے ساتھ پانچ بینڈ باجے بھی تھے۔ شام کو جلسہ ہوا جس میں بہت سے معززین مثلاً مسلم لیگی ایم ایل اے اور

عہدہ دار بھی شامل تھے۔ احرار لیڈروں نے تقریریں کیں۔ صاحبزادہ فیض الحسن نے اپنی تقریر میں مطالبہ کیا کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے یا انہیں مجبور کیا جائے کہ اس ملک کو چھوڑ دیں اور بھارت میں آباد ہو جائیں۔ مولانا احمد علی نے جو جلسے کی صدارت کر رہے تھے ایک قرارداد پیش کی جس میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ احمدیوں کو ذمہ دار عہدوں سے موقوف کر دے۔ اور سید عطا اللہ شاہ بخاری نے میجر جنرل نذیر احمد کی گرفتاری کا ذکر کر کے کہا کہ اس گرفتاری نے یوم تشکر کو یوم تفخر بنا دیا ہے کیونکہ مملکت ایک بہت بڑے خطرے سے بچ گئی ہے۔ بخاری نے حسب معمول اپنے مبتذل اور پست مزاج سے کام لیکر کہا کہ میجر جنرل نذیر احمد ننگا ہو گیا ہے، اب احمدی اس کو نئی پتلون پہنائیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میجر جنرل نذیر احمد کو مرزا بشیر الدین محمود احمد نے اکسا کر سازش میں شامل کرایا ہے۔ بخاری نے اس جلسے کے حاضرین سے جو نعرے لگوائے وہ سب حسب ذیل تھے:۔

نمک حرامانِ پاکستان مردہ باد، غدارانِ پاکستان مردہ باد

پاکستان زندہ باد، مرزا بشیر الدین محمود احمد مردہ باد

مرزائیت مردہ باد

۲۶ رمئی کے جلسے میں قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے پھر مقدمہ سازش راولپنڈی کا ذکر کیا اور شیخ حسام الدین نے اعلان کیا کہ احمدی جو مسلمان کے قومی اتحاد کے لئے ایک خطرہ ہیں، کلیدی عہدوں سے موقوف کئے جانے چاہئیں۔ شیخ حسام الدین اور علامہ علاؤالدین صدیقی نے چوہدری ظفر اللہ خان کے متعلق توہین آمیز کلمات کہے اور ان کی موقوفی کا مطالبہ کیا اس دن بھی ایک جلوس نکالا گیا۔

جب حسب معمول اس جلسے کی تقریروں کی روداد چیف منسٹر کی خدمت میں پیش کی گئی تو انہوں نے اس پر ذیل کی معنی خیز رائے لکھی۔

''احرار ایک ایسے مسئلے سے فائدہ اٹھا کر جس کو پاکستانی عوام میں واضح مقبولیت حاصل ہے، اپنے لئے محض سیاسی موقف و مقام پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں اس امر پر گہری نظر رکھنی چاہیے کہ یہ معاملہ ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہو''۔

احمدیوں کی مسجد جلادی گئی

امیر جماعت احمدیہ بھیرہ نے فضیلت مآب گورنر جنرل پاکستان کی خدمت میں ایک تار بھیجا جس میں شکایت کی کہ سمندری میں احمدیوں کی ایک مسجد جلادی گئی ہے اور وہاں پرامن نمازیوں کو بیدردی سے زدوکوب کیا گیا ہے وزارت داخلہ نے اپنی چٹھی نمبر 44/1/51-poll مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۵۱ء کے ساتھ اس تار کی ایک نقل چیف سیکرٹری حکومت پنجاب کو بھیج کر استدعا کی کہ اس واقعہ کی روداد اور اس پر حکومت پنجاب کا تبصرہ جلد از جلد ارسال کیا جائے۔ اس چٹھی کے جواب میں سید احمد علی ہوم سیکرٹری حکومت پنجاب نے مندرجہ ذیل چٹھی نمبر BDSB- 8447 مورخہ ۲۸/جون ۱۹۵۱ء لکھی۔

بحوالہ آپ کی چٹھی نمبر (!)44/1/51-poll مورخہ ۲۸/مئی ۱۹۵۱ء بھیجی یہ اطلاع دینے کی ہدایت کی گئی ہے کہ ۱۳/مئی ۱۹۵۱ء کی سہ پہر کو قصبہ سمندری ضلع لائل پور کے غیر احمدیوں (احراریوں) کا ایک ہجوم جمع ہوا اور اس نے ایک کچی مسجد کی چھت اور اس کی چٹائیوں کو آگ لگادی یہ مسجد ایک کمرے اور ایک چبوترے پر مشتمل ہے اور ڈسٹرکٹ بورڈ سکول کے نواح میں اراضی متروکہ پر بنائی گئی ہے۔ احمدی جماعت کے چند افراد اس وقت وہاں موجود تھے جو نشانہ زدوکوب بنائے گئے ڈسٹرکٹ بورڈ سکول کے ایک چپراسی نے توہین مسجد اور آتش زنی کی اطلاع مقامی پولیس کو پہنچائی اور پولیس فوراً موقع پر پہنچ گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرینٹنڈنٹ پولیس بھی بلاتاخیر موقع پر پہنچ گئے اور صورت حالات پر قابو پالیا گیا۔ چودہ قانون شکن اشخاص بحالت ارتکاب جرم گرفتار کر لئے گئے۔ کچھ دیر بعد چھ اور اشخاص گرفتار کئے گئے اور تفتیش کی تکمیل کے بعد مقدمہ عدالت میں دائر کر دیا گیا۔ مقامی حکام کی فوری اور مستعدانہ کاروائی نے صورت حالات کو بگڑنے سے بچایا اور اب فضا پرسکون ہے۔

جن اشخاص نے پولیس کو ابتدائی رپورٹ دی انہوں نے واقعہ کے متعلق مبالغہ آمیز بیان دیا اور بعض بیگناہوں کو بھی لپیٹ لیا، جن میں سے دو محکمہ مال کے ملازم ہیں۔ تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ

انہوں نے ارتکاب جرم میں کوئی حصہ نہیں لیا اور ان کے خلاف الزامات بے بنیاد ہیں۔ مزید حالات وکوائف سے مناسب موقع پر اطلاع دی جائے گی۔

احراریوں کی دوسری تقریریں

۲۵ راگست ۱۹۵۱ء کو مسٹر بشیر الدین امیر جماعت احمدیہ لاہور نے ڈپٹی کمشنر لاہور کے نام ایک چٹھی لکھی جس میں سید عطا اللہ شاہ بخاری کی ایک تقریر کے متعلق شکایت کی۔ یہ تقریر ۱۹ راگست ۱۹۵۱ء کو بیرون موچی دروازہ لاہور ایک بہت بڑے جلسہ عام میں کی گئی تھی جس میں مقرر نے بیان کیا تھا کہ

(الف) چوہدری ظفر اللہ خان وزیر خارجہ پاکستان مملکت کے وفادار نہیں ہیں۔

(ب) تقسیم سے قبل جماعت احمدیہ کے امام نے اپنے پیروؤں کو بتایا تھا کہ پاکستان وجود میں نہیں آئیگا، اور اگر کوئی اس قسم کی مملکت پیدا کر لی بھی گئی تو تقسیم شدہ ملک دوبارہ متحد ہو جائے گا۔

(ج) احمدی بھارت کی حکومت کے جاسوس ہیں اگر بھارت کے ساتھ جنگ چھڑ جائے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر احمدیوں کی بیخ کنی کر دینی چاہیے جو مملکت کے دشمن ہیں۔

یہ چٹھی کمشنر کی یادداشت کے ساتھ ہوم سیکرٹری (سید احمد علی) کو بھیجی گئی جنہوں نے یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کو اس پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا:۔

میں اس معاملے کے متعلق چیف منسٹر صاحب سے گفتگو کی ہے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں انسپکٹر جنرل پولیس سے استدعا کروں کہ وہ احرار لیڈروں تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ اپنی تقریروں میں وزیر خارجہ کے متعلق اور علی العموم جماعت احمدیہ کے متعلق اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ اب تک ایک بلوہ اور قتل ہو چکا ہے ایک احمدی کے منہ پر کالک مل کر اسے گدھے پر سوار کرایا گیا ہے اور ان کی ایک مسجد جلائی جا چکی ہے۔ اگر اب احراری اپنی اشتعال انگیز تقریریں بند نہ کر دیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قانون وانتظام برباد ہو جائے گا۔ ماضی میں انہیں متعدد بار تنبیہ کی جا چکی

وزیر امور خارجہ قادیان کی خاطر کشمیر کو حکومت ہند کے ہاتھ فروخت کر رہے ہیں آیا یہ اطلاع درست ہے؟ اس چٹھی میں یہ تجویز کیا گیا کہ بخاری اور دوسرے احراری لیڈروں کو صاف الفاظ میں تنبیہ کرنی چاہئے کہ وہ وزیر امور خارجہ کو اور بالعموم احمدیوں کو بدنام کرنے سے اجتناب کریں۔ اس کے جواب میں چیف سیکرٹری نے مندرجہ ذیل D.O نمبر 11794-BDSB مؤرخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۵۱ء وزارت امور خارجہ کو ارسال کی:۔

بحوالہ آپ کی ڈی او چٹھی نمبر 51/(1)-s-720 مؤرخہ ۴ ستمبر ۱۹۵۱ء عرض ہے کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری نے ۱۹ اگست ۱۹۵۱ء کو موچی دروازے کے باہر ایک جلسہ عام میں تقریر کی تھی۔ اس نے جماعت احمدیہ کے خلاف توہین آمیز باتیں کیں اور کہا کہ مرزا بشیر الدین محمود پاکستان کے قیام کے مخالف تھے اور انہوں نے علیٰ الاعلان ہندوستان کو اکھنڈ بنانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ بیان عزت مآب چوہدری ظفر اللہ خان کے سامنے دیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس کی تردید نہیں کی تھی۔ حکومت صوبہ ان شرارت آمیز تقریروں کی طرف برابر متوجہ ہے جو احراری لیڈر کر رہے ہیں۔ ابھی یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کو انسپکٹر جنرل پولیس نے شیخ حسام الدین جنرل سیکرٹری مجلس احرار کو طلب کر کے واضح طور پر تنبیہ کی تھی اور شیخ حسام الدین نے انسپکٹر جنرل پولیس کو یقین دلایا تھا کہ ان کی جماعت کی پالیسی یہ نہیں کہ اختلافات پیدا کئے جائیں۔ خصوصاً اس موقع پر جب ملک ایک نازک حالت سے دوچار ہے، مزید براں انہوں نے ذمہ لیا کہ وہ جلد سے جلد مجلس عاملہ کا ایک اجلاس طلب کریں گے تاکہ ممبروں کو تقریروں میں ضبط و تحمل اختیار کرنے کی تلقین کریں۔ اس واضح اور قطعی یقین دہانی کے پیش نظر حکومت صوبہ سید عطا اللہ شاہ بخاری کو ایک دفعہ اور تنبیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ صورت حال پر نگاہ رکھی جا رہی ہے اور اگر معلوم ہوا کہ تنبیہ کی تعمیل نہیں ہوئی تو مناسب اقدام کیا جائے گا۔

۲۷ ستمبر ۱۹۵۱ء کو سپرنٹنڈنٹ پولیس سرگودھا نے اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس کو اطلاع دی کہ ۲۲ اور ۲۳ ستمبر ۱۹۵۱ء کو جامع مسجد بھلوال کے اندر ایک جلسہ ہوا جس میں دو احراری کارکنوں نے جن کے نام حبیب الرحمٰن اور مولوی محمد حیات ہیں، فرقہ احمدیہ کے خلاف زہریلی تقریریں کیں۔ مسٹر

انور علی ڈی، آئی، جی، سی، آئی، ڈی نے ان تقریروں کا معائنہ کرنے کے بعد ۳ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو لکھا
یہ تقریریں صرف خلاف قانون ہی نہیں بلکہ قابل اعتراض بھی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی
کمیٹی مجلس احرار کے کارکنوں نے اپنے اس وعدے کے مطابق شیخ حسام الدین نے مسٹر قربان علی
سے کیا تھا اپنے ضلعی ورکروں کے نام کوئی ہدایات جاری نہیں کیں۔ مسٹر انور علی نے سپرنٹنڈنٹ
پولیس کو ہدایت کی کہ مقامی احرار پارٹی کے لیڈروں کو طلب کر کے انہیں تنبیہ کریں۔ مسٹر قربان علی
خان نے اس کاروائی کی تائید کی اور لکھا کہ

> ''اگر وہ لوگ تنبیہ پر عمل نہ کریں تو ان کے خلاف فوراً قانونی کاروائی کی جائے۔
> ہمارا یہ اقدام اب بالکل حق بجانب ہوگا کیونکہ ان کے لیڈروں کے نام ضروری
> تنبیہات جاری کی جا چکی ہیں اور وہ وعدہ کر چکے ہیں کہ اس قسم کی تقریریں کر کے
> ملک کو تباہ نہ کریں گے''۔

پالیسی اور تدابیر

اس وقت چونکہ مرکزی حکومت کو شدید فرقہ وارا ختلافات اور احمدیوں، ان کے لیڈروں اور
ان کے عقیدوں کے خلاف حملوں کے متعلق کافی اطلاعات پہنچ چکی تھیں اس لئے مرکزی حکومت
خاصی مشوش ہو رہی تھی چنانچہ وزارت داخلہ نے ۷رتمبر ۱۹۵۱ء کو مندرجہ ذیل چٹھی چیف سیکرٹری
حکومت پنجاب کو لکھی:۔

''ایسے واقعات رونما ہو چکے ہیں کہ مختلف مسلمان فرقوں کے افراد نے ایک دوسرے کے
خلاف قابل اعتراض پروپیگنڈا کیا ہے جس سے طرفین کی دل آزاری ہوئی ہے اور انتہائی صورتوں
میں بعض اشخاص کے خلاف تشدد بھی کیا گیا ہے۔ اس قسم کی شورش کا ایک نمونہ وہ ہے جو پنجاب میں
احمدی واحراری نزاع کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ مرکزی حکومت کا خیال ہے کہ بلاشبہ کسی جماعت
اور فرقے کے اس جائز حق پر ناواجب پابندی عائد نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اپنے عقائد مذہبی کی تبلیغ
کرے اور اس معاملے میں مختلف عقائد کے مبلغوں کے درمیان کسی قسم کا فرق و امتیاز ملحوظ نہ ہونا

چاہئے۔ لیکن مذہبی مناظروں اور مناقشوں کو معقول حدود کے اندر محدود رکھنا چاہئے اور انہیں ایسے پہنچنے کی اجازت نہ دینی چاہئے کہ امن وسکونِ عامہ خطرے میں پڑ جائے۔ مرکزی حکومت کی رائے میں جنگجویانہ اور جارحانہ فرقہ آرائی کو سختی سے دبا دینا ضروری ہے۔

مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں کسی ایسے اقدام کے متعلق جو آپ اپنے دائرہ نظم ونسق میں ضروری سمجھیں مرکزی حکومت کے خیالات آپ تک پہنچادوں۔

اس چٹھی کے موصول ہونے پر مسٹر مسٹر انور علی ڈی آئی جی، سی آئی ڈی نے صوبے کی فرقہ وارانہ پوزیشن کے متعلق یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء کو حسب ذیل یادداشت لکھی۔

''احراری شائستگی کے حدود سے تجاوز کر چکے ہیں اور احمدیوں کے خلاف ناپاک حملے کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ احمدیوں کے خلاف تشدد کے لئے اشتعال انگیزی کے بھی ذمہ دار ہیں۔ اوکاڑہ میں احرار کی تقریروں سے جو نفرت پیدا ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک احمدی ہلاک کر دیا گیا۔ اوکاڑہ کے قریب ایک گاؤں میں احمدی مبلغین کو راستے میں روک کر ان کے چہروں پر کالک مل دی گئی۔ راولپنڈی میں بھی ایک احمدی مارا گیا۔ گو اب تک واضح طور پر یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ یہ قتل فرقہ وارانہ تھا۔ سمندری میں احمدیوں کی ایک مسجد آگ لگا کر خاکستر کر دی گئی۔ کوئی تین سال ہوئے ایک نوجوان PAMC ڈاکٹر پر جو احمدی تھا کوئٹہ میں حملہ کیا گیا اور اس کو سنگسار کر دیا گیا۔ تشدد کے ان تمام واقعات کی ذمہ داری احراریوں پر ہے۔

۲۔ شیعہ سنی اختلافات کی اطلاعات بھی صوبے کے مختلف حصوں سے موصول ہوئی ہیں۔ موضع شاہ پور کانجرا میں پہلا واقعہ جس میں شیعہ فرقہ وارانہ تشدد کا شکار ہوئے یہ تھا کہ ایک عورت اور تین سال کا ایک بچہ مارے گئے۔

۳۔ گوجرانوالہ میں اہل سنت اور وہابیوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی۔ اختلاف اس مسئلے پر تھا کہ ماہ رمضان میں تراویح کی کتنی رکعتیں پڑھنی چاہئیں۔

۴۔ فوری مسئلہ یہ ہے کہ احرار کے متعلق کیا کیا جائے ان کو ایک دفعہ تنبیہ کی جا چکی ہے۔

میری تجویز یہ ہے کہ اگر وہ اس تنبیہ پر توجہ نہ کریں تو ان کے خلاف مضبوط اقدام کرنا چاہیے۔ حکومت

مجھ سے خواہش کی گئی ہے کہ میں یہ عرض کروں کہ بہت سے ایسے واقعات حکومت کے علم ئے ہیں جن میں مختلف فرقوں کے مسلمان افراد نے ایک دوسرے کے خلاف قابل اعتراض پروپیگنڈا کیا ہے جس سے ایک دوسرے کی دل آزاری مقصود ہے اور جس کا نتیجہ اکثر شخصی تشدد کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اس کی بین مثالیں شیعہ سنی اختلافات اور احمدی احراری نزاع میں پائی گئی ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ بعض اوقات بعض مقامی افسروں نے بھی ان نزاعات میں جانب داری کا ثبوت دیا ہے مختلف فرقوں کے درمیان ان اختلافات کی وجہ سے صوبے میں اضطراب پیدا ہو رہا ہے اور حکام کے لئے گہری تشویش کا باعث ہے حکومت کا خیال ہے کہ بلاشبہ کسی جماعت اور فرقے کے اس جائز حق پر ناواجب پابندی عائد نہیں ہونی چاہئے کہ وہ اپنے عقائد مذہبی کی تبلیغ کرے اور اس معاملے میں مختلف عقائد کے مبلغوں کے درمیان کسی قسم کا فرق و امتیاز ملحوظ نہ ہونا چاہئے لیکن مذہبی مناقشوں کو معقول حدود کے اندر محدود رکھنا چاہئے اور انہیں ایسے نقطے پر پہنچنے کی اجازے نہ دینی چاہئے کہ امن و سکون عامہ خطرے میں پڑ جائے۔ لہٰذا حکومت ہدایت کرتی ہے کہ جنگجویانہ اور جارحانہ فرقہ آرائی کو ہر حال میں سختی سے دبایا جائے۔

۲۔ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ

(الف) جب کبھی اشتعال انگیز فرقہ وار تقریروں کی وجہ سے فساد کا احتمال ہو یا کوئی ایسا رویہ علم میں آئے جس سے فرقہ وار کشیدگی پیدا ہوتی ہو تو مقامی افسروں کو مضبوط اقدام کرنا چاہئے اس مقصد کے لئے انہیں ان متناعی احکام سے مدد لینی چاہئے جو قانون فوجداری میں مہیا کئے گئے ہیں۔

(ب) اگر یہ معلوم ہو کہ بعض مقامی افسر خود کسی مناقشہ میں شامل ہیں اور تحقیقات سے ثابت ہو جائے کہ انہوں نے فساد انگیزی میں کسی فریق کے ساتھ شرکت کی ہے تو ایسے افسروں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کی جائے۔

(ج) اضلاع کے افسروں کو چاہئے کہ مذہبی جنون کے خلاف اور مذہبی رواداری کے حق میں جو اسلام نے سکھائی ہے تبلیغ و ہدایت کرنے میں مقامی انجمنوں کی تائید اور ان کا تعاون حاصل کریں۔

اس چٹھی کی تاریخ سے پندرہ دن کے اندر اندر سپرنٹنڈنٹ پولیس لائل پور نے اپنے لاسلکی پیام مؤرخہ ۱۸رنومبر ۱۹۵۱ء میں اطلاع دی کہ لائل پور میں احمدیوں نے سیرت النبی کا جلسہ کیا۔ جس کو احراریوں نے درہم برہم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فریقوں میں فساد ہو گیا اور فریقین کے کئی آدمی زخمی ہو گئے۔

64

بخاری کی مزید تقریریں

احراریوں کی ایک کانفرنس میں جس کا نام ''صوبہ کانفرنس'' یا ''ختم نبوت کانفرنس'' یا ''دفاع کانفرنس'' تھا اس کے متعلق اعلان کیا گیا کہ ۲۴رنومبر ۱۹۵۱ء کو اوکاڑہ ضلع منٹگمری میں ہوگی۔ مقامی پولیس افسروں نے تجویز کیا کہ یہ جلسہ ممنوع قرار دیا جائے چیف منسٹر نے یہ تجویز منظور کر لی۔ لیکن اسی اثناء میں ڈپٹی کمشنر مسٹر چیمہ نے احرار سے ایک تصفیہ کر لیا اور نہ صرف انہیں جلسے کے انعقاد کی اجازت دے دی بلکہ خود اس کی صدارت کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر چیمہ نے اصرار کیا کہ اس کانفرنس کے انعقاد کی اجازت دے دی جائے چنانچہ حکومت نے بھی ان سے اتفاق کر لیا لیکن مقامی پولیس افسروں کے اندیشے صحیح ثابت ہوئے کیونکہ ایک اجلاس میں جو مسٹر چیمہ کی صدارت میں ہو رہا تھا قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے یہ کہہ دیا کہ قائد ملت کے قتل میں (جو گزشتہ اکتوبر میں ہوا تھا) احمدیوں کا ہاتھ تھا، اس سے اگلے دن مسٹر فیض محمد خان ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی جلسے میں شامل ہو کر ایک مختصر تقریر کی۔ عطاء اللہ شاہ بخاری نے حسب عادت ایک طول طویل تقریر کی جس میں اس نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کے اس بیان کا ذکر کیا کہ پاکستان کے قائم ہونے کے بعد بھی ملک کو اکھنڈ بنانے کی کوشش کی جائے گی اور ساتھ ہی کہا کہ یہ کوشش غداری ہے اور ایک غدار ایک کروڑ خنزیروں سے بدتر ہے۔

مسٹر چیمہ کے عمل کو مثال بنا کر کمشنر مظفر گڑھ بھی ۲۸۔۲۹ نومبر ۱۹۵۱ء کو مظفر گڑھ کی ایک دفاع کانفرنس میں شریک ہوئے اور ڈپٹی کمشنر گجرات نے بھی درخواست کی کہ انہیں اپنے ضلع میں ایک ایسے ہی جلسے کی صدارت کی اجازت دی جائے لیکن یہ درخواست نامنظور کر دی گئی۔ مسٹر چیمہ

کے عمل کو بھی حکومت نے پسندیدہ قرار نہ دیا اور اس مسئلہ پر ان کے اور حکومت کے درمیان طویل خط و کتابت جاری رہی۔

۲۲رنومبر ۱۹۵۱ء کو مسٹر بشیر احمد امیر جماعت احمدیہ لاہور نے چیف سیکرٹری کو ایک چھٹی لکھی جس میں شکایت کی کہ گزشتہ ماہ ستمبر میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور میں ایک انتہائی شعلہ بار تقریر کی ہے۔ اس چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ ملتان اور لاہور میں احمدی جماعت نے سیرت النبی کے دو جلسے منعقد کئے جن میں تمام فریقوں کے خطیبوں کو دعوت دی کہ آ کر پیغمبر خدا صلعم کی حیات طیبہ پر تقریریں کریں لیکن ان جلسوں میں رکاوٹ پیدا کی گئی۔ مسٹر بشیر احمد نے یہ بھی لکھا کہ مذہبی عدم رواداری قائد ملت کے قتل کی شکل میں بھی ظاہر ہو چکی ہے اور شیعہ سنی تصادم اور عیسائیوں پر حملے کے واقعات بھی اسی جذبے کی پیداوار ہیں۔ اگر اس کو روکا نہ گیا تو ناگوار واقعات اتنی وسعت اختیار کر لیں گے کہ کارکنانِ حکومت کے لئے مستقل دردسر کا باعث ہو جائیں گے۔ مملکت کی رعایا کے ہر فرد کو اپنے مذہب کے اعلان اور اس کی تبلیغ کی آزادی ہونی چاہئے۔ حکومت سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس معاملے میں ایک قطعی اور واضح پالیسی وضع کرے اور پھر اس پر عمل بھی کرے۔ مسٹر بشیر احمد نے شکایت کی کہ یا تو حکومت اس مسئلے کے متعلق کوئی پالیسی ہی نہیں رکھتی یا اس پالیسی کے چلانے کے ذمہ دار حکام سنجیدگی سے عمل نہیں کرتے۔ اس لئے حکومت کو چاہئے کہ اس تمام پوزیشن پر نہایت تحقیق کے ساتھ غور کرے۔

چیف سیکرٹری نے اس درخواست پر مسٹر قربان علی خان انسپکٹر جنرل پولیس کی رائے دریافت کی۔ جس پر خان صاحب نے ایک مختصر لیکن واضح نوٹ لکھا اور بیان کیا کہ مجھے مسٹر بشیر احمد کی عرضداشت کے ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ بلا امتیاز عقیدہ مذہبی ہر شخص کو دوسروں کے جارحانہ عمل سے محفوظ رکھے اور یہ مقصد صرف اس طریق سے حاصل ہو سکتا ہے کہ ایک مضبوط پالیسی کا فیصلہ کیا جائے۔ اضلاع کے افسروں کے نام واضح ہدایات صادر کی جائیں اور جس قدر جلد یہ تدبیر اختیار کی جائے اسی قدر حکام و عوام دونوں کے لئے بہتر ہوگا۔

انہی دنوں میں سپرنٹنڈنٹ پولیس مظفر گڑھ نے اپنی ہفتہ وار خفیہ ڈائری (بابت ہفتہ

مختتمہ ۲۷/اکتوبر ۱۹۵۱ء) میں ایک اور واقعہ کی اطلاع دی۔ اطلاع یہ تھی کہ ۲۱/اکتوبر ۱۹۵۱ء کو علی پور میں زیر اہتمام جماعت احرار ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں واحد مقرر سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ بخاری نے اپنی تقریر میں کہا کہ مرزائیوں نے تقسیم کو رضامندی سے قبول نہیں کیا۔ وہ ایک دفعہ پھر بھارت سے متحد ہونے کی توقع رکھتے ہیں۔ یہ پاکستان کے غدار ہیں اور بھارت کے جاسوسوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مرزائی جاسوس لاہور میں پکڑا گیا ہے جو ایک ہندوستانی جاسوس گوپال داس سے ساز باز کر رہا تھا۔ مسٹر خدا بخش ایس پی (بی) نے اس اطلاع کو پڑھ کر ڈی آئی جی کے پاس بھیج دیا اور لکھا کہ جو تنبیہ ایک دفعہ صدر مجلس احرار ماسٹر تاج الدین انصاری کو اور پھر مولوی مظہر علی اظہر جنرل سیکرٹری کو کی گئی تھی اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ڈی آئی جی مسٹر انور علی نے ۷/نومبر ۱۹۵۱ء کو ایک لمبی یادداشت لکھی جس میں ان تمام تنبیہات کا ذکر کیا جو گورنر صاحب چیف سیکرٹری مشیر برائے قانون اور انسپکٹر جنرل پولیس نے احراری لیڈروں کو (بشمول شیخ حسام الدین) کی تھیں پھر ان غیر ذمہ دارانہ تقریروں کا حوالہ دیا۔ جو احرار نے اوکاڑہ میں کی تھیں جن کے نتیجے میں بعض احمدی مبلغین کے چہروں پر کالک مل دی گئی تھی اور ایک احمدی ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ذیل کی تجاویز بھی پیش کیں:۔

(۱) ایک یا دو احراری لیڈروں کو جو مختلف جماعتوں کے درمیان نفرت پیدا کرتے رہے ہیں زبان بندی کا حکم دیا جائے اور انہیں عام جلسوں میں تقریر کرنے سے روک دیا جائے۔

(۲) متبادل تجویز یہ ہے کہ ایسے اشخاص کو ان کے اپنے دیہات میں پابند مسکن کر دیا جائے۔ وہ حکومت کی اجازت حاصل کئے بغیر کہیں باہر نہ جا سکیں۔

(۳) ان پر قوموں کے درمیان منافرت انگیزی کے الزام میں زیر دفعہ ۱۵۳۔الف مقدمات چلائے جائیں۔

آخر میں مسٹر انور علی نے بتا دیا کہ جب تک کوئی شدید اقدام نہ کیا جائے گا احراری لیڈر کسی شریفانہ سلوک سے متاثر نہ ہوں گے جب یہ کیس مسٹر قربان علی خاں کے پاس پہنچا تو انہوں نے ۱۴/نومبر ۱۹۵۱ء کو ساری صورتحال کا احتیاط سے جائزہ لیا اور لکھا کہ احرار نے اتنا کچھ کیا ہے کہ اب

67

ان کے خلاف شدید اقدام بالکل حق بجانب ہوگا۔ میں نے شیخ حسام الدین کو جو تنبیہ کی تھی اس کا کوئی اثر احرار پر نہیں ہوا۔ اب واضح ہے کہ تنبیہ بالکل بیکار ہے اور اگر احرار بحیثیت جماعت کچھ مدت تک احمدیوں کو گالیاں دینے سے محترز بھی رہیں تو بخاری ہرگز باز نہ آئے گا کیونکہ اس کا تو اس کے سوا اور کوئی وصف ہی نہیں کہ وہ احمدیوں کو گالیاں دیتا ہے اور ضدی اور ہٹیلا آدمی ہے۔ انہوں نے اپنا خیال حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا:۔

لہٰذا جب تک بخاری کو عام جلسوں میں شرکت سے منع نہ کر دیا جائے یا اسے کوئی اور شخص نہ بتا دیا جائے جسے وہ برسر عام گالیاں دے کر اپنا شوق پورا کرے۔ وہ ہرگز احمدیوں کے خلاف اپنے معمول کو ترک نہ کرے گا بلکہ اس سے بھی بدتر رویہ اختیار کرے گا۔ اگر اس کو عام جلسوں میں شامل ہونے اور تقریر کرنے سے روک دیا گیا تو وہ اور اس کے رفقا کوئی نہ کوئی نیا پلیٹ فارم پیدا کر کے پھر زندہ ہو جائیں گے۔ اگر اسے گرفتار کر لیا گیا تو اس کی جماعت خواہ وہ آخری دموں ہی پر ہو ایک نئی روح حیات حاصل کر لے گی۔ ارباب سیاست کو فی الحقیقت اب یہ اندازہ کرنا چاہئے کہ ان دونوں میں سے کم درجے کی خرابی کونسی ہے آیا احرار کے خلاف مضبوط اقدام کر کے ان کی ایجی ٹیشن کا سامنے کرنا بہتر ہوگا یا انہیں احمدیوں کے خلاف نفرت انگیز خطرناک اور مکروہ پروپیگنڈا جاری رکھنے کی کھلی چھٹی دی دینی چاہئے۔ ذاتی طور پر میں اول الذکر طرز عمل اختیار کروں گا۔ اس سے نہ صرف احرار کا فتنہ رک جائے گا بلکہ قوم میں روادارانہ کردار پیدا کرنے میں بہت بڑی مدد ملے گی۔

یہ کیس چیف سیکرٹری کے پاس گیا تو انہوں نے اس کو چیف منسٹر کی خدمت میں بھیج دیا اور گزارش کی کہ انسپکٹر جنرل اور ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو طلب کیجئے اور میری موجودگی میں ان کے معروضات سن کر خود گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور جب تک یہ گفتگو نہ ہو جائے کسی کاروائی کی ضرورت نہیں۔

۳۰ رنومبر ۱۹۵۱ء کو احمدیوں کا ایک وفد مسٹر بشیر احمد کی درخواست کے سلسلے میں چیف سیکرٹری سے ملا۔ مسٹر ایس عالمگیر نے جو اس ملاقات کے وقت موجود تھے اس ملاقات کے واقعات کی ایک یادداشت تیار کی اور یکم دسمبر ۱۹۵۱ء کو چیف سیکرٹری کے پاس بھیج دی۔ آپ نے لکھا کہ احرار احمدی نزاع روز بروز بڑھتا جاتا ہے اور اس میں مزید اضافہ ہونے کا احتمال ہے۔ لہٰذا حکومت کے لئے

رویہ اختیار کرنے میں ناکام رہے یا فریقین متعلقہ کی حرکات کے جواز یا عدم جواز کا جائزہ ٹھنڈے دل سے نہیں لے سکے۔ اگر دونوں جماعتوں کے ساتھ کسی فرق و امتیاز کے بغیر مضبوط اور منصفانہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ دو مسلمان فرقوں کی باہمی گالی گلوچ کا یہ روز افزوں خطرہ مناسب حد تک قابو میں نہ لایا جاسکے''۔

جماعت احمدیہ سیالکوٹ ۱۶، ۱۷ر فروری ۱۹۵۲ء کو اپنی گراؤنڈ میں ایک تبلیغی کانفرنس منعقد کرنا چاہتی تھی لیکن احراریوں نے انتہائی کوشش کی کہ کسی نہ کسی طریقے سے یہ جلسہ ممنوع قرار دے دیا جائے، جب انہیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو وہ ایک بہت بڑے ہجوم کے ساتھ جلسہ گاہ کو روانہ ہوئے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے ''بناسپتی نبی مردہ باد'' ''مرزائیوں کا جلسہ بند کرو''، ''کفر کا جلسہ بند کرو'' اور پولیس کے حلقے کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چونکہ ڈپٹی کمشنر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو پہلے سے اس کشمکش کی اطلاع مل چکی تھی، اس لئے وہ موقع پر پہنچ گئے اور احراری اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہوسکے۔ آخر جب جلسے کے بعد احمدی اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے تو احراریوں نے ان پر پتھر پھینک کر اپنے دل کا بخار نکالا۔ اس ہنگامے میں دو پیادہ کانسٹیبل زخمی ہوئے۔

احراریوں نے ۲۴، ۲۵ر مارچ ۱۹۵۲ء کو سرگودھا میں استحکام پاکستان احرار کانفرنس منعقد کی چونکہ اس کانفرنس کے واقعات مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے درمیان حکام اضلاع اور صوبائی حکومت کے درمیان اور احمدیوں کے ایک وفد اور حکومت پنجاب کے درمیان مکاتبت اور مکالمت کا موضوع بنے رہے اور اس قسم کے واقعات کے اعادے کو روکنے کے لئے بھی بعض فیصلے کئے گئے اس لئے اس کا تفصیلی تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے اس کانفرنس سے متعلق واقعات کی پوری کیفیت میمورنڈم نمبر 385-87C مؤرخہ ۲۸ر مارچ ۱۹۵۲ء میں موجود ہے جو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ڈی آئی جی سی آئی ڈی پنجاب کو بھیجا تھا۔ وَھُوَ ھٰذَا۔

''سرگودھا کے احرار نے ۲۴، ۲۵ر مارچ کو سرگودھا میں ''استحکام پاکستان احرار کانفرنس'' کے

مشتہرہ نام سے ایک کانفرنس منعقد کی۔ یہ کانفرنس مولوی محمد عبداللہ احراری تاجر کتب سرگودھا کی تنظیمی کوششوں سے ہوئی۔ اس جلسے کے ممتاز مقررین مولوی عبدالرحمٰن میانوی، مولوی محمد علی جالندھری اور سید عطا اللہ شاہ بخاری تھے، مولوی محمد علی جالندھری نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ مرزائی زندیق ہیں اور شرع اسلامی کی رو سے زندیق واجب القتل ہیں۔ ایک اور مقرر چوہدری محمد شریف بہاول نگری نے اپنی تقریر میں کہا کہ مسلمان کو نمازی بھی ہونا چاہئے اور غازی بھی۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری نے اپنی تقریر کے دوران میں یہ کہا کہ سر ظفر اللہ خان جان بوجھ کر کشمیر کے مسئلے کو لاینحل چھوڑ رہا ہے اور پاکستان اور افغانستان کے درمیان تلخی اور منافرت کو بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری نے حاضرین کو یہ مشورہ بھی دیا کہ ایک جلوس نکالو جس میں سر ظفر اللہ خان کی موقوفی کا مطالبہ کرو۔ اس کے بعد حاضرین سے یہ نعرے لگوائے۔

مرزائیت مردہ باد، سر ظفر اللہ مردہ باد، مرزا بشیر احمد مردہ باد

۲۔ دوسری قراردادوں کے علاوہ اس کانفرنس میں ایک یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ مرزائی قوم کو ایک علیحدہ اقلیت والی قوم قرار دیا جائے اور مرزائی سرکاری ملازموں کو تمام کلیدی اسامیوں سے موقوف کیا جائے۔ کیونکہ مرزائی ملازمان حکومت اپنے خلیفہ کی ہدایات کے ماتحت اپنی ایک علیحدہ تنظیم قائم کر رہے ہیں اور مرزائیت ملک کے لئے خطرناک ثابت ہو رہی ہے۔

۳۔ استحکام پاکستان احرار کانفرنس ۲۴، ۲۵ مارچ کو میونسپل گارڈنز میں منعقد ہوئی اور اس کے حاضرین کی تعداد دونوں دنوں کی نشستوں میں ایک ہزار سے دو ہزار کے درمیان رہی۔

۴۔ میں نے ۲۴، ۲۵ مارچ دونوں دنوں پر پولیس کے انتظامات کر رکھے تھے کیونکہ نقص امن کا خطرہ تھا اور مقامی احمدیوں نے اس مقصد کے لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو عرضداشت بھی بھیجی تھی۔

۵۔ سرگودھا کے احراریوں نے آج نماز جمعہ کے بعد ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا اور یہ فیصلہ سید عطا اللہ شاہ بخاری اور مولانا محمد عبداللہ احراری کے ایما پر کیا گیا تھا، جو مرزائیت کے خلاف سر ظفر اللہ خاں کے خلاف اور خلیفہ قادیان کے خلاف نعرے لگوانا چاہتے تھے۔ مجھے اس فیصلے کی اطلاع اس وقت ہوئی جب میں اپنے دورے سے دوپہر کے وقت واپس آیا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے

بھی ٹیلی فون پر مجھ سے کہا کہ شہر میں پولیس کے مناسب انتظامات کر دیئے جائیں۔ میں نے فورا اپنے جوانوں کو جمع کیا اور ڈیڑھ بجے بعد دوپہر شہر میں چلا گیا۔ خان عبدالہادی خان ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق وہاں پہنچ گئے۔ جب میں اور میرے رفقا گول چوک مسجد پہنچے تو کچہری بازار سے احرار کا ایک جلوس آرہا تھا جس کی رہنمائی مولوی محمد عبداللہ احراری، مولوی صالح محمد معلم سراج العلوم اور عبدالرشید اشک (ایک مقامی اخبار 'شعلہ' کا ایڈیٹر) کر رہے تھے یہ اشخاص جامع مسجد سے نماز پڑھ کر آئے تھے شرکائے جلوس کی تعداد تخمینا دوسو تھی میں نے مولوی محمد عبداللہ احرار، مولوی صالح محمد اور عبدالرشید اشک سے کہا کہ وہ جلوس کی رہنمائی نہ کریں کیونکہ اس جلوس سے مختلف جماعتوں کے درمیان منافرت پیدا ہونے اور امن عامہ کے خلل پذیر ہونے کا احتمال ہے لیکن انہوں نے میرے مشورے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ جلوس نکالنے پر مصر رہے اور کہنے لگے کہ سر ظفر اللہ خان، مرزائیت اور احمدیوں کے امام کے خلاف احتجاج کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے۔ میری صلاح اور ترغیب کے باوجود ان تین اشخاص نے اپنے پیروؤں سے کہا کہ سر ظفر اللہ مردہ باد، مرزا بشیر احمد مردہ باد اور مرزائیت مردہ باد کے نعرے لگائیں، چنانچہ ان تمام پیروؤں نے زور وشور سے یہ نعرے لگائے ان میں سے بعض اچھل کود رہے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے یہ جلوس جس قدر آگے بڑھتا گیا اس کے شرکا میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ یہ جلوس بلاک نمبر ۹ اور بانسانوالہ بازار سے گزرتا ہوا پھر کچہری بازار واپس آ گیا۔ جہاں سے ایک اور جلوس اس میں شامل ہو گیا جو تعداد نفوس کے اعتبار سے اتنا ہی بڑا تھا، پھر یہ پورا جلوس مولوی محمد عبداللہ احراری اور عبدالرشید اشک کے ایما پر میونسپل گارڈنز کی طرف چل دیا۔ عبدالرشید اشک نے گول چوک میں جلوس سے خطاب کیا، اور کہا کہ منتشر نہ ہوں اور بے خوف ہو کر اپنے موجودہ راستے پر چلیں، شرکائے جلوس ظفر اللہ خان اور مرزائیت کے خلاف بڑے جوش وخروش سے نعرے لگا رہے تھے اور ایک وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قانون وانتظام کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ جمعہ کی وجہ سے تمام دکانیں بند تھیں اور احراری لیڈروں نے دانستہ ایک چھٹی کا دن اپنے جلوس کے لئے منتخب کیا تھا۔ جب یہ جلوس کچہری بازار کے چوک میں پہنچا تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی اس کو دیکھا۔ احراریوں کا

یہ جلوس ڈیڑھ بجے دوپہر چلا اور ڈھائی بجے تک جاری رہا۔ جب جلوس میونسپل گارڈن پہنچا تو اس نے ایک جلسہ عام کی صورت اختیار کر لی اور مولوی محمد عبداللہ احراری اور عبدالرشید اشک نے یکے بعد دیگرے اس جلسے سے خطاب کیا۔ اس موقع پر حاضرین کی تعداد پانچ سو سے کم نہ تھی۔ دونوں مقرروں نے سر ظفر اللہ خان، مرزا بشیر احمد اور مرزائیت کے خلاف اس کامیاب جلوس کے نکالنے پر حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد پھر وہی نعرے لگائے گئے۔ سر ظفر اللہ مردہ باد، مرزا بشیر احمد مردہ باد اور مرزائیت مردہ باد۔ اس کے بعد حاضرین منتشر ہونے لگے۔

۶۔ مولوی محمد عبداللہ احراری، مولوی صالح محمد اور عبدالرشید اشک کے ساتھ ساتھ ذیل کے اشخاص بھی جلوس کے نہایت سرگرم ممبر تھے وہ جلوس کے آگے آگے چل رہے تھے اور ظفر اللہ اور مرزائیت کے خلاف نعروں کی رہنمائی کر رہے تھے۔

(۱) عبدالحمید ولد محمد عمر ارائیں ساکن بلاک نمبر ۱۱، سرگودھا شہر

(۲) بہا اللہ ولد عطا اللہ کشمیری ساکن بلاک نمبر ۱۹، سرگودھا شہر

(۳) اللہ رحم ولد اللہ ماہی چنگڑ چوب فروش بلاک نمبر ۱۷، سرگودھا شہر

(۴) مجید ولد اللہ بخش گجراتی درزی، بلاک نمبر ۳، سرگودھا شہر

(۵) یونس ولد عبدالرحمٰن ارائیں ساکن بلاک نمبر ۳، سرگودھا شہر

(۶) احسان احمد دکاندار بلاک نمبر ۶، سرگودھا شہر

۷۔ اس میں شک نہیں کہ احراری لیڈر اور کارکن ہماری مملکت اسلامی اور اس کے امن و امان کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور احمدیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کا ظاہری مقصد تو احمدیوں، ان کے خلیفہ اور سر ظفر اللہ خان کو بدنام کرنا ہے لیکن ان کا اندرونی مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک میں بدنظمی اور لاقانونی پیدا کریں۔ احراری لیڈروں نے مسجدوں کی خاصی تعداد پر قبضہ کر رکھا ہے اور وہ اماموں اور خطیبوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کے سرغنہ عام طور پر پس پردہ رہتے ہیں اور دوسروں کو مذہب اور ہمارے نبی کریمؐ کے نام پر احمدیوں کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ ان کے لیڈروں میں ایم مولوی محمد شفیع احراری بھی ہے جو سرگودھا

کی جامع مسجد کا خطیب ہے احتمال اس امر کا ہے کہ بعض سادہ لوح مسلمان ان کے نعروں اوران کی تقریروں سے طیش میں آ کر سرگودھا شہر اوراس کے نواح میں جہاں احمدی قلیل تعداد میں آباد ہیں، احمدیوں پر حملے کرنے لگیں اوراس کا نتیجہ یہ ہو کہ بعض بیگناہ احمدی قتل کر دیئے جائیں۔ میں نے آج شہر میں مسلح دستے گشت پر مقرر کر دیئے ہیں لیکن تمام احمدیوں اوران کے مکانوں کی حفاظت کرنا ممکن نہیں ہے۔

۸۔ سب انسپکٹر سرگودھا شہر نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ سرگودھا شہر کے مقامی احراری لیڈر جن کے سرغنہ مولوی محمد عبداللہ، مولوی صالح اور عبدالرشید اشک ہیں فیصلہ کر چکے ہیں کہ احمدیت، سرظفر اللہ خان اور احمدیوں کے امام کو ذلیل کرنے کی غرض سے ایسے جلوس بار بار نکالیں اوراس طریق سے لوگوں پر یہ اثر ڈالیں کہ یہ لوگ واقعی بہت برے ہیں اوران کا مذہب نفرت انگیز ہے۔ اس قسم کے جلوسوں اوران لوگوں کی مضر سرگرمیوں کو روکنے کے لئے یہ لازم ہے کہ ان کے خلاف سخت اقدامات کئے جائیں ورنہ سلامتی عامہ اور نظم وقانون سخت خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اور نہ صرف سرگودھا شہر میں بلکہ پورے ضلع میں لاقانونی کا دوردورہ ہو جائے گا۔ چونکہ ان لوگوں کو ایک اور جلوس نکالنے میں غالباً چند روز لگ جائینگے اس لئے میرا خیال ہے کہ ان کے خلاف کوئی کاروائی کرنے سے پہلے میں حکومت سے احکام حاصل کرلوں۔ غالباً اگر اس اثنا میں انہوں نے ایک اور جلوس نکال لیا تو میں حکومت کے احکام کا انتظار کئے بغیر ان کے خلاف فوری اقدام کروں گا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس امر میں مجھ سے اتفاق کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے خلاف مضبوط اقدام کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان کی مضر سرگرمیوں کو روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔

۹۔ اگر حکومت اس امر کو پسند کرے تو میرا ارادہ یہ ہے کہ میں پندرہ روز کے لئے مولوی محمد عبداللہ احراری مولوی صالح محمد معلم سراج العلوم اور عبدالرشید اشک کو زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ ۱۹۴۹ء زیر حراست لے لوں۔ اس پندرہ دن کے دوران میں اس امر پر غور کرلیا جائے گا کہ آیا حکومت ان کو مزید مدت تک زیر حراست رکھے یا چھوڑے یہ تینوں اشخاص کچھ زیادہ ذی اثر تو نہیں ہے لیکن کافی شرارت پیشہ ہیں اوراشتعال انگیز تقریریں کر سکتے ہیں۔

۱۰۔مندرجہ ذیل اشخاص کے خلاف جنہوں نے جلوس میں بہت نمایاں اور سرگرم حصہ لیا ہے میری تجویز یہ ہے کہ زیر دفعات 107/105 ضابطہ فوجداری قیام امن کے لئے کاروائی کروں۔ یہ مندرجہ بالا تین احراری لیڈروں کے پر جوش پیرو ہیں اور ان سے احتمال ہے کہ احمدیوں کو حملے اور توہین کا نشانہ بنا کر امن عامہ میں خلل انداز ہوں گے:۔

(۱) عبدالحمید ولد محمد عمر ارائیں ساکن بلاک نمبر ۱۱، سرگودھا شہر

(۲) بہا اللہ ولد عطا اللہ کشمیری ساکن بلاک نمبر ۱۹، سرگودھا شہر

(۳) اللہ رحم ولد اللہ ماہی چنگڑ چوب فروش بلاک نمبر ۱۷، سرگودھا شہر

(۴) مجید ولد اللہ بخش گجراتی درزی، بلاک نمبر ۳، سرگودھا شہر

(۵) یونس ولد عبدالرحمٰن ارائیں ساکن بلاک نمبر ۳، سرگودھا شہر

(۶) احسان احمد دکاندار بلاک نمبر ۶، سرگودھا شہر

۱۱۔اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ شرکائے جلوس نے مرزائیت کے خلاف نعرے لگانے کے ساتھ مسلم لیگ زندہ باد کے نعرے بھی لگائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ زندہ باد کا نعرہ جان بوجھ کر لگایا۔ تاکہ مقامی مسلم لیگی کارکنوں کی ہمدردی کو نہ کھودیں۔ احراریوں نے اپنی استحکام پاکستان احرار کانفرنس میں جو ۲۴، ۲۵ مارچ کو سرگودھا میں منعقد ہوئی میاں محمد سعید قریشی صدر ضلع مسلم لیگ کو دعوت دی کہ وہ ان کے ایک اور اجلاس کی صدارت کریں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ دھوکے کی ٹٹی خاص مقصد کے لئے کھڑی کی تھی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ احراری اسی قسم کی کانفرنسیں صوبے بھر میں منعقد کر رہے ہیں اور صوبے بھر ہی میں مرزائیت اور ظفر اللہ خان کے خلاف جلوس نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ نہایت سوچی سمجھی ہوئی مہم ہے اگر اس کو ابتداء ہی میں ناکام نہ کر دیا گیا تو بدگوئی کی اس مہم کا نتیجہ لامحالہ لاقانونی کی صورت میں برآمد ہوگا۔

۱۲۔ پنجاب سی آئی ڈی کے ایک اردو سینوگرافر نے ۲۴، ۲۵ مارچ کی سرگودھا احرار کانفرنس کی کاروائی قلمبند کی تھی جو غالباً اب تک وہ اپنے افسروں کی خدمت میں پیش کر چکا ہوگا۔

جب یہ رپورٹ مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو موصول ہوئی تو انہوں نے اس پر

75

مندرجہ ذیل یادداشت لکھی:-

انسپکٹر جنرل صاحب سرگودھا کی اس تشویش انگیز اطلاع کو ملاحظہ فرمائیں۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کل صبح مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دی تھی جو میں نے مختصر طور پر انسپکٹر جنرل صاحب تک پہنچادی تھی۔

۲۔ احراریوں کا طرزِ عمل انتہائی شرانگیز ہے اور انہوں نے جان بوجھ کر یہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے تاکہ احمدیوں کے خون سے کھیل کر ارزاں ہردلعزیزی حاصل کریں۔ یہ کہنا کہ احمدی زندیق ہیں لہٰذا مستوجب قتل ہیں اور مسلمانوں کو صرف نمازی ہی نہیں بلکہ غازی بھی بننا چاہیے، اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں رکھتا کہ احمدیوں کو تہ تیغ کر دیا جائے۔

۳۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے اقتدار کو کھلم کھلا چیلنج کرنا اور ظفر اللہ خان مردہ باد، جیسے نعرے لگانا نہایت افسوس ناک ہے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی تجویز یہ ہے کہ وہ مولوی محمد عبداللہ، مولوی صالح محمد اور عبدالرشید اشک کے خلاف زیر دفعہ ۳ پبلک سیفٹی ایکٹ اور دوسرے چھ اشخاص کے خلاف زیر دفعہ 107/151 ضابطہ فوجداری کارروائی کرینگے۔ لیکن اقدام سے پہلے انہوں نے حکومت سے مشورہ طلب کیا ہے عبدالرشید اشک ایک دفعہ پہلے بھی پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت گرفتار کیا جاچکا ہے کیونکہ وہ سابق کانگری ہے اور اس پر مخالف پاکستان سرگرمیوں میں مصروف ہونے کا شبہ کیا گیا تھا۔ مولوی محمد عبداللہ حکومت کی مخالفت میں رسوائے عالم ہے۔

۴۔ میں کچھ مدت سے اس امر کی حمایت کر رہا ہوں کہ احراریوں کے خلاف خصوصاً ان کی فرقہ وارانہ سرگرمیوں کی بنا پر سخت کارروائی کرنی چاہیے۔ وہ احمدیوں کے خلاف متشدد تقریریں کرتے رہیں گے اور ان کی ایسی ہی تقریروں کا یہ نتیجہ ہے کہ اوکاڑہ اور کوئٹہ میں احمدی ہلاک کر دیئے گئے۔ اگر پاکستان کو ایک جمہوری اور ترقی پسند مملکت کی حیثیت سے ترقی کرنا ہے تو فرقہ وار سرگرمیوں کو سختی سے دبانا ضروری ہے ورنہ پاکستان ازمنہ وسطیٰ کی ایک رجعت پسند مملکت بن کر رہ جائے گا۔

۵۔ مولوی محمد عبداللہ، عطاء اللہ شاہ بخاری اور محمد علی جالندھری سب کے متعلق سیاسی ریکارڈ موجود ہے اس وقت دفتر بند ہے اس لئے میں اس ریکارڈ کو شاملِ مسل نہیں کر سکا چونکہ کیس بہت

77

مارچ کے تسلسل میں ذیل کی ایک اور یادداشت ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو ارسال کی:۔

۲۔ میں نے ۲/اپریل کو مولوی عبداللہ احراری، مولوی جلیل الرحمٰن خطیب مسجد گول چوک اور مولوی سمیع اللہ ولد مولوی محمد شفیع خطیب جامع مسجد سرگودھا کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور ان سے طویل گفتگو کی۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ وہ احمدیوں کے خلاف شہر میں کوئی جلوس نہ نکالیں کیونکہ احمدیت اور ظفر اللہ اور مرزا محمود احمد کے خلاف نعرے لگا کر نہ تو وہ اپنے مذہب کو بہتر بنا سکتے ہیں نہ فرقہ احمدیہ کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں بلکہ اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ امن عامہ خلل پذیر ہو جائے اور ہمارا ملک اور ہماری حکومت دنیا کے دوسرے ملکوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا ہو جائے۔

۳۔ اس امر کا اندیشہ تھا کہ شاید آج بھی بعد نماز جمعہ احراری لوگ احمدیوں کے خلاف جلوس نکالیں گے۔ اس لئے میں نے شہر میں پولیس کی گشت کے انتظامات معقول پیمانے پر کر رکھے تھے۔ میں خود بھی کافی مسلح پولیس کے ساتھ شہر میں گیا اور ہم پولیس کی گاڑیوں میں بڑے بڑے بازاروں کا چکر لگاتے رہے خان عبدالہادی خان ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ہدایت کے مطابق میرے ساتھ تھے۔ احراریوں نے آج کوئی جلوس نہ نکالا۔

۴۔ اگر احراری کارکن اور ان کے حمایتی پر امن رہیں گے اور احمدیوں کے خلاف مزید جلوس نہ نکالیں گے تو میں ان کے خلاف سیکیورٹی کی دفعات یا کسی دوسرے قانون کے ماتحت کارروائی کرنا فی الحال ملتوی کر دوں گا لیکن بہر حال صورت حال پر نگاہ رکھوں گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ مؤرخہ ۲۸/مارچ ۱۹۵۲ء کو جو کانفرنس کی کارروائی پر مشتمل تھی، چیف منسٹر صاحب بھی ۳/اپریل سے پہلے کسی وقت ملاحظہ کر چکے تھے۔ اس وقت مسٹر انور علی نے فائل پر حسب ذیل یادداشت لکھی:۔

> ”سرگودھا کانفرنس میں جو تقریریں کی گئیں ان کو سی آئی ڈی کے ایک سٹینوگرافر نے قلمبند کیا تھا۔ پراسیکیوٹنگ برانچ نے ان کا جائزہ لیا ہے اور یہ رائے دی ہے کہ ان کی بنا پر مقدمات دائر نہیں کئے جا سکتے تاہم وہ قابل اعتراض ضرور ہیں کیونکہ ان سے احمدیوں کے خلاف منافرت انگیزی مقصود ہے“۔

78

پراسیکیوٹنگ برانچ کی ایک ہی رائے فائل پر موجود ہے، جو پی آئی نے ۲/اپریل ۱۹۵۲ء کو دی تھی یہ امر بالکل واضح نہیں کہ بعد میں پراسیکیوٹنگ برانچ نے کس طرح اور کس وقت ایک متضاد رائے دے دی۔ بہرحال مسٹر انور علی نے لکھا کہ اگر حکومت مناسب سمجھے تو صوبے کے تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو یہ ہدایت کی جاسکتی ہے کہ وہ چوکنے رہیں اور اگر گڑبڑ کا اندیشہ ہو تو احراریوں کی کانفرنسوں کو ممنوع قرار دے دیں۔ اس پر ہوم سکرٹری نے لکھا تھا کہ ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے احرار کانفرنسوں کو ممنوع قرار دینے کے متعلق جو تجویز کی ہے اس پر علیحدہ کاروائی کی جارہی ہے۔

۷/اپریل ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی نے کیس پر یادداشت لکھی کہ چیف منسٹر صاحب سرگودھا جارہے ہیں جب وہ واپس آئیں تو سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کہا جائے کہ تمام متعلقہ کاغذات ساتھ لے کر لاہور آجائے۔ اس وقت اس معاملے پر غور کرنے کے بعد حکومت کی خدمت میں تجویز بھیجی جائے گی۔

۶/مئی ۱۹۵۲ء کو ملک حبیب اللہ سپرنٹنڈنٹ پولیس (B) نے لکھا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سرگودھا غالباً ۲۱ یا ۲۲/اپریل کو ڈی آئی جی سی آئی ڈی اور انسپکٹر جنرل سے مل چکے ہیں اور تجویز پر بحث کی جاچکی ہے۔

فائل پر مسٹر لودھی کی یادداشت مؤرخہ ۲۴/اپریل ۱۹۵۲ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملے میں کوئی کاروائی نہ کی گئی کیونکہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سرگودھا اپنی یادداشت مؤرخہ ۴/اپریل ۱۹۵۲ء میں یہ لکھ چکے تھے کہ اگر احراریوں کا رویہ بہتر ہوگیا تو وہ ان کے خلاف اقدام کو ملتوی رکھیں گے۔

ڈاکٹر حافظ مسعود احمد سیکرٹری انجمن احمدیہ سرگودھا نے صوبائی حکومت اور حکومت مرکزی کو تار بھیجے جن میں سرگودھا کے احراریوں کے طرز عمل کی شکایت کی۔ انہوں نے اسی قسم کے کچھ اور تار اخباروں کو بھی بھیجے، جو تار وزیر داخلہ کے نام ارسال کیا گیا اس میں یہ بیان کیا گیا کہ کانفرنس میں محمد علی جالندھری، عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے مقررین نے لاقانونی کی تلقین کی۔ اور لوگوں کو بھڑکایا کہ احمدیوں کو قوت سے کام لیکر ختم کردیں اور ایک ہفتے کے اندر اندر چوہدری ظفر اللہ خان سے چھٹکارا حاصل کریں۔ چوہدری ظفر اللہ خان پاکستان کا خضر حیات خاں ٹوانہ سے بھی بدتر دشمن ہے۔

385-87/C مؤرخہ ۲۸؍ مارچ ۱۹۵۲ء کی ایک نقل مرکزی حکومت کو بھیج دی گئی۔ لیکن حافظ مسعود احمد نے ۲۹؍ مارچ ۱۹۵۲ء کو ایک اور تار وزیر داخلہ کے نام بھیجدیا جس میں لکھا کہ

''میں نے اپنے گزشتہ تار میں احرار کانفرنس کے اثرات مابعد کے متعلق جو اندیشہ ظاہر کیا تھا وہ صحیح نکلا۔ جوش میں بھرے ہوئے عوام کے جلوس پھر بعد نماز نکالے گئے۔ احمدیوں کے خلاف ان کے معزز و محترم امام کے خلاف اور وزیر خارجہ پاکستان کے خلاف انتہائی اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے ہیں۔ احمدیوں کے خلاف اور حکومت کے خلاف نفرت پیدا کی جارہی ہے۔ مزید ابتری کا اندیشہ ہے۔ موثر انسدادی تدابیر لازمی ہیں''۔

مرکزی حکومت نے یہ تار بھی چیف سیکرٹری حکومت پنجاب کو ارسال کر دیا تا کہ اطلاع ہو جائے اور صوبائی حکومت جو تدابیر مناسب سمجھتے اختیار کر سکے۔ احرار کانفرنس سرگودھا کی کاروائی اخبار ''شعلہ'' مؤرخہ ۲۸؍ مارچ میں ذیل کی سرخیوں سے شائع کی گئی۔

جب تک سر ظفر اللہ وزیر خارجہ ہے کشمیر پاکستان کو نہیں مل سکتا۔ (مولانا محمد علی جالندھری بحوالہ تقریر اللہ رکھا ساغر)

ظفر اللہ پاکستان کا وفادار نہیں۔ حکومت کی مشینری کے پرزے مرزا محمود کی مرضی کے مطابق تبدیل کئے جاتے ہیں۔ (مولانا محمد علی)

ہم جان دے دیں گے لیکن نبی علیہ السلام کی نبوت پر آنچ نہیں آنے دیں گے (امیر شریعت)

الفاظ کو قائم رکھ کر اس کا مفہوم بدلنے والا زندیق ہے۔ اور زندیق اسلام میں واجب القتل ہے۔

ہر مرزائی حکومت کی ڈیوٹی بعد میں دیتا اور مرزا محمود کا حکم پہلے مانتا ہے۔ حکومت کا ہر وہ حکم جو مرزا محمود کی پالیسی سے ٹکرا جائے۔ مرزائی ملازم اس کی تعمیل نہیں کرتا۔

(مولانا محمد علی)

81

رپورٹ میں بیان کیا گیا کہ'' کانفرنس کے خاتمے پر دس ہزار نوجوانوں نے سر ظفر اللہ مردہ باد، مرزا بشیر احمد مردہ باد، ظفر اللہ استعفا دو، کے نعرے لگاتے ہوئے شہر کا چکر لگایا۔ اگر حکومت نے ان دجالوں کی طرف فوری توجہ نہ کی تو اس ناکامی کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوگی۔ چوہدری ظفر اللہ خان جب پیرس سے واپس آکر ربوہ کی کانفرنس میں شامل ہوا تھا تو اس نے اپنا پروگرام سرکاری طور پر شائع کرایا تھا۔ اس نے ربوہ ہی میں حکومت کے عہدہ داروں کو باریاب کیا۔ اس نے ربوہ کا سفر خرچ خزانہ حکومت سے وصول کیا۔ وہ حکومت کا وفادار نہیں۔ اس نے قادیان کے بدلے میں کشمیر کو بھارت کے ہاتھ بیچنے کا سودا کرلیا۔ عوام ایسی صورت حال پیدا کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ جس سے یہ دجال ابن دجال اور اس کے پیرو پاکستان سے بھاگ جانے پر مجبور ہو جائیں۔ مرزا بشیر الدین محمود دجال اعظم اور 14 ویں صدی کا مسلیمہ کذاب ہے۔ ہندوستان نے تو صرف ایک لاکھ مسلمان لڑکیوں کو محبوس کر رکھا ہے لیکن اگر مرزائی اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو وہ چار لاکھ لڑکیوں کو بے آبرو کر دینگے''۔

بعض احمدیوں کا ایک وفد کانفرنس کی کاروائی اور'' شعلہ'' میں اس کی رپورٹ کے خلاف گزارش کرنے کی غرض سے چیف سیکرٹری سے ملا، جہاں ہوم سیکرٹری بھی موجود تھے۔ اس کیس میں جو کچھ ہوا اس کی روداد درج ذیل ہے۔

آج چار احمدی حضرات کا ایک وفد جس میں شیخ بشیر احمد ایڈووکیٹ شامل تھے، چیف سیکرٹری سے ملا تا کہ احراریوں کی سرگودھا کانفرنس کے سلسلے میں اپنی شکایات پیش کرے۔ میں اس ملاقات کے دوران میں موجود تھا ان کی شکایت مختصراً یہ تھی کہ اس کانفرنس میں جو تقریریں ہوئیں۔ ان کا لہجہ اور رجحان سخت قابل اعتراض اور بے حد مغلظات آمیز تھا۔ ایک مقرر نے یہ بھی کہا کہ احمدی چونکہ زندیق ہیں اس لئے حکومت ان کو نابود کر دے۔ انہوں نے دو منسلکہ اخبار بھی چیف سیکرٹری کو دیے۔

۲۔ کیا ڈی جی سی آئی ڈی ازراہ کرم حکومت کی اطلاع کے لئے وہ رپورٹ پیش کرینگے جو ان کے عملے نے انہیں سرگودھا سے ارسال کی ہوگی۔ اگر موقع پر ان تقریروں کی لفظ بلفظ رپورٹ قلم بند کی تھی تو کیا ڈی آئی جی ازراہ نوازش ان تقریروں کا پورا متن مہیا کرینگے۔ تا کہ ان کا جائزہ لے کر

معلوم کیا جائے کہ وہ قابل اعتراض تھیں یا نہیں۔

۳۔ میں اس سلسلے میں یہ بھی بیان کروں گا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سرگودھا نے ۲۱ / مارچ کو جمعہ کے دن مجھے ٹیلیفون پر اطلاع دی تھی کہ احراری ایک جلوس نکالنے کا ارادہ کر رہے ہیں جس کے دوران میں وہ احمدیوں کے خلاف نعرے لگائیں گے میں جاننا چاہتا ہوں کہ حکومت کا اس معاملے میں کیا منشا ہے اور وہ ہم سے کس قسم کی پالیسی اختیار کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بتایا کہ احراری احمدی نزاع کے متعلق حکومت کی پالیسی سے تمام ڈپٹی کمشنروں کو مطلع کیا جا چکا ہے آپ کاغذات نکلوا کر ملاحظہ کر لیں اور اس پالیسی کی روشنی میں اپنے اختیار تمیزی سے کام لیں۔ اب تک ڈپٹی کمشنر کی طرف سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

ایس غیاث الدین احمد یکم اپریل ۱۹۵۲ء

ڈی آئی جی سی آئی ڈی (یو۔او) نمبر 264HS مؤرخہ ۲/اپریل ۱۹۵۲ء

میں نے کل اس کیس پر کاروائی کی تھی۔ جو اس کیس سے منسلک ہے۔

۲۔ یہ صحیح ہے کہ جو تقریریں کی گئیں وہ سخت اشتعال انگیز اور قابل اعتراض تھیں، مرزائیوں کو زندیق کہا گیا ان کی ہر طرح تضحیک اور مخالفت کی گئی۔ حتیٰ کہ وزیر خارجہ کو بھی نہ چھوڑا گیا۔ اور سرظفر اللہ مردہ باد کے نعرے لگائے گئے۔ چیف منسٹر صاحب کی ہدایات کے ماتحت سپرنٹنڈنٹ پولیس کو زیر دفعہ 107/151 ضابطہ فوجداری کاروائی کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت اقدام کرنے کی تجویز بھی کی تھی لیکن چیف منسٹر صاحب اس کے حامی نہیں ہیں۔

۳۔ تقریریں شارٹ ہینڈ میں قلمبند کی گئی تھیں اور پی آئی کی رائے میں وہ قابل مواخذہ قانونی نہیں ہیں۔

۴۔ ''شعلہ'' کا مضمون نہایت قابل اعتراض ہے۔ اس میں صرف احمدیوں ہی پر حملہ نہیں کیا گیا بلکہ حکام پر بھی نہایت ناواجب نکتہ چینی کی گئی ہے۔ سی آئی ڈی اس اخبار کے ایڈیٹر عبدالرشید اشک سے ناواقف ہے۔ بہت سے دوسرے احراریوں کی طرح یہ بھی کانگرسی ہے، ۱۹۴۷ء میں یہ

شخص پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند کر دیا گیا تھا کیونکہ یہ بھارت کے سیاسی ورکروں کے ساتھ ساز باز رکھتا تھا۔

83

۵۔ میری رائے یہ ہے کہ اگر اس ملک کو صحت منداصولوں پر ترقی کرنی ہے تو ان سیاسی بہروپیوں اور غنڈوں کو جو ایک دوسرے کو گالیاں دے کر مقبول عام بننے کی کوشش کرتے ہیں اور جو ملک کی ترقی میں کوئی تعمیری حصہ نہیں لیتے بے دردی سے دبا دینا چاہئے۔ احراریوں کو یہ احساس ہے کہ مسلم لیگ ان کی پشت پر ہے، ورنہ ان کا ماضی اس قدر تاریک ہے کہ انہیں کبھی سیاسی میدان میں داخل ہونے کی جرأت نہ ہوسکتی تھی۔ یہ کانگرس کے پٹھو تھے اور ان میں سے بعض اب بھی کانگرس ہی کے وفادار ہیں۔ مشہور احراری حبیب الرحمٰن تقسیم کے بعد اس صوبے کو چھوڑ کر بھارت چلا گیا۔ بعض احراری اپنے دلوں کی گہرائیوں میں اب تک پاکستان کے غدار ہیں۔ وہ بظاہر ایک مذہبی پلیٹ فارم پر کام کر رہے ہیں۔ لیکن ان کا مقصد اپنے ملک کی خدمت کرنا نہیں۔ بلکہ اپنی بگڑی ہوئی ساکھ کو از سر نو قائم کرنا ہے۔ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ احراریوں کا ایک گروہ شیخ حسام الدین کی سرکردگی میں سیاسی سرگرمیاں شروع کرنا چاہتا ہے اور اس کے ممبر ایک نئی پارٹی بنانے کا منصوبہ باندھ رہے ہیں۔

۶۔ میں تجویز کر چکا ہوں کہ ڈپٹی کمشنروں کو ایک گشتی مراسلت کے ذریعے سے یہ بتا دینا چاہے کہ ہر صورت حالات کے مقابلے میں ڈٹے رہیں اور اگر انہیں ذرا بھی شبہ ہو کہ احراریوں کا جلسہ ہوا تو فرقہ دار بدمزگی میں اضافہ ہو جائے گا تو فوراً دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری نافذ کر دیں۔ دوسرا کام جو ہمیں کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ اس چیتھڑے (شعلہ) کے خلاف کاروائی کریں جس نے وزیر خارجہ کے خلاف بدآہنگ حملوں کی اشاعت پر لے درجے کی خیرہ چشمی سے کی۔ جب تک سر ظفر اللہ خان اپنے عہدے پر فائز ہیں حکومت کا فرض ہے کہ اس قسم کے معاندانہ حملوں سے ان کی حفاظت کرے اور احرار سر ظفر اللہ خاں کو گالیاں دے کر صرف ایک فرد پر حملہ نہیں کرتے بلکہ اس حکومت کی توہین کرتے ہیں جس کے وہ ایک جزو ہیں۔

۷۔ احراری بڑے چالاک مقرر ہیں اور احتیاط کرتے ہیں کہ قانون کے چنگل میں نہ پھنسنے پائیں موجودہ کیس میں ان کے خلاف جماعتوں کے درمیان منافرت پھیلانے کی بناء پر زیر دفعہ

۱۵۳۔الف مجموعہ تعزیرات پاکستان مقدمات چلانا امکان میں نہیں ہے۔ میری رائے میں ان کی سرگرمیاں اس قسم کی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک دو نمایاں آدمیوں کے خلاف پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت کاروائی کی جائے تو یہ بالکل حق بجانب ہوگا۔

۸۔احمدیوں کی طرف سے دو تار موصول ہوئے جن میں انہوں نے احراریوں کے طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا۔

دستخط میاں انور علی ۱۴؍اپریل ۵۲ء

آئی جی۔ایچ ایس،(یو۔او) نمبر 216 BDSB مورخہ ۱۵؍اپریل ۱۹۵۲ء

احرار بجائے خود ایک مسئلہ ہیں وہ حکومت کے مخالف نہیں اور نہ براہِ راست قانون و انتظام میں خلل ڈالنے کے درپے ہیں۔ ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے کہ وہ محض اس لئے خاموش ہیں کہ وہ اتنے مضبوط نہیں ہیں اور اگر حکومت کی مخالفت کریں تو چنداں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ جونہی وہ اس قابل ہو گئے کہ عوام کی کافی تعداد کو اپنے گرد جمع کر سکیں وہ ضرور سر اٹھائیں گے اور گڑبڑ پیدا کرنے کے لئے کسی اقدام میں بھی تامل نہ کرینگے۔ یہ لوگ کوئی اہمیت نہیں رکھتے نہ ان کے پیچھے کوئی جتھا ہے نہ ان کے پاس کوئی پروگرام ہے لیکن وہ حریص جاہ ضرور ہیں اور مجھے بتایا گیا ہے کہ ان کی اس غرض کو مختلف سیاسی جماعتوں نے خصوصاً مسلم لیگ نے اکثر گدگدایا ہے۔ اس لئے وہ کسی ایسے دن کا انتظار کر رہے ہیں جب وہ اپنے اوصاف کی وجہ سے نہیں تو دوسرے لوگوں کی حماقت ہی کے باعث اگلی صف میں آ جائیں۔ اس دن کے لئے وہ احمدیوں کی مخالفت کی آگ کو برابر فروزاں رکھ رہے ہیں اگر یہ آگ بجھ گئی تو احرار کے پاس کوئی ایسی چیز باقی نہ رہے گی جس سے کوئی شخص ان کی جماعت کی طرف مائل ہو سکے۔ ان کا تنہا سرمایہ امید یہی ہے لہٰذا وہ اس پر جمے رہیں گے۔ انہیں پاکستان کی کچھ پرواہ نہیں۔ نہ وہ اس کے باشندوں کے درمیان اتحاد کے لئے فکر مند ہیں کسی وقت کسی اور شخص کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اس مسئلے کو کیونکر حل کیا جائے۔ یہ مسئلہ اب قطعی طور پر ایک خطرہ بن چکا ہے۔ اب تک احرار کو کافی موقع دیا جا چکا ہے ایک دفعہ حکومت کی طرف سے مجھے بھی ان کے ساتھ گفتگو کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ چنانچہ شیخ حسام الدین سے میری ملاقات ہوئی۔

اس ملاقات اور میرے ان کے سمجھوتے کے متعلق یادداشت سکرٹیریٹ میں ضرور محفوظ ہوگی۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ان کی جماعت آئندہ احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا نہ کرے گی۔ لیکن ہر ممکن موقع پر اس وعدے کی خلاف ورزی کی گئی۔ یاد رہے کہ احمدی بھی بھیڑ کے بچے نہیں ہیں وہ اس وقت چپ چاپ ہیں اور جوابی کاروائی نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ اپنی قلت تعداد سے آگاہ ہیں لیکن ہر شخص کی صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بہرحال حکومت کا اپنا فرض بالکل واضح ہے آخر حکومت کب تک اس بیدردانہ اشتعال انگیزی کو روا رکھے گی۔ اب تو قریب قریب یہی سمجھنا چاہیے کہ احراری احمدیوں کو بتلائے عذاب کررہے ہیں۔ سی آئی ڈی کو چاہیئے ہمیں بتائے کہ (الف) سیفٹی ایکٹ کے علاوہ کیا تدابیر ختیار کرنی چاہئیں (ب) احرار کی پوری طاقت اور تعداد کس قدر ہے اور (ج) وہ کس حد تک حکومت کے خلاف مزاحمت یا نافرمانی کرنے کے قابل ہیں۔ اگر احمدیوں کے مسئلے کو وجہ اقدام بنایا جائے تو اس کا عام ردعمل کیا ہوگا۔ اس قسم کی قطعی معلومات فراہم کئے بغیر کوئی مستقل فیصلے نہیں کئے جاسکتے۔ محض ڈپٹی کمشنروں کو ایسی گشتی چھٹیاں بھیج دینا جن میں کوئی قطعی تدبیر نہ بتائی گئی ہو آج کل کے زمانے میں چنداں مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔

(دستخط) قربان علی

(ہوم سیکرٹری)

احراری احمدی نزاع (اگر اسے اس نام سے موسوم کیا جاسکے) تشویشناک حد تک وسیع ہو چکا ہے۔ اس صوبے میں جو گڑبڑ اس نزاع سے پیدا ہوئی ہے، اس کے سب سے بڑے ذمہ دار احراری ہیں۔ احمدی (انسپکٹر جنرل پولیس کے قول کے مطابق) بھیڑ کے بچے نہیں ہیں لیکن انہوں نے جو سخت رویہ اختیار کررکھا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہیں۔ اگر وہ احراریوں کے حملوں اور ہنگاموں پر بے فکری کا رویہ اختیار کریں تو نہایت قلیل مدت میں بحیثیت جماعت ختم ہوجائیں۔ علاوہ بریں ان کے رویے کی سختی زیادہ تر مذہب کے دائرے تک محدود ہے۔ اگر وہ دوسرے اسلامی فرقوں کے افراد کو اپنی رسوم میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دیتے یا خود غیر احمدی مسلمانوں کے ساتھ نماز یا دوسرے دینی وظائف میں شریک ہونے سے پورا اجتناب کرتے

آخرالذکر رویے نے انہیں مسلمان عوام میں ہر دلعزیز بنادیا۔ جو اسلام میں ایک نئی نبوت کے عقیدے کے خلاف تضحیک وطنز کو بے انتہا پسند کرتے ہیں۔

87

۲۔مجلس احرار کی ان شاخوں کی فہرست منسلک ہے جو اب تک صوبے میں قائم ہو چکی ہیں اور مرکز کو سالانہ چندہ ادا کرتی ہیں اب تک جو وردی پوش رضا کار درج رجسٹر ہو چکے ہیں ان کی تعداد ۳۲۰ بتائی گئی ہے لیکن ''ففتھ کالم'' ان مولویوں پیش اماموں اور مذہبی دیوانوں پر مشتمل ہے جو اپنے اپنے دائروں اور منبروں سے مذہبی مناقشات کو زندہ رکھنا موجب ثواب سمجھتے ہیں۔ یہی لوگ احراری لیڈروں کو مسلسل ملک کے مختلف گوشوں میں دعوتیں دیتے ہیں اور ان کی خاطر مدارات کرتے ہیں۔ وہ اپنی پیشہ وارانہ تقریروں میں احمدیوں کے خلاف جس قدر زیادہ زہر چکانی کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ چندہ جمع ہوتا ہے۔ اب مجلس کی مالی حالت مستحکم ہے اور اسے بعض دولت مند مربی حاصل ہو گئے ہیں جن میں زیادہ فیاضی سے امداد کرنے والے مندرجہ ذیل اشخاص سمجھے جاتے ہیں۔

(۱) نوابزادہ نصر اللہ خان ایم ایل اے خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ

(۲) حاجی دین محمد بادامی باغ لاہور (مالک کارخانہ)

(۳) میاں قمرالدین رئیس اچھرہ لاہور

(۴) رانا غلام صابر ایم ایل اے اوکاڑہ

آج کل احرار لائل پور سیالکوٹ سرگودھا، راولپنڈی، گوجرانوالہ، منٹگمری ملتان اور مظفر گڑھ کے اضلاع میں اور اوکاڑہ چنیوٹ اور گوجر خاں میں زیادہ ذی اثر ہیں۔

۳۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ اس فرقہ وارانہ خطرے کے مقابلے کے لئے کیا کیا موثر تدابیر اختیار کی جائیں تو میری رائے مندرجہ ذیل ہے:۔

(الف) مسلم لیگ کو اس تحریک سے کاملاً علیحدگی اختیار کر لینی چاہئے ان کے ایم ایل اے اور عہدہ داروں کو چاہئے کہ نہ صرف احرار کے جلسوں کی صدارت نہ کریں بلکہ اپنے رویے سے عوام کو اس امر کا واضح ثبوت دیں کہ وہ کسی طریقے سے بھی احراریوں کی مدد نہیں کرنا چاہتے۔ بدقسمتی سے عام مسلمانوں کا ذہنی رجحان احمدیوں کے خلاف ہے، اور مسلم لیگ کے کارکن بعض اوقات عوام میں

اپنے اثر ونفوذ کو محفوظ رکھنے کی خاطر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کے جذبات سے کھلم کھلا ہم آہنگی اختیار کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ مل جانے کے باوجود کوئی احمدی اسمبلی کے انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکا، اس کی وجہ یہی سمجھی جاتی ہے کہ احراری مقررین کا عوام پر بہت اثر ہے۔

(ب) احرار کانفرنس (گو اس کا نام دفاع کانفرنس ہی رکھا گیا ہو) زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ممنوع ہونی چاہیئے۔

(ج) ایسا انتظام ہونا چاہیئے (اور بہتر ہے کہ مقامی مسلم لیگ کے ذی اثر ممبروں کے ذریعے سے ہو کہ پبلک مقامات احرار کے جلسوں کے لئے عاریتاً نہ دیئے جائیں۔

(د) احرار کے زیادہ متشدد مقررین مثلاً عطا اللہ شاہ بخاری، مولوی محمد علی جالندھری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور صاحبزادہ فیض الحسن سے اس قسم کے نوٹس کی تعمیل کرائی جائے کہ احمدیت کے خلاف تقریر کرتے ہوئے وہ اس بحث کی مذہبی حدود سے ہرگز تجاوز نہ کریں اور کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے احمدی جماعت کے خلاف پاکستان کے دوسرے شہریوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو سکے اور ان کے جذبات حبِ وطن کے بھڑک اٹھنے کا احتمال ہو، بہرحال اگر کوئی شخص یا کوئی طبقہ ایسی سرگرمیوں میں مصروف ہو جن سے مملکت کی سلامتی کو نقصان پہنچانا مقصود ہو تو قاعدہ یہ ہے کہ حکام کو اطلاع دے کر ان کے خلاف قانونی کاروائی کا مطالبہ کیا جائے نہ یہ کہ عوام کو بھڑکا کر اس امر پر آمادہ کر دیا جائے کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

(ہ) مقامی مجسٹریٹ احراری مقررین اور ان کے مقامی میزبانوں کے خلاف خصوصاً ان مولویوں اور پیش اماموں کے خلاف جو انہیں اپنی مسجدوں میں تقریروں کے لئے بلاتے ہیں، زیر دفعہ ۱۰۷ ضابطہ فوجداری کاروائی کر سکتے ہیں جو یقیناً مفید ہوگی۔

(و) میری رائے یہ ہے کہ زیادہ مکروہ حالات میں مثلاً جب عزت مآب وزیر خارجہ کو گالیاں دی جائیں اور ان کے جنازے نکالے جائیں یا پے در پے قانون شکنی اور حکومت کے خلاف بدگوئی کی جائے، پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے استعمال میں بھی تامل نہ کرنا چاہیئے۔ تنبیہات بارہا کی گئی ہیں اور بے نتیجہ ثابت ہوئی ہیں۔ اب احرار کو اس امر کا احساس دلانا دینا چاہیئے کہ حکومت اس دفعہ

90

(۵) یادداشت مؤرخہ ۴/۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء جس میں سرگودھا کے مقام پر احرار کی سرگرمیوں کا حوالہ دے کر تحریک احرار کے خطرات واضح کئے گئے۔ حکومت نے مزید قطعی تجاویز پیش کرنیکا مطالبہ کیا۔

(۶) کیس کو مناسب طور پر سمجھنے کے لئے ان قابل اعتراض واقعات پر دوبارہ نظر ڈالنا ضروری ہے جو احراری کارکنوں کی اندھا دھند اشتعال انگیز تقریروں سے پیدا ہوئے۔ مختصر طور پر ان واقعات کی کیفیت یہ ہے:-

(۱) اوکاڑہ۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء احمدی مبلغین کو راستے میں روک کر ان کے چہروں پر کالک مل دی گئی۔ احرار مقررین نے کشیدگی کی جو فضا پیدا کی تھی اس کی وجہ سے ایک احمدی مدرس قتل کر دیا گیا۔

(۲) راولپنڈی اکتوبر ۱۹۵۰ء احمدی جماعت کے خلاف نفرت پھیلانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک احمدی قتل کر دیا گیا گو اس کی فوری وجہ مختلف تھی۔

(۳) سیالکوٹ جنوری ۱۹۵۱ء احرار نے احمدیوں کے ایک جلسے کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ پولیس کے پہنچ جانے کی وجہ سے کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔

چک جھمرا۔ فروری ۱۹۵۱ء احرار کے تشدد کی وجہ سے ریلوے سٹیشن پر ایک شخص (پسر مولوی عصمت اللہ احمدی) کو احراری ورکروں نے چھرا مار دیا۔

(۵) گوجرانوالہ مارچ ۱۹۵۱ء جب ایک احمدی دکاندار نے مرزا غلام احمد کے خلاف نعرے لگانے پر اعتراض کیا تو اس پر حملہ کیا گیا۔ پولیس نے اس کی جان بچائی۔

(۶) لائل پور اپریل ۱۹۵۱ء غلام نبی جانباز کی دھمکی کے باعث ایک احمدی دکاندار پر حملہ کیا گیا۔

(۷) سمندری مئی ۱۹۵۱ء ایک ہجوم نے جس کی رہنمائی احراری کارکن کر رہے تھے احمدیوں کی ایک مسجد جلا دی۔

(۸) لائل پور نومبر ۱۹۵۱ء احراری کارکنوں نے احمدیوں کے ایک جلسے میں خلل ڈالا جس میں طرفین کے آدمی مجروح ہوئے۔ پولیس کی مداخلت کے باعث مزید گڑبڑ نہ ہوئی۔

(۹) ملتان نومبر ۱۹۵۱ء پچاس احراریوں نے ایک احمدی جلسے کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی پولیس کے پہنچ جانے کی وجہ سے مزید گڑبڑ نہ ہوئی۔

(۱۰) سرگودھا۔ مارچ ۱۹۵۲ء ایک احرار کانفرنس کے بعد پولیس کے احکام کے خلاف ایک جلوس نکالا گیا شرکائے جلوس چھاتی پیٹ پیٹ کر ظفر اللہ ہائے ہائے کے نعرے لگا رہے تھے۔

(۱۱) راولپنڈی، اپریل ۱۹۵۴ء احراریوں کے ایک جلسے میں اشتعال انگیز تقریریں سن کر ایک نوجوان اٹھا اور نعرے لگانے لگا، ''ظفر اللہ مرزائی کو ہٹایا جائے، وزیر ظفر کو قتل کیا جائے، مار دیا جائے''۔ عطا اللہ شاہ بخاری نے جو تقریر کر رہا تھا اس نوجوان کے نعروں کے بعد حاضرین سے کہا کہ ایک جلوس نکالیں اور ظفری وزارت کو توڑنے پر اصرار کریں۔

(۱۲) گوجرانوالہ۔ اپریل ۱۹۵۲ء احراری کارکنوں نے ایک جلوس مرتب کیا جس میں سر ظفر اللہ کے دو بناوٹی جنازے نکالے اور اس قسم کے نعرے لگائے گئے، ''**ظفر اللہ پتر چور دا، نعرہ مارو زور دا**''۔

(۱۳) لائل پور مئی ۱۹۵۲ء عطا اللہ شاہ بخاری نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ احمدیوں کے خلاف مظاہرے بڑے پیمانے پر کئے جائیں گے، اور صرف لائل پور جیسے مقامات تک محدود نہ رہیں گے بلکہ لاہور اور کراچی میں بھی ہوں گے۔ ایک جلوس بھی نکالا گیا۔ (اس کی پیشگوئی صحیح نکلی کیونکہ اس اعلان کے ایک ہفتہ بعد ۱۸ مئی کو کراچی میں ایک متشددانہ مظاہرہ ہوا جس کا نتیجہ بلوے کی صورت میں نکلا)

(۱۴) ایک چٹھی میرے علم میں لائی گئی جس میں لکھا تھا کہ جو شخص ظفر اللہ خان کا گلا کاٹے گا وہ بہشت میں جائے گا۔

۳۔ میں نے یہاں صرف ان اہم واقعات کا ذکر کیا ہے جو احراری سرکشی کے باعث حملوں اور نقص امن کی صورت میں رونما ہوئے۔ بے شمار ایسے جلسے منعقد کئے گئے ہیں۔ جن میں احمدیوں کے خلاف کھلم کھلا نفرت کی تلقین کی گئی ہے اور عوامی ذہن کو مسموم کیا گیا ہے۔ احراری لیڈر جو تقسیم کے بعد مجمعوں کا سامنا کرتے ہوئے ڈرتے تھے اب پھر ہیرو بن گئے ہیں۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری تقریباً

صرف یہ ہے کہ احمدیوں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کیا جائے۔ پچھلے دنوں سر ظفر اللہ خاں کو موقوف کرنے کے مطالبات نہایت قابل اعتراض طریقے پر کئے گئے ہیں۔ سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ احمدیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔

۸۔ جماعت احرار کا ایک اپنا اخبار ہے ''آزاد'' جو ہفتے میں تین دفعہ شائع ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت قلیل ہے۔ اس کا ایڈیٹر ڈاکٹر صابر ملتانی ہے۔

۹۔ آل پاکستان مجلس احرار کے انتخابات ۱۹۴۷ء سے اب تک نہیں ہوئے۔ پنجاب کے انتخابات نومبر ۱۹۵۱ء میں بمقام اوکاڑہ ہوئے جن کا نتیجہ یہ تھا۔

پریزیڈنٹ.................قاضی احسان احمد شجاع آبادی

وائس پریزیڈنٹ.................مولوی عبدالرحمٰن میانوی

جنرل سکرٹری.................مولوی محمد علی جالندھری

سیکرٹری.................مہر عبدالرحیم جہلمی

خازن.................محمد شفیع

سالار صوبہ.................چوہدری معراج دین

۱۰۔ یاد ہوگا کہ تقسیم کے فوراً بعد احراری لیڈر آئی این اے کے (جنرل) شاہ نواز سے ساز باز میں مصروف تھے جو بعد میں بھارت چلا گیا۔ متحدہ پنجاب کی مجلس احرار کے ایک ممتاز رکن حبیب الرحمٰن نے بھی بھارت میں سکونت اختیار کر لی۔ ایک شخص پربودھ چندر نے جو بعد میں ایم ایل اے ہو گیا تھا اور ممتاز کانگرسی کارکن تھا، اپنا ایک ہوٹل (ویرا ہوٹل میکلوڈ روڈ لاہور) آغا شورش کاشمیری اور نوابزادہ نصر اللہ خاں کے حوالے کر دیا۔ آغا شورش نے ۱۹۴۸ء میں مجلس احرار سے استعفا دے دیا۔ اس سے قبل وہ مجلس عاملہ کے ممبر تھے۔

۱۱۔ احراریوں میں ایک ایسا گروہ موجود ہے جو اپوزیشن پارٹیوں سے مل کر کام کرنے کا حامی ہے اس گروہ کے لیڈر شیخ حسام الدین ہیں۔ لیکن ماسٹر تاج الدین انصاری ہمیشہ اعتدال کا مشورہ دیتے ہیں اور موجودہ مرحلے پر مسلم لیگ سے کھلم کھلا علیحدگی کے خلاف ہیں۔ اب تک ماسٹر تاج الدین

کا گروہ زیادہ قوی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب احرار کو معلوم ہوگا کہ اب وہ عوام میں کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں تو وہ علی الاعلان مسلم لیگ سے منقطع ہو کر اپنی آزاد پارٹی قائم کر لیں گے۔

94

۱۲۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے احراری کارکنوں کی شر انگیز تقریروں کا نتیجہ نقص امن اور جسمانی تشدد کے بے شمار واقعات کی شکل میں برآمد ہو چکا ہے۔ کراچی کے تازہ واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر احرار کی سرگرمیوں کو بے روک ٹوک جاری رہنے دیا گیا تو کس قسم کے واقعات رونما ہوں گے۔ مزید براں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اگر احرار کو قوت اور حمایت عامہ حاصل کرنے کا موقع دیا گیا تو ان کے خلاف قانونی کاروائی زیادہ مشکل ہو جائے گی۔ اب وہ ''مشتبہ'' نہیں ہیں جیسے تقسیم کے وقت تھے۔

۱۳۔ مندرجہ بالا صورتحال کے متعلق کل انسپکٹر جنرل صاحب اور ہوم سیکرٹری صاحب سے گفتگو ہوئی۔ اب مندرجہ ذیل سفارشات حکومت کے غور کے لئے پیش کی جاتی ہیں:۔

(الف) مجلس احرار کو زیر دفعہ ۱۶ قانون فوجداری (ترمیمی) ایکٹ کے ماتحت خلاف قانون قرار دیا جائے (یہ تجویز میں نے مئی ۱۹۵۰ء ہی میں پیش کر دی تھی)

(ب) ذیل کے ممتاز کارکنوں کو گرفتار کر کے پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند کر دیا جائے۔

(۱) سید عطا اللہ شاہ بخاری

(۲) قاضی احسان احمد شجاع آبادی

(۳) محمد علی جالندھری

عطا اللہ شاہ بخاری کے خلاف مواد بہت مضبوط ہے۔ کیونکہ لائل پور میں اس نے جو کچھ بیان کیا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کراچی میں جو کچھ ہوا وہ اس کے علم میں تھا۔

(ج) اگر نظر بندی مناسب نہ سمجھی جائے تو ان تینوں لیڈروں کو ان کے اپنے دیہات میں پابند مسکن کر دیا جائے آخر عطا اللہ شاہ بخاری اپنی مرضی سے دو سال تک ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں میں مقیم رہ ہی چکا ہے۔ محمد علی جالندھری (جو مہاجر ہے اور اب ضلع ملتان میں آباد ہو چکا ہے) اور قاضی

جلد ارسال کرتے رہیں۔

جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں نے اس ہدایت نامے کے مطابق اقدامات کئے تو احراریوں نے ایک عیارانہ چال چلی۔ انہوں نے پبلک مقامات کو چھوڑ کر مساجد میں خصوصاً نماز جمعہ سے قبل یا بعد کے جلسے منعقد کرنے شروع کر دیئے جن میں حاضرین کی تعداد کثیر جمع ہو جاتی تھی۔ اس نئی صورت حالات پر غور کرنے کے لئے انسپکٹر جنرل پولیس ڈی آئی جی، سی آئی ڈی ہوم سیکرٹری اور لیگل ریم مبرنسر کی ایک کانفرنس ۱۹ر جون ۱۹۵۲ء کو منعقد کی گئی اس گفتگو میں جو فیصلے کئے گئے ان کے مطابق مندرجہ ذیل ہدایات چیف سیکرٹری کے ملاحظہ اور منظوری کے بعد تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور کمشنروں کو بذریعہ لاسلکی ارساں کی گئیں۔

حکومت کو اطلاع موصول ہوئی ہے کہ احرار مسجدوں کے اندر نماز جمعہ سے پہلے یا بعد میں احمدیوں کے خلاف اپنے جلسے منعقد کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس قسم کے جلسوں کو ممنوع قرار نہیں دیں گے۔ اگر احراری آپ کے ضلع کی حدود کے اندر اس قسم کے جلسوں کا انعقاد کا ارادہ کر رہے ہیں تو آپ کو فی الفور ایک حکم زیر دفعہ ۱۴۴ الف ضابطہ فوجداری صادر کر کے اس دن کے تمام جلسوں کو ممنوع قرار دینا چاہئے۔ اس حکم میں مقام جلسہ کا ذکر نہ کیا جائے اس کے بعد آپ کو چاہئے کہ اس مسجد کے امام کو اور ان اشخاص کو جو مسجد کے انتظام سے تعلق رکھتے ہوں طلب کر کے ان کو سمجھائیں کہ وہ آپ کے احکام کی خلاف ورزی میں شریک نہ ہوں اور کسی سیاسی جماعت کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی غرض سے کسی عبادت گاہ کا غلط استعمال نہ ہونے دیں۔ آپ ان لوگوں پر واضح کر دیجئے کہ اگر آپ کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی تو آپ جلسے کے حقیقی منتظمین کارکنوں اور مقرروں کے ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کو بھی ماخوذ کرنے میں تامل نہ کریں گے جن کا تعلق مسجد کے انتظام سے ہوگا۔ کیونکہ وہ اعانت مجرمانہ کے ذمے دار سمجھے جائیں گے۔ حکومت اس امر سے آگاہ ہے کہ ممکن ہے جلسہ عام کو نماز کی جماعت میں گڈمڈ کر دیا جائے۔ یا نمازیوں کا مجمع نماز یا خطبے سے قبل ہونے والی تقریروں کے لہجے کی وجہ سے ایک جلسہ عام کی شکل اختیار کر لے۔ لیکن حکومت کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ ایسے واقعات سے ذمہ داران جلسہ کو جو آپ کے حکم کی خلاف ورزی

مسجدوں میں عام جلسوں کے خلاف

دفعہ ۱۴۴ کے احکام کا نفاذ

سرگودھا اور گوجرانوالہ کے کیس

صوبائی حکومت کی صادر کردہ ہدایات کے ماتحت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں نے جو احکام صادر کیے ان کا نفاذ بعض مقامات پر ملزموں کی داروگیر سے کیا گیا۔

۲۱ رجون ۱۹۵۲ء کو احراریوں نے اعلان کیا کہ کل بروز جمعہ میونسپل پارک سرگودھا میں ۸ بجے صبح ایک جلسہ منعقد ہوگا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایک حکم زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کر کے جلسے کو ممنوع قرار دے دیا۔ یہ حکم اس پالیسی کے تحت دیا گیا جو حکومت نے اپنی مراسلت مؤرخہ ۵ رجون ۱۹۵۲ء میں تجویز کی تھی۔ اس پر احراریوں نے ایک اور اعلانِ عام کیا کہ یہ جلسہ تاریخ مقررہ پر جمعہ مسجد میں منعقد ہوگا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بلاتاخیر یہ اعلان کرایا کہ جو حکم زیر دفعہ ۱۴۴ صادر کیا گیا ہے اس کا اطلاع مساجد کے اندر عام جلسوں پر بھی مساوی حیثیت سے ہوتا ہے اس لیے مجوزہ جلسے کا انعقاد اس حکم کی خلاف ورزی کا مترادف سمجھا جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود ۱۰ بجے یہ جلسہ زیر صدارت شیخ حسام الدین منعقد ہوا۔ ماسٹر تاج الدین انصاری صدر مجلس احرار پاکستان، شیخ حسام الدین جنرل سیکرٹری مجلس احرار پاکستان، محمد عبداللہ صدر مجلس احرار ضلع سرگودھا نے حسب معمول احمدیوں کے خلاف تقریریں کیں اور دوران جلسہ میں ''ظفر اللہ مردہ باد'' ''مرزائیت مردہ باد'' وغیرہ کے نعرے برابر لگائے گئے۔ میاں محمد اسحاق مجسٹریٹ (اون ڈیوٹی) نے حاضرین کو اور منتظمین جلسہ کو آگاہ کیا کہ اس جلسے میں ان کی شرکت خلاف قانون ہے لیکن اس تنبیہ کی کسی شخص نے پروانہ کی اور جلسہ پونے بارہ بجے تک برابر جاری رہا۔ دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی خلاف ورزی کے جرم میں ماسٹر تاج

الدین انصاری، شیخ حسام الدین اور محمد عبداللہ کے خلاف ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمات دائر کیے گئے۔ عدالت نے ۱۴؍جولائی ۱۹۵۲ء کو انہیں زیر دفعہ ۱۴۳ مجرم قرار دے کر چھ چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دے دی۔ اسی واقعہ کی بنا پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے زیر دفعہ ۱۸۸ تعزیرات [103] علیحدہ علیحدہ استغاثے بھی ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں دائر کیے جن کی سماعت ۱۴ جولائی ۱۹۵۲ء کو ہوئی۔ لیکن آغاز ہی میں پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ہدایات کے ماتحت ان مقدمات کو واپس لے لیا۔

دفعہ ۱۴۴ کے حکم کی دوسری خلاف ورزی گوجرانوالہ میں کی گئی۔ وہاں جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں ۲۰؍جون ۱۹۵۳ء کو بعد نماز جمعہ ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا۔ اس جلسے کا اعلان ایک روز قبل قصبے کے بازاروں میں مطبوعہ اشتہارات اور لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے سے کیا گیا تھا۔ خطبہ پڑھا جا رہا تھا کہ محمد امین جنرل سیکرٹری مجلس احرار نے اعلان کیا کہ ماسٹر تاج الدین انصاری اور شیخ حسام الدین لاہور سے آ گئے ہیں اور وہ اس جلسے میں تقریریں کریں گے۔ جلسہ نماز کے بعد شروع ہوا۔ اس وقت بہت سے لوگ جا چکے تھے۔ جلسے کی صدارت صاحبزادہ فیض الحسن نے کی۔ کاروائی کا آغاز "میرزائیت مردہ باد، ظفر اللہ کو ہٹا دو اور مرزائیوں کو اقلیت قرار دو" کے نعروں سے ہوا اور دو قرار دادیں منظور کی گئیں اس خلاف ورزی کی بنا پر نو اشخاص کے خلاف جس میں ماسٹر تاج الدین انصاری شیخ حسام الدین اور صاحبزادہ فیض الحسن شامل تھے مقدمات دائر کیے گئے، لیکن ۱۶؍جولائی ۱۹۵۲ء کو جب سماعت شروع ہونے لگی تو پراسیکیوٹنگ آفیسر نے حسب الحکم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ان مقدمات کو واپس لینے کی درخواست کی جو عدالت نے منظور کر لی اور تمام ملزمین اسی دن رہا کر دیئے گئے۔

اب احراریوں نے مسئلے کو گڈمڈ کرنے کے لئے اس شکایت پر زور دینا شروع کیا کہ مساجد کے اندر خالص دینی سرگرمیوں کی پاداش میں نمازیوں کو گرفتار اور ماخوذ کیا جاتا ہے اور حکومت لوگوں کے مذہبی عقائد و اعمال میں دست اندازی کر رہی ہے۔ ذیل میں ایک پر لطف قصہ بیان کیا جاتا ہے جس سے اس پروپیگنڈے کی نوعیت معلوم ہوگی جو حکومت کے خلاف جاری کیا گیا تھا۔

ایک شخص مولوی محمد شفیع خطیب جامع مسجد سرگودھا اور بعض دوسرے اشخاص زیر دفعہ ۱۴۳ گرفتار کئے گئے کیونکہ انہوں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم زیر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی تھی۔ مولوی شفیع نے ضمانت داخل کر دی اور رہا کر دیا گیا۔ اس شخص نے اپنی رہائی سے فائدہ اٹھا کر ۲۴ ۱۹۵۲ء کو عید گاہ سرگودھا میں بصورت خطبہ ایک زہریلی تقریر کر ڈالی۔ جس میں یہ دعویٰ کیا کہ مرزا غلام احمد جو مدعی نبوت تھا وہ خود اور اس کے ماننے والے کافر ہیں، اس کا دعویٰ نبوت جھوٹا تھا۔ گزشتہ زمانے میں جھوٹے نبی ہلاک کر دیئے جاتے تھے۔ حکومت کو اعلان کرنا چاہئے کہ آیا پاکستان کی حکومت اسلامی ہے یا غیر اسلامی اگر یہ اسلامی حکومت ہے تو مسلمانوں کو حق حاصل ہے کہ مسجدوں میں مذہبی معاملات پر بحث کریں۔ لیکن اگر یہ حکومت اسلامی نہیں تو مسلمان مسجدوں میں اس قسم کے مسائل پر بحث کرنا بند کر دیں گے اور اس حالت میں مساجد کو بند کر دینا پڑے گا۔ مولوی شفیع برابر یہ کہتا رہا کہ مجھے سیاسیات سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن جہاں تک میرے دینی عقائد کا معاملہ ہے میں ان باتوں کے بیان سے ہرگز باز نہ رہوں گا جو مذہب سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم اس کیس کا ذکر اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ بجائے خود اس کی کوئی اہمیت ہے بلکہ ہمارا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ احرار نے مساجد کے اندر مذہب کے پردے میں من مانی کرنے کا پورا حق قائم کرنے کی غرض سے ایسی دلیل اختیار کی تھی جو بظاہر معقول نظر آتی تھی اور جس سے استغاثہ کا موقف بہت ہی کمزور اور مضحکہ خیز ہو جاتا تھا۔ جب مساجد پر دفعہ ۱۴۴ کے اطلاق کا مسئلہ سامنے آیا تو سیکرٹریٹ میں اس پر جو یادداشتیں لکھی گئیں ان میں بھی اس دلیل کا اثر واضح تھا۔ مولوی محمد شفیع نے جب یہ تقریر کی تو وہ پہلے ہی دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے ایک مقدمے میں زیر ضمانت تھا۔ مندرجہ بالا تقریر کی بنا پر وہ دوبارہ ایک نئے جرم کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا لیکن پھر ضمانت دے کر رہا ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے کو ضمانت پر جیل کو ترجیح دینی چاہئے۔ چنانچہ اس ہدایت کے مطابق مولوی محمد شفیع نے مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنی ضمانت منسوخ کرا لی۔ مولوی محمد شفیع احرار کا کوئی نمایاں ممبر نہ تھا اور اس نمونے کے مولویوں کے متعلق حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ اگر وہ معافی مانگ لیں تو انہیں رہا کر دیا جائے لیکن اس مولوی نے نہ معافی مانگی نہ ضمانت داخل کی۔ جب مسجدوں پر دفعہ ۱۴۴ کے اطلاق

سے پیدا ہونے والی پریشان کن صورتحال کے متعلق مسٹر قربان علی خان سے مشورہ کیا گیا تو انہوں نے اس واضح صورت کو سامنے رکھ دیا جس کا حکومت کو بہر حال سامنا کرنا تھا۔ خان صاحب نے اپنی یادداشت مؤرخہ ۲ رجولائی میں لکھا کہ جب تک حکومت یہ نہ مان لے کہ مسجد قانون شکنوں کے لئے جائے پناہ ہے اس وقت تک اپنی اس ذمہ داری سے آزاد نہیں ہوسکتی کہ اسے ہر حال میں قانون کو نافذ کرنا ہے۔

میاں انور علی نے دو اشتہار دیکھے۔ جن میں مساجد پر دفعہ ۱۴۴ کے اطلاق کے خلاف اظہار برہمی کیا گیا تھا اور اعلان کیا گیا تھا کہ ۱۳ رجولائی کو برکت علی محمڈن ہال میں اس صورت حال پر غور کرنے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوگا۔ اس پر مسٹر انور علی نے ۳ رجولائی کو ایک یادداشت لکھی جس میں شکایت کی کہ حکومت کے خلاف اس قسم کا شرارت آمیز پروپیگنڈہ احراری اور ان کے دوست کر رہے ہیں۔

یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ دفعہ ۱۴۴ مساجد پر نافذ کی گئی ہے اور حق عبادت منسوخ کر دیا گیا ہے۔ جب تک محکمہ تعلقات عامہ اس پروپیگنڈا کو بے اثر کرنے کے لئے بہت بڑے پیمانے پر کام نہ کریگا حکومت کے خلاف لوگوں کے دلوں میں عام نفرت کا پھیلنا طبعی ہے۔ مسٹر قربان علی خان نے اس سے اتفاق کیا اور لکھا کہ ہمارا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ محکمہ تعلقات عامہ ہے۔ ہوم سیکرٹری نے ۴ رجولائی ۱۹۵۲ء کو حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا:۔

۱۔ میرے خیال میں اب یہ امر اشد ضروری ہوگیا ہے کہ ہم اپنے پروپیگنڈا کو تیز کر دیں ورنہ ہم کوتاہی کی وجہ سے اپنا مقدمہ ہار جائیں گے۔ بے حد ضروری بات یہ ہے کہ ہم عوام کو بار بار یہ بتائیں کہ حقیقت میں ہم نے کیا کیا ہے اور ہمارے مختلف افعال کے وجوہ اسباب کیا ہیں۔

۲۔ آج صبح میں نے ڈائرکٹر تعلقات عامہ کو طلب کر کے ان سے کہا ہے کہ وہ اپنی مشینری کی رفتار کو تیز کریں اور صوبے بھر میں پروپیگنڈا کے مواد کا سیلاب بہا دیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ ایک دو پریس نوٹ شائع کر دینے سے صورت حالات کا تقاضا پورا نہ ہوگا کیونکہ احراریوں نے عوام کی تائید حاصل کرنے کے لئے مسئلے کو گڈ مڈ کرنے کی چال اختیار کر لی ہے۔

۳۔ چیف سیکرٹری کی ہدایت کے مطابق میں نے یکم جولائی کو مولانا اختر علی خان اور ان کے گروہ کے ایڈیٹروں سے بات چیت کی۔ ان کو صورت حال سمجھائی اور انہوں نے اپنے خطروں اور اندیشوں کے متعلق جتنے سوالات کئے میں نے ان کے جوابات دیئے۔ یہ لوگ کاملاً مطمئن ہو کر گئے لیکن مجھے افسوس ہے کہ ایک اخبار کے سوا باقی کسی نے حکومت کے اقدام کی حمایت میں کلمہ خیر نہیں کہا۔ ٹیلیفون پر چیف منسٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے کل پھر مولانا اختر علی خان سے بات چیت کی۔ انہوں نے حکومت کے اقدامات کے جواز پر ایک دفعہ پھر یقین و اطمینان کا اظہار کیا۔ لیکن آج کے پرچے میں انہوں نے احراریوں کے تمام اقوال و دعاوی کی پھر تائید کی ہے۔ اس گروہ کے دوسرے اخباروں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ ان اخباروں کے متعلقہ تراشے شامل کر رہا ہوں۔ کل میں نے مسٹر حمید نظامی اور مسٹر مظہر علی خان کو بھی طلب کیا اور آغاز ہی میں ان پر واضح کر دیا کہ ان کو طلب کرنے سے میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں پوری پوزیشن سمجھا دوں، اس کے بعد وہ آزاد ہیں کہ میری باتوں کی جو تاویل و توجیہ چاہیں کر لیں۔ ان دونوں کا خیال یہ تھا کہ حکومت نے جو کچھ کیا وہ عوام کی تائید و حمایت کا مستحق ہے اور اس سے ملک کی سالمیت کو تقویت پہنچے گی۔ لیکن مسٹر حمید نظامی نے کہا کہ اگر میں اپنے اخبار میں اس خیال کا اظہار کر دوں تو سب سے پہلے حکومت کے منظور نظر اور مسلم لیگی اخبارات ہی مجھے احمدی قرار دے کر بدنام کرینگے تاکہ اس طریقے سے اپنی اشاعت میں اضافہ کر لیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جس مقصد سے حکومت نے احرار کے خلاف انسدادی اقدام کیا ہے وہ بالکل فوت ہو جائے گا۔ تاوقتیکہ اخبارات بھی حکومت سے تعاون نہ کریں اور اپنے کالموں کے ذریعے سے زہر پھیلانا بند کر دیں۔ مسٹر مظہر علی خان نے کہا کہ اس تمام مصیبت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حکومت نے خود مذہب کو اپنے نعروں کا موضوع اور اپنی قوت کا سرچشمہ بنا رکھا ہے اور اگر ایک گروہ اپنے مقاصد کے لئے مذہب کو استعمال کر سکتا ہے تو دوسروں سے کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کی خاطر مذہب کو آلہ کار نہ بنائیں۔

چونکہ اس معاملے کا زیادہ تعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں سے ہے اس لئے کل ان کی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جس کے بعد تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے نام ایک ہدایت نامہ جاری کیا جائے گا

تا کہ وہ اپنے اضلاع میں عام نشر و اشاعت کا کام منظم کریں جس میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ ان کی ضروری امداد و رہنمائی کرینگے۔ اس کانفرنس میں جو دوسری سفارشات تجویز ہوں گی وہ فی الفور بغرض احکام چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی جائیں گی۔

107 ہوم سیکرٹری نے یکم اور ۳ رجولائی کو بھی بعض اخباروں کے ایڈیٹروں کو طلب کر کے ان سے گفتگو کی اور بتایا کہ حکومت کے لئے مساجد کے اندر احراریوں کے جلسوں کو ممنوع قرار دینا کیوں ضروری ہو گیا تھا۔ ہوم سیکرٹری صاحب نے اخباروں سے تعاون کی استدعا کی، ان کا خیال یہ تھا کہ انہوں نے پوزیشن بالکل واضح کر دی ہے لیکن چند ہی روز کے اندر انہیں یہ دیکھ کر بے حد مایوسی ہوئی کہ ان کی توقعات نقش بر آب ثابت ہوئی ہیں اصل بات یہ تھی کہ ہوم سیکرٹری صاحب کو بعض اخبار نویسوں کی بے ضمیری کا علم نہ تھا۔

اس مسئلے پر احراریوں نے علما کی تائید حاصل کرنے کے لئے ۱۳ رجولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور میں تمام پارٹیوں کی ایک کنونشن منعقد کی اور ظاہر کیا کہ عقیدہ ختم نبوت تمام مسلمانوں کا مشترکہ عقیدہ ہے اور اس میں مختلف مذہبوں اور فرقوں کا کوئی امتیاز نہیں۔ اس کنونشن کے اعلان سے جو صورت حالات پیدا ہوئی اس پر غور کرنے کے لئے ۵ رجولائی ۱۹۵۲ء کو تمام اہم اضلاع کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت چیف سیکرٹری نے کی اور جس میں ہوم سیکرٹری انسپکٹر جنرل پولیس ڈی آئی جی سی آئی ڈی اور ڈائرکٹر تعلقات عامہ شامل ہوئے۔ اس کانفرنس میں مندرجہ ذیل فیصلے کئے گئے۔

(۱) جس جگہ ضروری ہو دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے ماتحت صادر ہونے والے احکام میں ایسی ترمیم کر لی جائے کہ ان کا اطلاق مخصوص طور پر صرف ان جلسوں پر ہو جو احراریوں یا احمدیوں کی طرف سے کئے جائیں۔ جلسے کے مقام کا ذکر نہ کیا جائے۔ حکومت نے نمونے کے جس حکم کا وعدہ کیا تھا وہ حتیٰ الامکان جلد سے جلد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو بھیج دیا جائے گا۔ لیکن متعلقہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو حکومت کے مسودے کے انتظار میں ترمیم شدہ احکام کا اجرا ملتوی رکھنے کی ضرورت نہیں۔

اس کنونشن میں جو تقریریں کی جائیں اور جو فیصلے کئے جائیں ان کا جائزہ بعد میں لیا جائے کہ آیا ان کے خلاف کوئی کاروائی ضروری ہے۔ اگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا ڈائریکٹر تعلقات عامہ اس کنونشن میں شریک ہونے کا ارادہ کرنے والوں سے بات چیت کر کے انہیں تلقین تشدد اور قانون شکنی مخالفت پر آمادہ کر سکیں تو یہ کنونشن حکومت کے نقطہ نگاہ سے حقیقۃً مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ڈی آئی جی سی آئی ڈی کوشش کرینگے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو ان اشخاص کے ناموں کی فہرست مہیا کر دیں جو اس کنونشن میں شریک ہونے والے ہیں۔

(۷) اس سلسلے میں خواہ حکام بجائے خود کوئی کاروائی کریں یا حکومت کی وقتاً فوقتاً جاری کی ہوئی ہدایات کے مطابق اقدام کریں انہیں ہر حالت میں یہ امر پیش نظر رکھنا چاہئے کہ حکومت کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ احراری احمدی نزاع کی وجہ سے قانون و انتظام کو جو خطرہ لاحق ہے اس کو نابود کرنے کے لئے ان دو جماعتوں کو باقی عوام سے منقطع اور الگ تھلگ کر دیا جائے۔ اس سے یہ نتیجہ ہوگا کہ احراریوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش میں جو یہ بے بنیاد ہوا کھڑا کر دیا ہے کہ حکومت عوام کے مذہبی اور سیاسی حقوق میں مداخلت کر رہی ہے وہ بالکل ختم ہو جائے گا۔

اسی دن بعض احراری لیڈروں نے مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی سے ملاقات کر کے ان کے سامنے یہ طعمہ پھینکا کہ ہم ایسی تقریریں بند کرنے پر آمادہ ہیں جن سے نقص امن کا احتمال ہو بشرطیکہ دفعہ ۱۴۴ کے احکام اور ان احکام کی خلاف ورزی کے مقدمات واپس لے لئے جائیں۔ مسٹر انور علی نے اس پیشکش کے متعلق اپنا تاثر ذیل کے الفاظ میں قلمبند کیا۔

''آج صبح مولانا اختر علی خان مجھ سے ملنے آئے مجلس احرار کے نئے صدر مولوی غلام غوث سرحدی بھی ان کے ساتھ تھے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے اب احرار محسوس کر رہے ہیں کہ ان کی تقدیر پر مہر لگ چکی ہے اور اگر انہوں نے فوراً عامۃ المسلمین کی ہمدردی حاصل نہ کی تو وہ بحیثیت ایک سیاسی جماعت کے ختم ہو جائیں گے۔ ان کی اس ملاقات کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس امر کا یقین دلائیں کہ احرار من حیث الجماعت ایک بیان شائع کرنے پر آمادہ ہیں جس میں یہ اعلان کیا جائے گا کہ آئندہ ایسی تقریریں نہیں ہونگی

کر سکیں۔

چیف منسٹر صاحب نے ۸؍جولائی جو اس کانفرنس کے فیصلوں پر منظوری دے دی۔ جولائی کے پہلے ہفتے میں جب چیف منسٹر صاحب نتھیا گلی میں مقیم تھے، مولانا سلیمان ندوی نے (جو ایک ی کمیٹی کے سلسلے میں نتھیا گلی آئے ہوئے تھے) ان سے مساجد پر دفعہ ۱۴۴ کے اطلاق کے متعلق تشویش کا اظہار کیا۔ ۱۰؍جولائی کو تین مولویوں نے ہوم سیکرٹری سے ان کے دفتر میں ملاقات کی اور ان سے چند سوالات کیے اور اس کے بعد مولوی محمد علی جالندھری نے بھی ۱۱؍جولائی کو ایک چٹھی میں ان سوالات کو دہرا کر مندرجہ ذیل چار نکات کی صراحت کی استدعا کی۔

(۱) دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے تحت جو قیود نافذ کی گئی ہیں آیا وہ مساجد میں تردید مرزائیت پر عائد کی گئی ہیں۔

(۲) آیا یہ قیود پچھلے دنوں مساجد پر سے اٹھا لی گئی ہیں۔

(۳) آیا مسلمانوں کو مسجدوں میں تردید مرزائیت اور مسئلہ ختم نبوت پر تقریریں کرنے کی اجازت ہے۔

(۴) آیا مسلمانوں کو مسجدوں سے باہر ان دو مسئلوں کے متعلق جلسے منعقد کرنے کی اجازت ہے۔ ہوم سیکرٹری نے انسپکٹر جنرل پولیس سے مشورہ کرنے کے بعد اس چٹھی کا جواب دیا جس میں بتایا کہ جو احکام زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری صادر کیے گئے ہیں، ان کا اطلاق صرف ان عام جلسوں پر ہوتا ہے جن کے انعقاد کا انتظام مجلس احرار پاکستان یا احمدی جماعت کے افراد کی طرف سے کیا گیا ہو۔ اس کے سوا حکومت نے مساجد یا دوسری عبادت گاہوں پر یا عبادت اور ادائے رسوم مذہبی پر کبھی کوئی قید عائد نہیں کی۔ ہوم سیکرٹری نے یہ بھی کہا کہ احراریوں اور احمدیوں کے سوا دوسری تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو عام جلسے منعقد کرنے کی آزادی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ کو بھی ہدایت کی جا چکی ہے کہ وہ اپنا پروپیگنڈا تیز تر کر دیں تاکہ مساجد کے اجتماعات پر ان احکام کے اطلاق کے متعلق صحیح پوزیشن عوام پر واضح کی جا سکے لیکن اس سلسلے میں جو کچھ اب تک معلوم ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جب جولائی کے پہلے ہفتے میں ہوم سیکرٹری بعض اخبار

نویسوں سے گفتگو کر چکے تو ڈائرکٹر نے بھی بعض ایڈیٹروں سے خطاب کرلیا اور ۱۱ر جولائی سے پہلے کسی وقت احترام مساجد کے عنوان سے ایک پوسٹر شائع کیا جس میں اس امر کی صراحت کی کہ نہ مساجد میں جانے پر کوئی پابندی ہے نہ رسوم مذہبی کی بجا آوری پر مسجدوں کے اندر یا باہر کوئی قید ہے مذہبی تقریروں اور خطبوں پر یا عقیدہ ختم نبوت یا کسی دوسرے مذہبی عقیدے کی توضیح کا امتناع لیا گیا ہے۔ دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت احکام کے نفاذ کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو تشدد اور لاقانونی کی تلقین سے روکا جائے اور مذہب کے پردے میں مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان بدنظمی، تشدد اور نقص امن کی اشتعال انگیزی سے باز رکھا جائے۔

مسٹر چیمہ ڈپٹی کمشنر منٹگمری نے ایک تجویز پیش کی جس کی تائید ۵ر جولائی ۱۹۵۲ء کی کانفرنس میں دوسرے ڈپٹی کمشنروں نے بھی کی۔ وہ تجویز یہ تھی کہ مرکزی حکومت سے استدعا کی جائے کہ اس موضوع پر ایک مختارانہ بیان جاری کر کے صورتِ حال پر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ حکام کو یہ احساس تھا کہ اس قسم کے بیان سے صورت حال بالکل واضح ہو جائے گی اور مرکز کی تجویز کردہ پالیسی کے عملدرآمد میں صوبائی حکومت کے ہاتھ بڑی حد تک مضبوط ہو جائیں گے لیکن اس وقت تک ایک چٹھی بصیغہ راز نمبر 4/9/52-S.(1) ۲ر جولائی ۱۹۵۲ء منجانب سیکرٹری وزارت داخلہ حکومت پاکستان تمام صوبائی حکومتوں اور مقامی نظامتوں کے نام وصول ہو چکی تھی جو درج ذیل ہے:۔

"مجھے آپ کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانے کی ہدایت کی گئی ہے کہ گزشتہ مہینوں کے اندر پاکستان کے بعض حصوں میں مذہبی اور فرقہ وارانہ تنازعات بہت نمایاں طور پر بڑھ گئے ہیں یہ تنازعات خصوصاً احراریوں اور احمدیوں کے درمیان برپا ہیں اور بعض مقامات پر نقص امن کا باعث ہوئے ہیں۔ حکومت پاکستان کا خیال ہے کہ اگر اس صورت حال کو بدستور بے روک ٹوک چلنے دیا گیا تو اس سے نہایت سنگین نتائج برآمد ہونے کا احتمال ہے۔ لہٰذا صوبائی حکومتوں اور مقامی نظامتوں کی توجہ وزارت داخلہ کی چٹھی نمبر 738.S(1) مؤرخہ ۷ر ستمبر ۱۹۵۱ء کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جو موجودہ پتوں ہی پر ارسال کی گئی تھی یہ چٹھی سہولت حوالہ کی غرض سے ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

ایسے واقعات رونما ہو چکے ہیں کہ مختلف مسلمان فرقوں نے ایکدوسرے کے خلاف قابل

اعتراض پروپیگنڈا کیا ہے جس سے طرفین کی دل آزادی ہوئی ہے اور انتہائی صورتوں میں بعض اشخاص کے خلاف تشدد بھی کیا گیا ہے۔ اس قسم کی شورش کا ایک نمونہ وہ ہے جو پنجاب میں احراری نزاع کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ مرکزی حکومت کا خیال ہے کہ بلاشبہ کسی جماعت اور فرقے کے اس جائز حق پر ناواجب پابندی عائد نہیں ہونی چاہئے کہ وہ اپنے عقائد مذہبی کی تبلیغ کرے اور اس معاملے میں مختلف عقائد کے مبلغوں کے درمیان کسی قسم کا فرق و امتیاز ملحوظ نہ ہونا چاہئے لیکن مذہبی مناظروں اور مناقشوں کو معقول حدود کے اندر محدود رکھنا چاہئے اور انہیں ایسے نقطے پر پہنچنے کی اجازت نہ دینی چاہئے کہ امن وسکون عامہ خطرے میں پڑ جائے۔ مرکزی حکومت کی رائے میں جنگجویانہ اور جارحانہ فرقہ آرائی کو سختی سے دبا دینا ضروری ہے۔

113

۲۔ مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں کسی ایسے اقدام کے متعلق جو آپ اپنے دائرہ نظم ونسق میں ضروری سمجھیں مرکزی حکومت کے خیالات آپ تک پہنچادوں۔

اگر صوبائی حکومتیں اور مقامی نظامتیں اس پالیسی کو جو مندرجہ بالا چٹھی میں واضح کی گئی ہے پوری پابندی اور غیر جانبداری سے نافذ کرے گی تو حکومت پاکستان کو خوشی ہوگی۔ اس پالیسی کا اطلاق ان اخباروں اور رسالوں پر بھی مساوی حیثیت سے ہوگا جو فرقہ وارانہ تحریرات شائع کرنے کے عادی ہیں۔

حکومت پاکستان کو ان قدام پر اطمینان ہے جو پچھلے دنوں حکومت پنجاب نے فرقہ وارانہ شورش کے خلاف کیا ہے۔ ہوم سیکرٹری کا خیال بھی یہی تھا کہ مرکزی حکومت سے استصواب ضروری ہوگیا ہے چنانچہ انہوں نے ۴ر جولائی کو حسب ذیل یادداشت قلم بند کی۔

"(بصیغہ راز)

ا۔ میں احراری احمدی نزاع کے متعلق بنیادی پالیسی کی فائل چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کررہا ہوں کیونکہ میرے نزدیک وقت آگیا ہے کہ بلند سطح پر مرکزی حکومت سے استدعا کی جائے کہ اس مسئلے کے متعلق اپنی پالیسی وضع کرے۔ (بشرطیکہ اب تک وضع نہ کرچکی ہو) اور عمل اور ہدایت سے ہم پر اور اہل ملک پر اسی پالیسی کا اظہار کرے۔

۲۔ بلاشبہ یہ صوبہ احراریوں کا گڑھ ہے اور پاکستان بھر کے صوبوں میں سے اسی صوبے میں احمدیوں کی بڑی سے بڑی تعداد آباد ہے لیکن احراری اپنی سیاسی "بحالی" کی غرض سے مذہب کے پردے میں جس مذہبی دیوانگی اور فلسفہ نفرت کی تلقین و تبلیغ کر رہے ہیں اس کو اگر آج روکا اور ختم نہ کیا گیا تو یہ صورت نہ اس صوبے کے حدود تک اور نہ احراریوں اور احمدیوں تک محدود رہے گی۔ حکومت نے جن تدابیر اس مقصد سے اختیار کی ہیں کہ احراری یا احمدی ایسے حالات پیدا نہ کرنے پائیں جن سے امن و انتظام عامہ خطرے میں پڑ جائے۔ ان تدابیر کے اختیار کرنے سے پہلے پوری طرح غور و خوض کر لیا گیا ہے اور تمام دوسرے طریقے آزمائے جا چکے ہیں جن سے احراریوں کو ان کے طرز عمل سے روکنا مقصود تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس معاملے میں جارحیت کے ذمہ دار احرار ہیں اور اس پورے مناقشے کے بانی مبانی بھی وہی ہیں۔ اب وہ اپنی ناکامی کو محسوس کر رہے ہیں اور انہیں اپنا سیاسی حشر سامنے نظر آ رہا ہے۔ چنانچہ وہ واقعات کو توڑ مروڑ کر اور حکومت کے عزائم و اعمال کے خلاف غلط بیانیاں کر کے مسلمانوں کے جذبات سے فائدہ اٹھانے کی اندھا دھند کوشش کر رہے ہیں۔ عنقریب یہ حقیقت ہر شخص پر واضح ہو جائیگی کہ حکومت صرف احرار کی برپا کی ہوئی شورش کو روکنے کی غرض سے احرار ہی کو لگام دینی چاہتی ہے اور عوام کو کسی جماعت یا گروہ کی جائز سیاسی یا مذہبی سرگرمیوں میں حکومت کی مداخلت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حکومت کی دیانت اور نیک نیتی کسی حمایت کی محتاج نہیں لیکن میرے نزدیک ہمیں مرکزی حکومت سے تعاون کی استدعا کرنے کا حق ہے تا کہ ہمیں اس صوبے کے نظم حکومت کے فرائض کی بجا آوری میں سہولت ہو خصوصاً ایسے معاملات میں جو مرکزی حکومت کے دائرہ عمل کے اندر ہیں۔

۳۔ احرار اب عوام کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے تین نعرے استعمال کر رہے ہیں

(۱) مسئلہ ختم نبوت کی تبلیغ و اشاعت

(۲) احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا اعلان

(۳) چوہدری ظفر اللہ خان کی موقوفی

۴۔ جہاں تک نمبر (۱) کا تعلق ہے مرکزی حکومت ہمیں واضح طور پر بتائے کہ ہمیں کیا راستہ

اختیار کرنا چاہئے۔ اس مطالبے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں جسے احرار اور بعض دوسرے مسلمان رد مرزائیت کہتے ہیں۔ کیا ہمیں ان سرگرمیوں کی اجازت دینی چاہئے یا ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے یا ان سے چشم پوشی کرنی چاہئے جن کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک کے باشندوں کی ایک قلیل سی جماعت کو جسمانی یا مذہبی اعتبار سے نابود کر دیا جائے؟ احمدیوں کی جماعت مسلمہ عقاید پر قائم ہے اور غیر احمدیوں کے عقائد رنگا رنگ ہیں۔ اگر آخر الذکر کو احمدیوں کے خلاف جوش و خروش کے اظہار کی اجازت دی جائے تو کیا احمدیوں کو بھی یہ حق دیا جائے گا کہ وہ منبر اور پلیٹ فارم سے صرف اپنے عقائد کو صحیح اور دوسرے تمام عقائد کو کفر قرار دیں؟ اگر ہم یہ حق جمہور کے کسی ایک طبقے کو دے دیں تو کیا ہم عیسائیوں کو یہ اجازت دینے کے لئے تیار ہوں گے کہ وہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے خیالات کی اشاعت کریں، اور آیا ہم شیعوں کو بعض نامور ترین صحابہ کرام کے متعلق اپنے جذبات کے عام مظاہرے کا موقع دینے پر آمادہ ہوں گے؟ کیا مقصود یہ ہے کہ اس ملک کو متخاصم گروہوں اور مذہبوں کا میدان جنگ بنا دیا جائے تا کہ جو لوگ شکست کھا جائیں وہ یا تباہ ہو جائیں یا مذہب بدلنے پر مجبور کر دیئے جائیں، جس اژدہا کو احرار منظر عام پر لانا چاہتے ہیں اس کو اس کے خروج سے پہلے ہی ہلاک کر دینا چاہئے ورنہ ہماری آزادی اور ہمارے تمام مالوفات و محبوبات کو نگل جائے گا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں مرکز کو ہماری رہنمائی کرنی چاہئے اگر احرار اور دوسرے غیر احمدی کسی مذہبی عقیدے کو احمدیوں سے زبردستی منوانا چاہیں گے تو قانون و انتظام کے مسائل لازماً پیدا ہوں گے اس لئے ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ آیا ہمیں قانون و انتظام کی مصلحتوں کو سب سے زیادہ اہمیت دینی چاہئے یا عوام کی اکثریت کے مذہبی عقائد و جذبات کو ہر حال میں مقدم رکھنا چاہئے۔ ان تمام نکات کے تصفیے اور سوالات کے جواب کی اہلیت انہی لوگوں میں ہے جو ہمارا دستور وضع کر رہے ہیں اور جن کا دائرہ عمل صوبائی حکومت کی طرح محدود نہیں ہے۔

۵۔ احراریوں کا دوسرا منصوبہ یہ ہے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ اس امر کا فیصلہ قطعی طور پر مرکزی حکومت کا کام ہے اور اسے اس میں مزید تاخیر سے کام نہ لینا چاہئے اگر حکومت مرکزی کے ارکان محسوس کرتے ہیں کہ یہ مطالبہ قرین انصاف ہے اور ان اصولوں کے مطابق ہے جو اس ملک

کی آئندہ تقدیر کے متعلق ان کے دماغوں میں موجود ہیں تو ان کو یہ مطالبہ بلا تامل منظور کر لینا چاہئے اوراگراس کے برعکس وہ اس مطالبہ کو بیہودہ سمجھتے ہیں تو انہیں نہایت واضح الفاظ میں ایک مختارانہ بیان جاری کر دینا چاہئے۔ ارکان مرکز کو اس بات کا فیصلہ کرنا چاہئے کہ احرار نے جو آخری دم تک پاکستان کے قیام کی مخالفت کرتے رہے اب پاکستان کو ختم کرنے کے لئے جو دباؤ ڈالنا شروع کیا ہے آیا وہ اس سے مغلوب ہو جائیں گے؟ مرکز کا جو کچھ بھی فیصلہ ہو اس سے حتی الامکان جلد سے جلد ہر شخص کو مطلع کر دینا چاہئے۔

۶۔ احراریوں کا تیسرا مطالبہ بھی ایک ایسا امر ہے جس کے متعلق ارکان مرکز کو اپنا خیال عوام کو بتا دینا چاہئے اگر وہ اب تک عزت مآب وزیر امور خارجہ پر اعتماد رکھتے ہیں (اور مجھے یقین ہے کہ رکھتے ہیں) تو انہیں موصوف کے خلاف بدگوئی کی مہم کو فرو کرنے کے لئے اس حقیقت کا اعلان کرنے میں کون سی چیز مانع ہے؟ اب عوام الناس کا احساس یہ ہے (گو یہ احساس ہرگز حق بجانب نہیں) کہ عزت مآب وزیر خارجہ کے بعض رفقائے کار اس شورش کی پشت پر ہیں ورنہ اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ ان کے خلاف توہین و دشنام کو نہایت بے فکری سے نظر انداز کر رہے ہیں۔

۷۔ اگر چیف منسٹر صاحب میری اس تجویز کو پسند کرتے ہیں کہ مرکزی حکومت کو لکھا جائے تو وہ ازراہ نوازش مناسب الفاظ میں ایک چٹھی عزت مآب وزیر اعظم پاکستان کو لکھیں۔ عزت مآب چیف منسٹر صاحب جناب گورنر صاحب سے بھی پوری صورت حال پر گفتگو کر لیں تو مناسب ہوگا۔

۸۔ میں ان اقدامات کا تذکرہ کر کے اس یادداشت کو زیادہ بوجھل نہیں بنانا چاہتا جو ہم اپنے پروپیگنڈا کو تیز کرنے کے سلسلے میں کر رہے ہیں تا کہ ہم محض کوتاہی کی وجہ سے اپنا مقدمہ نہ ہار جائیں اور عوام کو صحیح اور اصلی واقعات معلوم ہو جائیں۔ ہم حکومت کی اس پالیسی کے مطابق عمل درآمد کی تدبیریں بھی کر رہے ہیں کہ احراری احمدی نزاع صوبے کے قانون و انتظام کے لئے خطرے کا باعث نہ رہے۔ عزت مآب چیف منسٹر صاحب کو زبانی اور دوسرے ذریعوں سے برابر تازہ ترین صورت سے مطلع رکھا جا رہا ہے لیکن میں یہاں اس امر کا تذکرہ کر دینا چاہتا ہوں کہ احراری نہایت چالاکی سے کام لیکر اس ماہ کی ۱۳/ تاریخ کو مسئلہ ختم نبوت پر غور کرنے کے لئے مختلف مذہبی انجمنوں کی

تعلق رکھتا ہے اس لئے مساجد میں ہر قسم کی مداخلت سے پورا پرہیز کرنا ضروری ہے۔ مجھے اس پوزیشن کی منطقی مشکلات کا احساس ہے لیکن خالص اصطلاحی اور قانونی رویے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ اشتعال پیدا ہوگا۔ اس کے علاوہ میں ان جلسوں کی شورش انگیزی کا زیادہ قائل نہیں ہوں جو صرف مساجد میں منعقدہ ہوں۔

میرا خیال ہے کہ اگر صورت حال ایسے ہی غیر یقینی رہی جیسے آج کل ہے تو انسپکٹر جنرل پولیس کو چند روز کے لئے رخصت پر جانا ملتوی کر دینا چاہئے چیف سیکرٹری جا سکتے ہیں لیکن انہیں دورانِ رخصت میں ہر وقت تیار رہنا چاہئے کہ مختصر نوٹس پر کراچی سے واپس آسکیں۔ یہ معاملات کی صورت تھی جب ۱۳ر جولائی ۱۹۵۲ء کو آل مسلم پارٹیز کنونشن کے لئے علما لاہور میں جمع ہوئے۔

جہانگیر پارک میں چوہدری ظفر اللہ خان کی تقریر

کراچی میں اشتہار دیا گیا کہ انجمن احمدیہ، کراچی کا ایک جلسہ ۱۷، ۱۸ر مئی ۱۹۵۲ء کو جہانگیر پارک میں منعقد ہوگا اور اس میں دوسرے مقررین کے علاوہ چوہدری ظفر اللہ خان بھی تقریر کریں گے اگرچہ یہ جلسہ انجمن احمدیہ کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا تھا لیکن یہ جلسہ عام تھا جس میں جمہور کا کوئی فرد بھی تقریریں سننے کے لئے شریک ہوسکتا تھا۔ اس جلسے سے چند روز پہلے خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم نے اس امر کے خلاف اپنی ناپسندی کا اظہار کیا کہ چوہدری ظفر اللہ خان نے ایک فرقہ وار جلسہ عام میں شرکت کا ارادہ کیا ہے لیکن چوہدری ظفر اللہ خان نے خواجہ ناظم الدین سے کہا کہ میں انجمن سے وعدہ کر چکا ہوں اگر چند روز پہلے مجھے یہ مشورہ دیا جاتا تو میں جلسے میں شریک نہ ہوتا۔ لیکن وعدہ کر لینے کے بعد میں اس جلسے میں تقریر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور اگر اس کے باوجود بھی وزیر اعظم اس بات پر مصر ہوں کہ مجھے جلسے میں شامل نہ ہونا چاہئے تو میں اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کو تیار ہوں۔

اس جلسے کے پہلے اجلاس پر عوام کی طرف سے ناراضی کا مظاہرہ کیا گیا اور اجلاس کی کاروائی

میں مداخلت کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں لیکن ۱۸/مئی کو قیام امن کے لئے خاص انتظامات کئے گئے اور چوہدری ظفر اللہ خان نے اس عنوان پر تقریر کی کہ اسلام زندہ مذہب ہے، ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت سے اسلام کی برتری اور ختمیت کے مسئلے پر یہ ایک فاضلانہ تقریر تھی۔ مقرر نے واضح کیا کہ قرآن آخری الہامی کتاب ہے جس میں عالم انسانیت کے لئے آخری ضابطہ حیات مہیا کیا گیا ہے۔ کوئی بعد میں آنے والا ضابطہ اس کو موقوف نہیں کر سکتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں جنہوں نے عالم انسانی کو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام پہنچایا ہے اور اس کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا جو نبی شریعت کا حامل ہو یا قرآنی شریعت کے کسی قانون کو منسوخ کر سکے۔ احمدیوں کے مسلک کے متعلق پوری تقریر میں صرف اتنا اشارہ کیا گیا تھا کہ (رسول اللہ کے) وعدے کے مطابق ایسے اشخاص آتے رہیں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجدید دین پر مامور ہوں گے تاکہ اصلی دین اسلام کی پاکیزگی کو محفوظ کرنے کی غرض سے اس کی اصلاح و تجدید کریں اور اگر اس میں کوئی غلطی فروگزاشت یا بدعت راہ پا گئی ہو تو اس کو دور کر دیں۔ مقرر نے دعویٰ کیا کہ مرزا غلام احمد اسی قسم کے مجدد تھے۔ تقریر کے آخر میں انہوں نے کہا کہ احمدیت ایک ایسا پودا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود لگایا ہے اور اب جڑ پکڑ گیا ہے تاکہ قرآن کے وعدے کی تکمیل میں اسلام کی حفاظت کا ضامن ہو۔ اور اگر یہ پودا اکھیڑ دیا گیا تو اسلام ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے باقی نہ رہے گا بلکہ ایک سوکھے ہوئے درخت کی مانند ہو جائے گا اور دوسرے مذاہب پر اپنی برتری کے ثبوت مہیا نہ کر سکے گا۔

انجمن احمدیہ کے جلسے نے کراچی میں فسادات کو پھوٹ پڑنے کا موقع دے دیا۔ حکام کو پیشتر اطلاع مل چکی تھی کہ جلسے میں ابتری پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ انتظام قائم رکھنے کی ضروری تدابیر کی جا چکی تھیں۔ ۱۷/مئی کو بعض اشخاص نے جلسے میں گڑ بڑ پیدا کرنے کی غرض سے حاضرین پر پتھر پھینکنے شروع کئے پولیس کے پندرہ کانسٹیبلوں کو چوٹیں آئیں۔ لیکن صورت حال پر قابو پا لیا گیا، بلوائی گرفتار کر لئے گئے اور جلسے کی کارروائی جاری رہی۔ بلوائیوں کا ایک گروہ شیزان ہوٹل (جس کے مالک احمدی ہیں) پہنچا اس کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے اور عمارت کو آگ لگا دینے کی کوشش کی۔ شاہنواز موٹرز (جس کے مالک احمدی ہیں) کے شوروم پر اینٹیں برسائی گئیں جن سے

میں مداخلت کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں لیکن ۱۸ مئی کو قیام امن کے لئے خاص انتظامات کئے گئے اور چوہدری ظفر اللہ خان نے اس عنوان پر تقریر کی کہ اسلام زندہ مذہب ہے، ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت سے اسلام کی برتری اور ختمیت کے مسئلے پر یہ ایک فاضلانہ تقریر تھی۔ مقرر نے واضح کیا کہ ن آخری الہامی کتاب ہے جس میں عالم انسانیت کے لئے آخری ضابطہ حیات مہیا کیا گیا ہے۔ کوئی بعد میں آنے والا ضابطہ اس کو موقوف نہیں کر سکتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبین ہیں جنہوں نے عالم انسانی کو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام پہنچایا ہے اور اس کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا جو نبی شریعت کا حامل ہو یا قرآنی شریعت کے کسی قانون کو منسوخ کر سکے۔ احمدیوں کے مسلک کے متعلق پوری تقریر میں صرف اتنا اشارہ کیا گیا تھا کہ (رسول اللہ کے) وعدے کے مطابق ایسے اشخاص آتے رہیں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجدید دین پر مامور ہوں گے تا کہ اصلی دین اسلام کی پاکیزگی کو محفوظ کرنے کی غرض سے اس کی اصلاح وتجدید کریں اور اگر اس میں کوئی غلطی فروگزاشت یا بدعت راہ پا گئی ہو تو اس کو دور کر دیں۔ مقرر نے دعویٰ کیا کہ مرزا غلام احمد اسی قسم کے مجدد تھے۔ تقریر کے آخر میں انہوں نے کہا کہ احمدیت ایک ایسا پودا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود لگایا ہے اور اب جڑ پکڑ گیا ہے تا کہ قرآن کے وعدے کی تکمیل میں اسلام کی حفاظت کا ضامن ہو۔ اور اگر یہ پودا اکھیڑ دیا گیا تو اسلام ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے باقی نہ رہے گا بلکہ ایک سوکھے ہوئے درخت کی مانند ہو جائے گا اور دوسرے مذاہب پر اپنی برتری کے ثبوت مہیا نہ کر سکے گا۔

انجمن احمدیہ کے جلسے نے کراچی میں فسادات کو پھوٹ پڑنے کا موقع دے دیا۔ حکام کو پیشتر اطلاع مل چکی تھی کہ جلسے میں ابتری پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ انتظام قائم رکھنے کی ضروری تدابیر کی جا چکی تھیں۔ ۱۷ مئی کو بعض اشخاص نے جلسے میں گڑبڑ پیدا کرنے کی غرض سے حاضرین پر پتھر پھینکنے شروع کئے پولیس کے پندرہ کانسٹیبلوں کو چوٹیں آئیں۔ لیکن صورت حال پر قابو پا لیا گیا، بلوائی گرفتار کر لئے گئے اور جلسے کی کاروائی جاری رہی۔ بلوائیوں کا ایک گروہ شیزان ہوٹل (جس کے مالک احمدی ہیں) پہنچا اس کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے اور عمارت کو آگ لگا دینے کی کوشش کی۔ شاہنواز موٹرز (جس کے مالک احمدی ہیں) کے شوروم پر اینٹیں برسائی گئیں جن سے

122

ایک نئی موٹر کو نقصان پہنچا۔ بندر روڈ پر احمدیہ لائبریری اور ایک احمدی کی فرنیچر کی دکان کو آگ لگانے کی کوشش بھی کی گئی۔ اس دن ساٹھ آدمی گرفتار کیے گئے۔ ان بلوؤں کے بعد مسٹر اے ٹی نقوی چیف کمشنر نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس میں انہوں نے اپنی انتظامی پالیسی کی تصریح کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے ہر شہری کو مذہبی عقائد کی آزادی حاصل ہے۔ اور اگر آئندہ اس آزادی میں مداخلت کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔

چوہدری ظفر اللہ خان کے فعل پر کراچی اور پنجاب کے مسلمانوں میں شدید ناراضی اور برہمی پھیل گئی اور اس کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ کراچی کے ہفتہ وار اخبار سٹار نے ۲۴ رمئی ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں صفحہ اول پر ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا ''غیر ملکی ہاتھ'' کراچی کا بلوہ کس نے کرایا۔ اشارے کا مطلب یہ تھا کہ یہ بلوہ کسی بیرونی طاقت کی سازش کا نتیجہ ہے۔ لاہور کے بعض احمدی حضرات نے جن میں مسٹر بشیر احمد اور مسٹر صدیقی (برادر نسبتی مرزا بشیر الدین محمود احمد) بھی شامل تھے۔ اپنی نجی بات چیت میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ان واقعات کی ذمہ داری خواجہ ناظم الدین پر ہے۔ مسٹر ذوالقرنین خان سپرنٹنڈنٹ پولیس (A) نے اپنی رپورٹ مؤرخہ ۲۸ رمئی ۱۹۵۲ء میں لکھا کہ کراچی سے آنے والے لوگوں نے جن میں برطانوی مشن کے عبداللہ بٹ بھی شامل ہیں۔ بیان کیا ہے کہ یہ فسادات امریکیوں نے کرائے ہیں کیونکہ چوہدری ظفر اللہ خان برطانیہ کے حامی اور امریکہ کے مخالف ہیں اور ''سٹار'' میں جو مضمون چھپا ہے وہ برطانوی مشن کے ایما پر عبداللہ بٹ نے لکھوایا ہے۔ مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یکم جون ۱۹۵۲ء کو ان افواہوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ احراری لیڈر کچھ مدت سے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ چوہدری ظفر اللہ خان کے خلاف جو شورش برپا کر رہے ہیں اس میں انہیں حکومت اور مسلم لیگ کی بعض اونچی شخصیتوں کی حمایت حاصل ہے اور حکومت نے مضبوط اور مصمم تدابیر اختیار کرنے میں جو تامل کیا اس کی وجہ سے لوگ یقین کرنے لگے کہ اس پرجوش تحریک کی حمایت حکومت کے بعض ممبر کر رہے ہیں۔ مسٹر قربان علی خان نے اس مسئلے پر جو حقیقت پر مبنی رویہ اختیار کیا وہ ان کے ذیل کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

''میں نہیں سمجھتا کوئی بیرونی طاقت پاکستان کو اتنی اہمیت دینے کی ضرورت محسوس

چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ نئے حالات کسی اعتبار سے بھی تسلی بخش نہیں ہیں۔ شعلوں کو ہوا دینے والے اشخاص کی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے خاص تدابیر کی ضرورت ہے اور ایسی سرگرمیاں واضح طور پر دفعہ ۱۵۳ الف تعزیرات پاکستان کے ماتحت آتی ہیں اس چٹھی کے جواب میں چیف سیکرٹری حکومت پنجاب نے اپنی چٹھی مؤرخہ ۴؍جولائی ۱۹۵۲ء میں وزارت داخلہ کو اطلاع دی کہ حکومت پنجاب نے گشتی مراسلت نمبر 6469-84/BDSB جون ۱۹۵۲ء کے ذریعے سے تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو ہدایت کر دی ہے کہ ان تمام جلسوں کو ممنوع قرار دیں جو احراریوں یا احمدیوں کی طرف سے منعقد کئے جائیں۔

کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن

جب ۱۸؍مئی کو جہانگیر پارک میں چوہدری ظفر اللہ خان کی تقریر ہو چکی تو مولانا لال حسین اختر نے تھیوسوفیکل ہال کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کی ایک کانفرنس طلب کی۔ اس کانفرنس کے دعوت ناموں پر اہم مسلم جماعتوں کے ایک (مبینہ) نمائندہ اجتماع کے فیصلے کے مطابق مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا جعفر حسین مجتہد، مولانا محمد یوسف اور مولانا حسین اختر نے دستخط کئے۔ کانفرنس ۲ جون کو لال حسین اختر کے مکان پر منعقد ہوئی اس کانفرنس کی کاروائی ہمارے سامنے پیش نہیں کی گئی لیکن مولانا احتشام الحق کے پیش کردہ کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کانفرنس میں ذیل کے مطالبات کی تشکیل کی گئی:۔

(۱) کہ احمدی ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیے جائیں۔

(۲) کہ چوہدری ظفر اللہ خان وزیر خارجہ کے عہدے سے الگ کر دیئے جائیں۔

(۳) کہ احمدی تمام کلیدی اسامیوں سے ہٹا دیئے جائیں اور

(۴) ان مقاصد کے حصول کی غرض سے آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن طلب کی جائے۔

اس کانفرنس کی صدارت مولانا سید سلیمان ندوی نے کی۔ ایک بورڈ بنایا گیا، جو کنونشن کے

آئندہ اجلاس کے انتظامات کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اس بورڈ کے صدر بھی مولانا سلیمان ندوی قرار پائے۔
جو قراردادیں اس کانفرنس میں منظور ہوئیں ان کی تصدیق کراچی کے ایک جلسہ عام سے کرائی گئی۔

بورڈ کے ممبر حضرات ذیل تھے:۔

(۱) سید سلیمان ندوی صدر تعلیمات اسلامی بورڈ

(۲) مفتی محمد شفیع صاحب ممبر تعلیمات اسلامی بورڈ

(۳) مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی

(۴) علامہ محمد یوسف صاحب کلکتوی

(۵) علامہ مفتی صاحب داد صاحب

(۶) علامہ سلطان احمد صاحب

(۷) علامہ احمد نورانی صاحب

(۸) مولانا لال حسین اختر صاحب

(۹) الحاج ہاشم گزدر صاحب

(۱۰) مولانا جعفر حسین صاحب مجتہد ممبر تعلیمات اسلامی بورڈ

(۱۱) مولانا احتشام الحق صاحب (کنوینر)

۱۳ر جولائی کو مسٹر محمد ہاشم گزدر کے مکان پر بورڈ کا ایک اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ
کنونشن کے لئے دعوت نامے مندرجہ ذیل جماعتوں کے نام جاری کئے جائیں:۔

(۱) جمعیۃ العلمائے پاکستان

(۲) جمعیۃ العلمائے اسلام

(۳) جماعت اسلامی

(۴) تنظیم اہل السنّت والجماعت

(۵) جمعیۃ اہل سنت

(۶) جمعیۃ اہل حدیث

(۷)موتمر اہل حدیث پنجاب

(۸)ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پنجاب

(۹)سفینۃ المسلمین

(۱۰)حزب اللہ مشرقی پاکستان

126

(۱۱)مجلس تحفظ ختم نبوت

(۱۲)مجلس احرار

(۱۳)جمعیۃ الفلاح

(۱۴)جمعیۃ العربیہ

جماعت اسلامی کے جن نمائندوں کے نام دعوت نامے جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، نعیم صدیقی، چوہدری غلام محمد اور سلطان احمد تھے۔ کنونشن کی تاریخیں ۱۶، ۱۷ اگست مقرر کی گئیں لیکن جیسا کہ بعد میں بتایا جائے گا کنونشن حقیقۃً ۱۶ سے ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء تک منعقد ہوئی۔

آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور

چوہدری ظفر اللہ خان کی تقریر کراچی نے واقعات کی رفتار کو تیز کر دیا۔ اور احراریوں نے اس موقع سے جس کا وہ مدت سے انتظار کر رہے تھے انتہائی فائدہ اٹھایا۔ ۳ر جولائی کے زمیندار میں ایک اشتہار شائع ہوا کہ ۱۳ر جولائی کو برکت علی محمڈن ہال میں تمام مذہبی جماعتوں کی ایک کنونشن منعقد ہوگی جس میں علما، خطیب پیر سجادہ نشین اور مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈر اور کارکن شامل ہوں گے تاکہ عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کے لئے ابتدائی لائحہ عمل تیار کر لیا جائے۔ اس جلسے کا دعوت نامہ (فرد شہادت ڈی ای ۳۸) غلام غوث ہزاروی نے جاری کیا جس کے نیچے حسب ذیل اشخاص کے دستخط تھے:۔

(۱) مولانا غلام محمد ترنم صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان پنجاب لاہور (۲) مولانا مفتی محمد حسن

کرے:۔

(۱) مولانا ابوالحسنات محمد احمد (جمعیت العلمائے پاکستان) صدر (۲) مولانا امین احسن اصلاحی (جماعت اسلامی) نائب (۳) ماسٹر تاج الدین انصاری مجلس احرار (۴) شیخ حسام الدین مجلس احرار (۵) مولانا عبدالحلیم قاسمی (جمعیۃ العلمائے اسلام) (۶) مولانا محمد طفیل (جمعیۃ العلمائے اسلام) (۷) مولانا محمد بخش مسلم (جمعیۃ العلمائے پاکستان) (۸) مولانا غلام محمد ترنم (حزب الاحناف) (۹) مولانا غلام دین (۱۰) مولانا داؤد غزنوی (جمعیۃ اہل حدیث) (۱۱) مولانا عطا اللہ حنیف (جمعیۃ اہل حدیث) (۱۲) مولانا نصر اللہ خان (جماعت اسلامی) (۱) حافظ کفایت حسین (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ) (۱۴) مظفر علی شمسی (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ) (۱۵) مولوی نورالحسن بخاری (تنظیم اہل السنّت والجماعت) (۱۶) صاحبزادہ فیض الحسن (انجمن سجادہ نشینانِ پنجاب) (۱۷) مولانا عبدالغفار ہزاروی (انجمن سجادہ نشینانِ پنجاب) (۱۸) علامہ علاؤ الدین صدیقی (نامزد) (۱۹) مولانا اختر علی خان (نامزد) (۲۰) مولانا مرتضیٰ احمد میکش (نامزد)

حکام نے کنونشن کی تاریخ کے اعلان کے بعد لیکن اس کے انعقاد سے پہلے انتظامی پوزیشن پر غور کیا۔ مسٹر قربان علی خان نے ۱۴ر جولائی ۱۹۵۲ء کو اپنی یادداشت میں احراریوں کی نیت کا بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ اور لکھا کہ

”یہ سب حلقوں میں تسلیم کیا جاتا ہے کہ احرار کو کسی نہ کسی سے امداد مل رہی ہے۔ احرار بجائے خود اتنے طاقتور نہیں ہیں کہ اس مطالبہ کو پیش کر سکتے لیکن ان میں سے یا ان کی پشت پناہی کرنے والوں میں سے بعض لوگوں نے اپنی چالاکی کی وجہ سے یہ اندازہ کر رکھا ہے کہ وہ جماعتیں جو مذہبی کہلاتی ہیں ان میں سے کوئی ایسی احمق نہ ہوگی کہ جس مسئلے پر ہر مسلمان احمدیوں کے خلاف شدید ترین جذبات رکھتا ہے اس میں کسی سے پیچھے رہ جائیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر مسلمان اس مسئلے پر اٹھ کھڑا ہوگا۔ احرار جانتے ہیں کہ جس مسلکِ تشدد سے انہوں نے اس شورش کا آغاز کیا تھا اور جس کی وجہ سے حکومت مداخلت پر مجبور ہوئی اسکو عوام کا معقول اور سنجیدہ طبقہ پسند نہیں کرتا۔ احراریوں نے اس امر

کہ اسے فی الحال چھوڑ دیا جائے، آئندہ کسی موقع پر اس کی گوشمالی کر دی جائے گی۔ ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یہ کیس ہوم سیکرٹری کو بھیج دیا اور ان کی توجہ خاص طور پر عبدالستار خاں نیازی کی تقریر کی طرف مبذول کرائی۔ ہوم سیکرٹری نے یہ کیس چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ جنہوں نے ۲۵ر جولائی ۱۹۵۲ء کو اس پر اپنے مختصر دستخط ثبت کر دیئے۔

اخبارات

لاہور میں اہم اخبارات یہ ہیں: ''پاکستان ٹائمز'' ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' ''نوائے وقت'' ''امروز'' ''زمیندار'' ''احسان'' ''مغربی پاکستان'' ''آفاق'' جماعت اسلامی کا اخبار اور احرار کا اخبار ''آزاد''۔ ان میں سے پہلے چار اخباروں نے احمدی غیر احمدی مناقشے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ''تسنیم'' اس مسئلے پر گاہے بگاہے لکھتا تھا۔ باقی پرچوں میں سے ۱۹۵۲ء کے نصف اول میں ''مغربی پاکستان'' نے صرف تین دفعہ اس مسئلے کا ذکر کیا۔ اور ''آفاق'' نے صرف دو دفعہ لکھا لیکن ''آزاد'' اور ''زمیندار'' از سر تا پا اس نزاع میں مصروف تھے اور احمدیوں کے خلاف ان کے عقائد کے خلاف ان لیڈروں اور چوہدری ظفر اللہ خان کے خلاف برابر ایک مسلسل مہم چلا رہے تھے۔

''آفاق'' مسٹر دولتانہ کا اخبار تھا اور ''زمیندار'' ''احسان'' اور ''مغربی پاکستان'' سب حکومت کے امداد یافتہ اخبارات تھے۔ اس امداد اور سرپرستی کی تاریخ اور اس کی تفصیلات بجائے خود ایک نہایت دلچسپ موضوع ہے جس کا ذکر ہم ذیل میں کر رہے ہیں:۔

صوبے کی حکومت نے پنجاب ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی سفارشات پر ۱۹۴۷ء میں تعلیم بالغاں کا ایک نظام رائج کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ صوبے میں ناخواندگی کو کم کیا جائے اس فنڈ کے مقاصد حسب ذیل تھے:۔

(۱) دیہات میں لائبریوں کا قیام (۲) ریڈیو اور فلموں کا استعمال (۳) موزوں قسم کا لٹریچر

''آفاق'' مسٹر دولتانہ کا اخبار تھا اور ''زمیندار'' ''احسان'' اور ''مغربی پاکستان'' سب حکومت کے امداد یافتہ اخبارات تھے۔ اس امداد اور سرپرستی کی تاریخ اور اس کی تفصیلات بجائے خود ایک نہایت دلچسپ موضوع ہے جس کا ذکر ہم ذیل میں کر رہے ہیں:۔

صوبے کی حکومت نے پنجاب ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی سفارشات پر ۱۹۴۷ء میں تعلیم بالغاں کا ایک نظام رائج کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ صوبے میں ناخواندگی کو کم کیا جائے اس فنڈ کے مقاصد حسب ذیل تھے:۔

(۱) دیہات میں لائبریوں کا قیام (۲) ریڈیو اور فلموں کا استعمال (۳) موزوں قسم کا لٹریچر مہیا کرنا اور (۴) خواندگی کے مرکز قائم کرنا جن کو کل وقت اور جزوی وقت پڑھانے والے مدرسین اور سوشل ورکر جاری رکھیں۔

یہ نظام سررشتہ تعلیم کے سپرد تھا اور اس کے لئے ۵۰۔۱۹۴۹ء میں دو لاکھ پچیس ہزار ۵۱۔۱۹۵۰ء میں دس لاکھ ۵۲۔۱۹۵۱ء میں چھ لاکھ اور ۵۳۔۱۹۵۲ء میں بھی چھ لاکھ روپے کی رقوم منظور کی گئیں۔

۱۸ رمئی ۱۹۵۱ء کو میر نور احمد ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ نے چیف سیکرٹری کی خدمت میں ایک تجویز پیش کی کہ مختلف اداروں مثلاً ہسپتالوں، جیلوں اور کالجوں کیلئے موزوں اخباروں کے پرچے خریدے جائیں اور اس مقصد کیلئے پچاس ہزار روپے کی رقم منظور کی جائے۔ تجویز پیش کرتے ہوئے میر نور احمد نے لکھا:۔

''اگر چیف منسٹر صاحب اور وزیر تعلیم میری رائے سے اتفاق کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اس سکیم کے اخراجات کی منظوری سررشتہ (محکمہ) تعلیم کی گرانٹ سے دے دی جائے کیونکہ نشر و اشاعت کے مقاصد کے علاوہ اس سکیم کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ پنجاب کے جیلوں، تعلیمی محکموں، تعلیم بالغاں کے مرکزوں وغیرہ میں مطالعہ کا ایسا مواد مہیا کیا جائے جو تعلیم بالغاں کے لئے ذریعہ امداد ثابت ہو۔ اگر اس سکیم کے مصارف کو شعبہ تعلیم کی مد سے ادا کرنا قبول ہو تو ضروری ہوگا کہ یہ رقم میری تحویل میں دے دی جائے''۔

رقم بیالیس ہزار دی گئی جب یہ ہفتہ وار سے روزنامہ ہونے والا تھا یا ابھی ہو چکا تھا۔ میر نور احمد کا بیٹا میر اقبال احمد اس اخبار میں منیجر اشتہارات تھا وہ برابر کسی نہ کسی حیثیت میں اس اخبار کے عملے میں شامل رہا اور اب اس کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہے۔ خود مسٹر دولتانہ نے اس اخبار کو پانچ ہزار روپے کی رقم پیش کی جو انہوں نے لائل پور کے بعض مسلم لیگیوں سے جمع کی تھی۔ اس رقم سے بالآخر میر اقبال احمد نے اس اخبار کے کچھ حصے خرید لئے جب ان اخباروں کو یہ معقول مالی عطیات دیئے گئے جو ان کی اہمیت کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ تھے تو ۱۹۵۲ء کے موسم گرما میں دنیائے صحافت میں ان کا بڑا چرچا ہوا کیونکہ ان اخباروں نے حکومت سے امداد و اعانت پانے کے باوجود اس مکروہ تنازعہ میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا اور لوگوں کو یہ شبہ لاحق ہو گیا کہ حکومت خود ان اخباروں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے کہ وہ فرقہ وار نفرت پھیلانے میں اپنی قوتیں صرف کریں۔ اگرچہ ''آفاق'' نے اپنی اشاعت مؤرخہ یکم جون ۱۹۵۲ء میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ ہر قسم کی فرقہ پرستی کا مخالف ہے لیکن ۴ رجولائی ۱۹۵۲ء کے پرچے میں یعنی حکومت کے عطیے کی پہلی قسط وصول ہونے پر اس نے یہ لکھ دیا کہ وہ قادیانی مسئلہ کی طرف خاص توجہ کریگا اور خاص مضامین شائع کر کے یہ بتائے گا کہ قادیانی پاکستان کے استحکام کے لئے ایک خطرہ ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر پہلا مضمون ۵ رجولائی ۱۹۵۲ء کو شائع کیا گیا اور اس اشاعت کے ایک پرچے کے ساتھ ایک منسلکہ سلپ سے یہ معلوم ہوا کہ اس اشاعت کی کاپیاں مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرنے والوں کو مفت تقسیم کی گئیں، اس مضمون میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ قادیانی فرقہ اسلامی فرقہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک مرزا غلام احمد کی نبوت پر ایمان لانا لازمی اور بنیادی عقیدہ ہے اور اس کے خلاف عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا کہ قادیانی ایک بالکل علیحدہ قوم ہیں، انہوں نے اپنی علیحدہ حکومت قائم کر رکھی ہے ان کی اپنی عدالتیں اپنی پولیس اور اپنے مجسٹریٹ ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کے تمام محکموں پر قابو پالیں۔ قادیانیوں کو ایک علیحدہ قوم ثابت کرنے کی کوشش کے بعد اس مضمون میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ تمام مسلم جماعتوں کو اس مسئلے پر جمع ہو جانا چاہئے اور ایک لائحہ عمل تیار کرنا چاہئے جس سے اس قوم کو

تصریحی اعلان کا خیر مقدم کیا گیا تھا جس کے ذریعے سے حکومت نے دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت احکام کے نفاذ کی وجوہ واضح کی تھیں اور مساجد میں عام جلسوں پر ان احکام کے اطلاق کی بھی صراحت کر دی تھی۔ اس بیان میں یہ بھی لکھا تھا کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ حکومت پنجاب سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور اس مطالبہ کو خلاف ورزی قانون کے بغیر آئینی طریق سے پیش کرنا چاہیے۔ اسی اشاعت میں ایک اور بیان مولانا ابوالحسنات کی طرف سے شائع کیا گیا جنہوں نے حکومت پنجاب کے سرکاری اعلان کا خیر مقدم کیا تھا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا تھا کہ میں کسی جماعت کو اس امر کی اجازت نہ دونگا کہ اپنے سیاسی مقاصد کیلئے مذہب کو استعمال کرے اور جو لوگ خلاف ورزی قانون کی حمایت کریں گے ان کو میرا تعاون حاصل نہ ہوگا۔ مولانا نے بدنظمی، لاقانونی اور اشتعال انگیز تقریروں کی سخت مخالف کی اور کہا کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ پر امن اور آئین پسندانہ طریق ہی سے پیش کر کے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس پرچے میں ایک مراسلہ بھی درج تھا جس میں ختم نبوت کی تحریک کے متعلق اس اخبار کی خدمات کو سراہا گیا تھا اور اس خیال کا اعادہ کیا تھا کہ یہ شورش آئین کے مطابق جاری رکھنی چاہیئے اور قانون شکنی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ ۱۱ر جولائی کے پرچے میں مولانا غلام مرشد کا یہ خیال شائع کیا گیا کہ قادیانیوں کے متعلق اعلان کرنا پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا کام ہے۔ ۱۳ر جولائی کی اشاعت میں ان تقریروں کی رپورٹیں شائع کی گئیں جو بروز جمعہ لاہور کی چالیس مسجدوں میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے متعلق کی گئی تھیں۔

اس وقت تک وہ علماء لاہور پہنچ چکے تھے جنہیں ۱۳ر جولائی کی کانفرنس میں شریک ہونا تھا اور ''آفاق'' نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۴ جولائی میں ان علماء میں سے بعض کا یہ خیال شائع کیا کہ غالباً اس کانفرنس میں یہی قرارداد کی منظور کی جائے گی کہ احمدیوں کے متعلق مطالبات پر آئینی طریق سے زور دیا جائے۔

۱۵ر جولائی کی اشاعت میں دو خاص اہمیت کے مضمون شائع کیے گئے جن میں سے ایک میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کی کاروائی درج کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ احراری کنونشن کی پوری کاروائی پر حاوی رہے اور کنونشن میں جو پندرہ قراردادیں منظور ہوئیں ان میں سے بعض کا مقصد احرار کے سیاسی

مقاصد کی تکمیل کے سوا کچھ نہ تھا۔ دوسرے مضمون میں بعض قراردادوں پر تنقید کی گئی اور بتایا گیا کہ اس تحریک کو اپنے بعض رہنماؤں کی حماقت اور خود غرضی سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض ناکام سیاست دان اور پاکستان کے پرانے مخالف صرف اپنے مقاصد کی تکمیل میں کوشاں ہیں اور علمائے دین کی مقدس قباؤں کے سائے میں اپنے کھوئے ہوئے سیاسی اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس مضمون میں یہ بھی لکھا گیا کہ تحفظ ختم نبوت کو اپنے ذاتی یا سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرنا جرم ہے اور سیاسی منافقت ہے۔ اسی سلسلے میں بعض علماء کے اعلانات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ وہ سیاسی اغراض کے لئے مذہب کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دینگے۔ اس مضمون میں مطالبات کی تائید کی گئی لیکن یہ بھی بتایا گیا کہ بعض قراردادوں سے ایک بدنام سیاسی جماعت کو اہمیت دینا اور بدنظمی پیدا کرنا مقصود ہے۔ ایک قرارداد میں دفعہ ۱۴۴ کے احکام کے نفاذ کو مداخلت فی الدین قرار دیا گیا تھا اور ایک قرارداد کا منشا یہ تھا کہ احرار لیڈروں کے خلاف ان احکام کی خلاف ورزی کی بنا پر جو مقدمات دائر ہیں وہ واپس لے لئے جائیں۔ اس مضمون میں یہ ظاہر کیا گیا کہ ان قراردادوں سے احرار کو ضرور مقبولیت حاصل ہوگی۔ ایک اور قرارداد کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا جس میں گجرات کے مقام پر لاٹھی چارج کی مذمت کی گئی۔ ایک اور قرارداد میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ۱۸ رجولائی کو ''یوم مطالبات'' منایا جائے۔ اس پر بھی مضمون میں سخت نکتہ چینی کی گئی اور کہا گیا کہ ''یوم مطالبہ'' منانے کا کوئی موقع نہیں کیونکہ یہ مطالبات دستور ساز اسمبلی کے دائرہ اختیار میں ہیں اور قرارداد میں جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے اس سے حکومت اور رہنمایانِ تحریک کے درمیان تصادم کا امکان ہے۔

''مغربی پاکستان'' نے اپنی اشاعت مؤرخہ جولائی میں ''مبصر'' کی طرف سے ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا ''ختم نبوت اور تحریک مرزائیت''۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ قادیانی کافر ہیں اور ان کا سوشل مقاطعہ کرنا چاہئے۔

''آزاد'' احراریوں کا اخبار ہے جس کے ایڈیٹر ماسٹر تاج الدین انصاری ہیں۔ اس اخبار نے اپنے آغاز ہی سے اپنے کالموں میں احمدیوں اور ان کے عقائد اور ان کے لیڈروں کے خلاف

نہایت بازاری، ناشائستہ اور زہریلی مہم جاری کر رکھی تھی۔ چونکہ حکومت پنجاب نے اس کی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے کوئی اقدام نہ اٹھایا تھا اس لئے مرکزی حکومت نے اپنی چٹھی نمبر 4/1/51-Poll-1+ مؤرخہ ۲۳/ئی ۱۹۵۲ء میں اس اخبار کے مضامین کے تراشے منسلک کر کے ان کی طرف حکومت پنجاب کی توجہ مبذول کرائی اور پوچھا کہ آیا وہ ان مضامین کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ڈائریکٹر تعلقات عامہ نے حکم دیا کہ اس اخبار کے ان مضامین اور ان سے پہلے شائع ہونیوالے مضامین کا جائزہ لیا جائے۔ جس افسر نے ان مضامین کا جائزہ لیا اس کی رپورٹ یہ تھی کہ ان مضامین میں ایسے حصے موجود ہیں جو شر انگیز ہیں اور جن میں احمدیوں کے خلاف بدگوئی اور دشنام طرازی کی گئی ہے۔ ڈائریکٹر تعلقات عامہ نے اپنی یادداشت مؤرخہ ۲۲ راگست ۱۹۵۲ء میں لکھا کہ یہ اخبار احمدیوں کے خلاف جو پروپیگنڈا کرتا رہا ہے وہ از سرتا پا نفرت وعناد سے لبریز ہے اور اس کے خلاف زیر دفعہ ۴(۱)(D) پریس (ایمرجنسی پاورز) ایکٹ کاروائی کی جاسکتی ہے لیکن اس کے باوجود ڈائریکٹر نے لکھا کہ میرے نزدیک کوئی کاروائی نہ کرنی چاہئے اور مزید سمجھانے بجھانے اور تنبیہ کرنے کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ ہوم سیکرٹری نے کہا کہ یہ طریقہ اب تک بالکل بے اثر ثابت ہوا ہے۔ لہٰذا کوئی زیادہ موثر طریقہ سوچنا چاہئے لیکن انہوں نے بھی کوئی مؤثر طریقہ تجویز نہ کیا اور اگرچہ چیف منسٹر صاحب ۲۸ راگست کو اس کیس کا معائنہ کر چکے تھے۔ لیکن اس اخبار کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی گئی اور حکومت پنجاب نے اپنی چٹھی ڈی او نمبر 788PR52 مؤرخہ ۳۰ راگست ۱۹۵۲ء میں مرکزی حکومت کو صرف یہ اطلاع دے دی کہ اخبار مذکورہ کو شدید تنبیہ کردی گئی ہے۔

ایک اردو اخبار ''مزدور'' ملتان سے شائع ہوتا ہے جس کا ایڈیٹر سید ابوذر بخاری ہے جو مشہور احراری لیڈر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا بیٹا ہے۔ اس اخبار کی غالب توجہ صرف احمدیوں کے خلاف تحریک پر مرتکز رہی ہے۔ اس نے اپنی اشاعت مؤرخہ ۱۳ رجون ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون شائع کیا۔ جس میں جماعت احمدیہ کے امام کے متعلق عربی خط میں ایک ایسی پست اور بازاری بات لکھی کہ ہماری شائستگی ہمیں اس کی تصریح کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر یہ الفاظ احمدی جماعت کے کسی فرد کے

ہماری شائستگی ہمیں اس کی تصریح کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر یہ الفاظ احمدی جماعت کے کسی فرد کے

سامنے کہے جاتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ کسی کی کھوپڑی توڑ دی جاتی تو ہمیں اس پر ذرا بھی تعجب نہ ہوتا جو الفاظ استعمال کئے گئے وہ پرلے درجے کے مکروہ اور مبتذل ذوق کا ثبوت ہیں اور ان میں اس مقدس ہستی کی نہایت گستاخانہ تضحیک کی گئی ہے جو قرآن مجید اور نبی کریم صلعم کی زبان ہے۔ اس مضمون کو بھی ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ نے پڑھا اور صرف یہی فیصلہ کیا کہ اخبار کو تنبیہ کر دی جائے۔ تین دن بعد اس اخبار نے اپنی اشاعت مؤرخہ ۱۶ر جون ۱۹۵۲ء میں مرکزی حکومت کو گالیاں دیں۔ اگرچہ اس موقع پر اس اخبار سے تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی لیکن چیف منسٹر نے ایک دفعہ کی عرض معروض پر ضمانت کا حکم منسوخ کر دیا۔

محکمہ اسلامیات

۱۴ر مئی ۱۹۵۱ء کو ایک اجلاس ہوا۔ جس میں چیف منسٹر، چیف سیکرٹری، فنانس سیکرٹری اور ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں قرار پایا کہ ایک محکمہ "اسلامیات" قائم کیا جائے چھ علما کا ایک بورڈ مرتب کیا گیا اور چیف سیکرٹری اس محکمے کے حاکم اعلیٰ قرار پائے۔ اس کی نگرانی اور مصارف کا انتظام ڈائریکٹر تعلقات عامہ کے سپرد کیا گیا اور مولوی ابراہیم علی چشتی چھ سو پچاس روپے ماہانہ پر ڈپٹی سیکرٹری مقرر کئے گئے۔ اس محکمے کے حقیقی اخراجات ۱۹۵۲ء میں ۴۹۸۱۵ روپے اور ۵۳-۱۹۵۲ء میں ۱۰۵،۴۳۵ روپے ہوئے۔ ستمبر ۱۹۵۱ء سے لیکر فروری ۱۹۵۳ء تک بہتر (۷۲) اشخاص کو مختلف اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھنے کے لئے معاوضے پیش کئے گئے۔ ان اشخاص میں سے مولانا ابوالحسنات محمد احمد اور مولانا محمد بخش مسلم نے احمدیوں کے خلاف تحریک میں نمایاں حصہ لیا کیونکہ اول الذکر پنجاب کی مجلس عمل کے صدر اور آخرالذکر ممبر تھے۔ اس محکمے نے اٹھارہ اشخاص کو اس کام پر مقرر کیا کہ سکولوں، کالجوں اور جیلوں میں دینیات پر لیکچر دیا کریں۔ ان میں ذیل کے گیارہ افراد نے تحریک میں نہایت سرگرم حصہ لیا:۔

(۱) مولانا محمد بخش مسلم (۲) مولوی غلام دین (۳) مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادر

(۴) صاحبزادہ فیض الحسن (۵) علامہ علاؤالدین صدیقی (۶) مولانا غلام محمد ترنم (۷) قاضی مرید احمد (۸) حافظ کفایت حسین (۹) پروفیسر عبدالحمید (۱۰) مولانا سلیم اللہ (۱۱) مفتی محمد حسن

ان حضرات میں سے چھ شورش کے سلسلے میں اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار کئے گئے۔ قاضی مرید احمد، پروفیسر عبدالحمید اور مفتی محمد حسن کے سوا باقی سب مجلس عمل کے ممبر تھے جو اس شورش کی سربراہ تھی۔ قاضی مرید احمد مجلس عمل ضلع سرگودھا اور حافظ کفایت حسین مجلس عمل ضلع لاہور کے صدر تھے۔ ممبروں کے بورڈ میں سے مندرجہ ذیل چار اشخاص نے تحریک میں نمایاں حصہ لیا ان میں سے پہلے دو اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار بھی ہوئے۔

(۱) مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری

(۲) مولانا غلام محمد ترنم

(۳) مولانا محمد بخش مسلم

(۴) مفتی محمد حسن

140

حصہ دوم:

141

لاہور کنونشن سے لے کر کراچی اور پنجاب میں علماء کی گرفتاری تک

از ۱۴؍ جولائی ۱۹۵۲ء تا ۲۷؍ فروری ۱۹۵۳ء

دفعہ ۱۴۴ کے احکام واپس لے لئے گئے

سرگودھا میں جو مقدمات احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی بنا پر دائر کئے گئے تھے ان کی پیروی محنت سے کی گئی اور ہم بتا چکے ہیں کہ ان میں سے ایک میں ملزموں کو سزا ہو گئی۔ ایک مقدمہ گوجرانوالہ میں اور دوسرا سرگودھا میں زیر سماعت تھا یہ دونوں بعد میں واپس لے لئے گئے اور جن ملزموں کی مقدمہ سرگودھا میں سزا ہو گئی تھی ان کی رہائی کے احکام صادر کر دیئے گئے۔

ہوم سیکرٹری کی دو یادداشتیں ہیں۔ ایک مؤرخہ ۱۷؍ جولائی ۱۹۵۲ء بر صفحہ ۷ فائل نمبر ۹۹ (2)16 ۔ جلد اول اور دوسری مؤرخہ ۱۸؍ جولائی ۱۹۵۲ء بر صفحہ ۴۶ فائل نمبر 93(2)16 - جلد اول، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ گوجرانوالہ کا مقدمہ واپس لینے کا فیصلہ یقیناً چیف منسٹر کے حکم سے کیا گیا ہوگا اول الذکر یادداشت کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اجلاس منعقدہ ۱۵؍ جولائی ۱۹۵۲ء کے فیصلے کے مطابق میں نے منسلکہ لاسلکی پیغام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گوجرانوالہ کو بھیجا۔ وہ کل مجھ سے ملے۔ میں نے ان کو بتایا کہ احرار کے دو

بڑے سرغنے یعنی ماسٹر تاج الدین اور شیخ حسام الدین چونکہ مقدمہ سرگودھا میں سزایاب ہو چکے ہیں اس لئے حکومت نے گوجرانوالہ کے مقدمہ کو واپس لینے کا فیصلہ کیا ہے۔انہوں نے گوجرانوالہ واپس پہنچنے پر کل یا آج یہ مقدمہ ضرور واپس لے لیا ہوگا۔

دوسری یاداشت کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:۔

''گوجرانوالہ کا مقدمہ کل واپس لے لیا گیا میں نے چیف منسٹر صاحب کے ساتھ گفتگو کے فوراً بعد ۱۵ر تاریخ کو ڈپٹی کمشنر کو بلا بھیجا تھا جب وہ ۱۶ر کو مجھ سے ملنے آئے تو میں نے حکومت کا فیصلہ ان کو بتا دیا تھا''

اگرچہ مسٹر دولتانہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ مقدمے کی واپسی کا فیصلہ انہوں نے کیا تھا لیکن مذکورہ بالا دو یادداشتوں میں سے یہ بالکل واضح ہے کہ مقدمے کی واپسی کا فیصلہ حکام کے اس اجلاس میں کیا گیا تھا جس میں چیف منسٹر موجود تھے۔ایک تو بڑی عجلت کے ساتھ مقدمے کی واپسی کا فیصلہ ڈپٹی کمشنر تک پہنچایا گیا اور پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ اتنا اہم فیصلہ کوئی افسر بھی اپنی ذمہ داری پر نہیں کرسکتا تھا۔ان دو باتوں سے یہ بالکل واضح ہے کہ مقدمہ واپس لینے کا فیصلہ چیف منسٹر صاحب نے خود ہی کیا تھا۔ فائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۲ء کو ہوم سیکرٹری نے دفتر ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ کو ایک لاسلکی پیغام بھیجا جس میں ان سے کہا کہ وہ دوسرے ہی دن ہوم سیکرٹری سے ملیں۔ ڈپٹی کمشنر نے آکر ۱۶ر جولائی کو ہوم سیکرٹری سے ملاقات کی جنھوں نے ان کو بتایا کہ حکومت نے اس مقدمے کو واپس لینے کا فیصلہ کیا ہے ان سب واقعات سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مقدمہ چیف منسٹر کے حکم سے واپس لیا گیا۔

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ مولانا اختر علی خاں اور مولوی غلام غوث سرحدی (مجلس احرار کے نئے صدر) نے ۵ر جولائی ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی سے ملاقات کرکے ان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اگر وہ لوگ جو احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی بنا پر گرفتار کئے گئے ہیں رہا کر دیئے جائیں اور احکام زیر دفعہ ۱۴۴ واپس لے لئے جائیں تو احرار من حیث الجماعت ایک اعلان عام کر دینگے کہ وہ آئندہ ایسی تقریریں نہیں کرینگے جن سے صوبے کے امن وسکون میں خلل پڑنے کا احتمال ہو۔ یہ

پیشکش بعد میں چیف منسٹر کے سامنے دہرائی گئی۔ جس پر چیف منسٹر نے ڈائرکٹر تعلقاتِ عامہ کو ہدایت کی کہ احراری لیڈروں سے مل کر معلوم کریں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ میر نور احمد نے چیف منسٹر کو اطلاع دی کہ احراری لیڈر حکومت کے ساتھ تصادم سے بچنے اور اپنی تحریک کو آئینی طریقے سے جاری رکھنے کے خواہشمند ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض احراری لیڈر ۱۹؍جولائی کو چیف منسٹر سے ملے اور ایک ایسا اعلان عام شائع کرنے پر رضامند ہوگئے جس میں یہ یقین دلایا جائے کہ وہ لاقانونی اور تشدد کو روا نہ رکھیں گے اور قانون شکنی نہیں کرینگے۔ دوسری طرف چیف منسٹر نے کہا کہ اگر اس قسم کا اعلان شائع کر دیا گیا تو وہ اس مسئلے پر ہمدردانہ غور کرینگے کہ احرار کے جلسوں پر زیر دفعہ ۱۴۴ جو پابندی عائد کی گئی ہے وہ اٹھالی جائے اور ان کے سزایاب لیڈروں کو رہا کر دیا جائے۔ اس گفت وشنید کے مطابق ''آفاق'' مؤرخہ ۲۱؍جولائی ۱۹۵۲ء میں امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری، مولوی محمد علی جالندھری ناظم اعلیٰ مجلس احرار، صاحبزادہ فیض الحسن ممبر مجلس عاملہ احرار اور مولانا محمد حسین غازی سالار اعلیٰ جیوش احرار اسلام کی طرف سے ایک بیان شائع کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ احرار نے احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دلانے اور چوہدری ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ سے برطرف کرانے کی جدوجہد کے دوران میں اب تک کوئی خلاف قانون حرکت نہیں کی اور وہ آئندہ بھی ایسا کوئی اقدام کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے جس سے تشدد بدنظمی اور قانون شکنی کا خطرہ پیدا ہونے کا احتمال ہو، وہ حکومت پنجاب کو اپنی حکومت سمجھتے ہیں اور اس حکومت پر قانون وانتظام کے قیام کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ احرار کی اپنی ذمہ داری ہے جس کو پورا کرنے میں وہ حکومت سے مکمل تعاون کرینگے۔ یہ احرار کا نہ صرف شہری بلکہ مذہبی فرض ہے کہ بلا امتیاز مذہب وملت پاکستان کے تمام شہریوں کی جان مال آبرو اور آزادی کی حفاظت کریں۔ اس بیان کے شائع ہونے پر چیف منسٹر نے ۲۲؍جولائی ۱۹۵۲ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں مندرجہ ذیل بیان شائع کرایا۔

> ''مجلس احرار پنجاب کے لیڈروں نے اپنی پالیسی کے متعلق ایک تازہ اعلان کیا ہے جس میں یقین دلایا ہے کہ وہ قانون وانتظام کے قیام میں میری حکومت کے ساتھ مکمل تعاون کرینگے۔ میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں''

گئے تھے کہ احراریوں کو جمہور سے منقطع کر دیا جائے اور ان کے خلاف جو کیس قابل دست اندازی پولیس اور نا قابل ضمانت قرار دیئے جا چکے ہیں ان کی پیروی زور وشور سے کی جائے وہ فیصلے بھی بیکار ہو گئے۔ ۵ر جولائی کے فیصلوں کے ماتحت مساجد کے اندر گرفتاریاں کرنے یا مساجد کے اندر اور باہر جلسوں کو منتشر کرنے کے متعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے اختیارات محدود کر دیئے گئے تھے اور ۲۱ر جولائی کے فیصلے سے گویا سرکاری طور پر یہ پوزیشن تسلیم کر لی گئی کہ احراری احمدیوں پر حملہ کرنے ان کا مال لوٹنے اور ان کی بے آبروئی کرنے سے محترز رہیں تو ان کو پوری آزادی ہے کہ اپنے مطالبات کو مقبول عام بنانے کے لئے جو چاہیں کریں اور احمدیوں کے خلاف اور ان کے رہنماؤں اور عقیدوں کے خلاف جتنی شدت سے چاہیں تقریریں کرتے رہیں۔اس کے بعد یہ سوال ہی باقی نہ رہا کہ نفرت کے اس سیلاب کو جو احمدیوں کے خلاف جاری ہے روکا جائے یا اس طوفان کے انسداد کے لئے کوئی تدبیر اختیار کی جائے۔

145

شہادت میں اس تاریخ کے متعلق کسی قدر اختلاف ہے جس پر احراریوں نے وہ اقرار کیا تھا جو ۲۱ر جولائی کے اخباروں میں شائع ہوا۔ مسٹر دولتانہ کا بیان ہے کہ احراریوں کا ایک وفد مولوی محمد علی جالندھری کی سرکردگی میں غالباً ۱۸ر جولائی کو مسٹر دولتانہ کے دفتر میں ان سے ملا جب کہ بعض حکام بھی موجود تھے؟ لیکن ایک سوال سے جو مسٹر یعقوب علی نے میر نور احمد سے کیا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وفد نے چیف منسٹر سے ۱۹ر جولائی کو ملاقات کی تھی۔ جب حکومت اور ارکانِ وفد کے درمیان سمجھوتا ہو چکا ہے تو ایک موزوں مسودہ تیار کرنے کا مسئلہ سامنے آیا۔ میر نور احمد اور مسٹر ابراہیم علی چشتی کا بیان ہے کہ انہوں نے احراری رہنماؤں سے گفتگو کر کے سمجھوتے کا مسودہ تیار کیا۔ جو بعد میں اخبارات میں شائع کیا گیا۔ مولانا محمد بخش مسلم کا بیان ہے کہ اس کانفرنس میں مولانا ابوالحسنات، سید عطا اللہ شاہ بخاری صاحبزادہ فیض الحسن مولانا غلام محمد ترنم اور خود مولانا محمد بخش مسلم شامل تھے اور یہ کانفرنس ملتان میں گولی چلنے کے بعد یعنی ۱۹ر جولائی کو یا اس کے بعد ہوئی تھی۔ یہ کانفرنس بادامی باغ کے ایک کارخانے کے احاطے میں منعقد ہوئی تھی چونکہ نہ چیف منسٹر سے لیڈروں کی ملاقات کا اور نہ اس کے بعد ہونے والی کانفرنس کا کوئی ریکارڈ محفوظ ہے اور مسٹر دولتانہ بھی تاریخ کے متعلق متعین نہیں ہے۔

اس لئے ہم مولانا محمد بخش مسلم کے اس بیان کو تسلیم کر لینے پر مائل ہیں کہ میر نور احمد اور مولوی ابراہیم علی چشتی کی ملاقات لیڈروں کے ساتھ ملتان فائرنگ کے بعد ہوئی۔ یہ نہ صرف اغلب ہے بلکہ اس کی تصدیق حکومت پنجاب کی اس چٹھی سے بھی ہوتی ہے جو کُپ کے واقعہ کے متعلق وزیراعظم پاکستان کے استفسار پر یہاں سے بھیجی گئی تھی چونکہ احرار کے ساتھ تصفیہ کا اعلان واقعہ کُپ کے بعد ہوا تھا اس لئے اس کا مطلب یہی تھا کہ حکومت ہر قیمت پر احرار سے سمجھوتا کرنے کی خواہش مند ہے۔

کُپ کا واقعہ

اس مقام پر کُپ کا مختصر حال بیان کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ حکام ضلع کا عام خیال یہ تھا کہ گو دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت عام جلسے اور جلوس ممنوع ہیں لیکن ان کو منتشر کرنے کی اجازت نہیں۔ تاہم ملتان کے تھانہ کُپ کے ایک سب انسپکٹر پولیس نے یہ محسوس کیا کہ احکام کا نفاذ اور پھر ان کی مسلسل خلاف ورزی نہایت لغو بات ہے۔ چنانچہ اس نے ۱۸ جولائی کو ملتان میں ایک جلسہ عام اور جلوس کو بزور منتشر کر دیا۔ اس پر عام احساس یہ ہوا کہ یہ سب انسپکٹر نہایت گستاخ اور بے ادب ہے اور اس نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے اگلے دن پانچ ہزار انسانوں کے غضبناک ہجوم نے تھانہ کُپ کو گھیر لیا اور اس گستاخ افسر کے تبادلہ کا مطالبہ کیا۔ جو اعلیٰ حکام اس وقت موجود تھے انہوں نے ہجوم کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تھانے کا جنگلہ ہجوم کے بوجھ سے ٹوٹ گیا اور یہ مجمع تھانے کے احاطے کے اندر داخل ہو گیا۔ پندرہ پیدل کانسٹیبلوں کا ایک دستہ مداخلت بیجا کرنے والے مجمع پر لاٹھی چارج کرنے کے لئے باہر نکلا۔ لیکن اس پر اینٹوں کی بوچھاڑ برسا دی گئی اور وہ واپس ہو گیا۔ اس کے بعد کسی نے عمارت کو آگ لگا دینے کی کوشش کی جس پر پولیس نے گولی چلا دی۔ تین ہلاک اور تیرہ زخمی ہوئے۔ اور ان زخمیوں میں سے تین ہسپتال میں فوت ہو گئے۔

ملتان فائرنگ کے خلاف احتجاج اور مقتول و مجروح لوگوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لئے

متعدد مقامات پر جلسے منعقد ہوئے اور بالآخر ہائیکورٹ کے ایک جج صاحب نے اس واقعہ کی تحقیقات کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ گولی چلانا بجق جانب تھا، اگر چہ مقتول و مجروح اشخاص ایک مجمع خلاف قانون کے شرکا اور قانون ملکی کی رو سے مجرم تھے۔ لیکن وہ بہت سے جلسوں میں علی الاعلان شہدا قرار دیئے گئے اور احرار نے اشتہار دیا کہ ۲۰ راگست ۱۹۵۲ء کو ملتان میں ایک جلسہ ہوگا جس میں شہداء کا چہلم منایا جائے گا۔ ڈی آئی جی، سی آئی ڈی نے تجویز پیش کی کہ یہ جلسہ ممنوع قرار دیا جائے لیکن چیف منسٹر صاحب نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور صرف اس امر پر رضا مند ہوئے کہ احراریوں کو ایک تنبیہ کر دی جائے۔ تجویز کی گئی کہ تنبیہ کرنے کے بعد حکومت کو ایک پریس نوٹ شائع کرنا چاہیئے، لیکن اس کو بھی چیف منسٹر نے منظور نہ کیا۔ پھر جب ہوم سیکرٹری نے دریافت کیا کہ احراری لیڈروں کو ایک عام تنبیہ کر دی جائے تو چیف منسٹر نے جواب دیا کہ حکومت کو اس مرحلے پر کسی عام تنبیہ کے متعلق کوئی فکر نہ کرنی چاہیئے۔

147

مسلم لیگ

اب مسلم لیگ بھی علی الاعلان مطالبات کی حمایت کرنے لگی اور بہت سے پوسٹر اور دستی اشتہارات جن پر لیگ کے ممبروں اور عہدہ داروں کے دستخط ثبت تھے لاہور، لائل پور، جھنگ اور شیخوپورہ کے اضلاع میں شائع ہوئے۔ احرار ختم نبوت کے متعلق جو جلسے منعقد کرتے تھے ان کی صدارت بھی مسلم لیگیوں نے شروع کر دی تھی۔

پنجاب صوبہ مسلم لیگ کے صدر صاحب کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ لیگ کے ممبر دوسری سیاسی جماعتوں کے جلسوں کی صدارت کر رہے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اس بارے میں مسلم لیگ کی پالیسی کو معین کرنا ضروری سمجھا اور یکم اپریل ۱۹۵۲ء کو ذیل کا بیان جاری کیا:۔

> ’’مجھے معلوم ہوا ہے کہ صوبے کے اندر بعض مقامات پر مسلم لیگ کے ممتاز ارکان نے جن میں بعض ضلعی مسلم لیگیوں کے صدر بھی شامل ہیں احرار کی کانفرنسوں کی صدارت کی ہے۔ میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دوسری انجمنوں کی کانفرنسوں کی صدارت

کرنا مسلم لیگ کے نظم وضبط کی خلاف ورزی ہے لہٰذا میں ہدایت کرتا ہوں کہ آئندہ مسلم لیگ کا کوئی ممبر مسلم لیگ کے سوا کسی دوسری جماعت کے منعقد کئے ہوئے جلسوں کی صدارت نہ کرے۔ بلاشبہ اس میں ان تقریبات میں شرکت شامل نہیں ہے جن کی نوعیت خالص مجلسی یا غیر سیاسی ہو لیکن سیاسی کی تعریف ڈھیلی ڈھالی نہیں بلکہ کڑی ہونی چاہیے۔ یہ قطعی طور پر ضروری ہے کہ مسلم لیگ کے ممبر کسی ایسی سرگرمی میں حصہ نہ لیں جس سے پاکستان کے شہریوں کے درمیان منافرت و مخالفت پیدا ہونے کا احتمال ہو یا جس میں پاکستانی شہریوں کے بعض خاص طبقوں یا گروہوں کو دشنام و ملامت کا نشانہ بنایا جائے۔

148

اس بیان کی بنیاد پر ۳/اپریل ۱۹۵۲ء کو ایک گشتی مراسلہ تمام ضلعی اور شہری مسلم لیگیوں کے نام بھیجا گیا۔ جس میں مسلم لیگ کے ممبروں کو غیر مسلم لیگی جلسوں کی صدارت سے منع کیا گیا۔ (مجلسی اور غیر سیاسی جلسے اس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے) اور اس امر پر زور دیا گیا کہ مسلم لیگیوں کو ایسی سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہ لینا چاہیے جن سے پاکستانی شہریوں کے مختلف طبقات کے درمیان بیگانگی یا عداوت پیدا ہونے کا احتمال ہو یا جن کا رخ پاکستانی رعایا کے کسی خاص گروہ یا طبقے کے خلاف ہو۔

لیکن اس ہدایت کے باوجود اضلاع اور شہروں میں مسلم لیگ کی شاخیں اس تحریک کی معاون بننے لگیں، جو نہایت سرعت سے پھیل رہی تھی۔ اس سے پیشتر بتایا جا چکا ہے کہ سرگودھا اور گوجرانوالہ میں بعض اشخاص کے خلاف احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی اور مساجد میں احراریوں کے منعقد کردہ جلسوں میں شرکت کے الزام میں مقدمات دائر تھے۔ ۱۷/جولائی ۱۹۵۲ء کو سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ نے ایک جلسہ منعقد کر کے ذیل کی قراردادیں منظور کیں:۔

(۱) کہ عقیدہ ختم نبوت مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہے۔

(۲) کہ سٹی مسلم لیگ اس امر کی سخت مذمت کرتی ہے کہ احکام زیر دفعہ ۱۴۴ کا اطلاق مساجد پر کیا گیا۔ اور اس قسم کے احکام کو نہ صرف غیر ضروری بلکہ عوام کے فرائض مذہبی کی بجا آوری میں مداخلت خیال کرتی ہے اور پر زور مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت ایسے احکام کو واپس لے لے۔

(۳) کہ سٹی مسلم لیگ حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی خلاف ورزی

میں مساجد کے اندر جمع ہونے کی وجہ سے گرفتار کئے گئے ہیں۔

اس سے تین دن بعد یعنی ۲؍جولائی ۱۹۵۲ء کوسٹی مسلم لیگ سرگودھا نے بھی ذیل کی قرار دادیں منظور کیں:۔

(۱) کہ سٹی مسلم لیگ اتفاق آرا سے اس مطالبہ کی تائید کرتی ہے کہ احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

(۲) کہ سٹی مسلم لیگ صوبہ مسلم لیگ اور آل پاکستان مسلم لیگ سے استدعا کرتی ہے کہ وہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں تا کہ ملت میں مزید انتشار پیدا نہ ہو۔

(۳) کہ ان مطالبات کی اہمیت، ان کے متعلق اتفاق آرا، ان کی نازک نوعیت اور ملک کے عام احساس کے پیش نظر مرکزی اور صوبائی مسلم لیگیوں کو اس معاملے میں کچھ عملی قدم اٹھانا چاہیئے۔

سٹی مسلم لیگ کاموںکے نے بھی اس مطلب کی ایک قرارداد منظور کی کہ چونکہ پنجاب کے علماء نے اتفاق آرا سے احمدیوں کو خارج از اسلام قرار دیا ہے۔ اس لئے اب احمدی مسلم لیگ کے ممبر نہیں بن سکتے۔ لہٰذا مسلم لیگ کے احمدی ممبروں کو خارج کر دیا جائے اور آئندہ کوئی احمدی مسلم لیگ کی ممبری کا مستحق نہ سمجھا جائے۔ مسٹر دولتانہ صدر پنجاب مسلم لیگ نے ایک بیان دیا جو ''آفاق'' مؤرخہ ۱۸؍جولائی میں شائع ہوا اس بیان میں آپ نے لیگ کے ممبروں سے اپیل کی کہ وہ ان مذہبی اور سیاسی مسائل کے حل میں لیگ کی امداد کریں جو مسئلہ ختم نبوت کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ نے مسلم لیگیوں کو صبر وسکون کی تلقین کی تا کہ صوبہ لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل میں ان مسئلوں پر غور کر سکے کیونکہ یہی وہ منتظمات ہیں جو صوبہ لیگ کے آئندہ اجلاس میں جمہور کی صحیح رہنمائی کر سکتی ہیں۔ یہ اجلاس ۲۶، ۲۷؍جولائی کو منعقد ہو گا۔

پنجاب صوبہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ ۲۸؍جون ۱۹۵۲ء میں فیصلہ کیا گیا کہ لیگ کا آئندہ اجلاس ۲۶، ۲۷ جولائی ۱۹۵۲ء کو، لاہور میں کیا جائے۔ یکم جولائی ۱۹۵۲ء کو اس مطلب

کے لئے ایک عارضی ایجنڈا مرتب کر لیا گیا لیکن اس میں مسئلہ ختم نبوت شامل نہ تھا۔ یہ ایجنڈا کونسل کے تمام ممبروں کے نام بھیج کر ان سے استدعا کی گئی کہ جو قراردادیں وہ پیش کرنا چاہیں، ۱۵ر جولائی تک ارسال کردیں چنانچہ مندرجہ ذیل قراردادیں لیگ کے جائنٹ سیکرٹری کو وصول ہوئیں۔

1- قرارداد مؤرخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۵۲ء محرک قاضی مرید احمد ایم ایل اے کونسلر پنجاب مسلم لیگ موید صاحبزادہ محمود شاہ گجراتی کونسلر پنجاب مسلم لیگ۔

کہ پنجاب مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ مرزائی ایک علیحدہ غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ جلد از جلد پنجاب اسمبلی میں ایک قرارداد منظور کرے جس میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کیا گیا ہو کہ مرزائی ایک علیحدہ غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں۔

2- قرارداد، مؤرخہ ۱۴ جولائی ۱۹۵۲ء محرک صاحبزادہ سید محمود شاہ گجراتی کونسلر پنجاب مسلم لیگ موید قاضی مرید احمد کونسلر پنجاب مسلم لیگ کہ

پنجاب صوبہ مسلم لیگ کے اس اجلاس کو شبہ ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان مملکت کے وفادار نہیں ہیں اور یہ اجلاس یقین کرتا ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان نے وزیر خارجہ کے عہدے سے فائدہ اٹھا کر عقیدہ مرزائیت کی تبلیغ کی ہے اور سرکاری عہدوں پر مرزائیوں کو مقرر کیا ہے اس جلسے کی رائے میں کشمیر کے مسئلے کے حل میں ہماری ناکامی کا باعث صرف چوہدری ظفر اللہ خان کی ناقابلیت ہی نہیں بلکہ برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ ان کی اور ان کی جماعت کی روایتی وفاداری بھی اس ناکامی کی ذمہ دار ہے۔ لہٰذا پاکستان، ممالک اسلامی اور کشمیر کے مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان کو حتی الامکان جلد سے جلد ان کے عہدے سے برطرف کردیا جائے۔

3- قرارداد۔ مؤرخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۲ء محرک:۔ محمد اسلام الدین ایم ایل اے وہاڑی ضلع ملتان کہ

چونکہ مرزائی پیغمبر اسلام صلعم کی خاتمیت پر یقین نہیں رکھتے، بلکہ اس کے برعکس اس خاتمیت

صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں صاحب صدر نے اعلان کیا کہ میں نے اور دوسرے عہدیداروں نے ۱۵؍ جولائی تک وصول ہونے والی قراردادوں کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کونسل میں صرف آٹھ قراردادیں پیش کی جائیں گی۔ کمیٹی نے اس کو قبول کیا اور منظور قرار دادوں کی فہرست میں نمبر ۳ ''قرارداد ختم نبوت'' کے متعلق فیصلہ کیا کہ اس کو سید مصطفیٰ شاہ خالد گیلانی پیش کرینگے۔

کونسل کا دوسرا اجلاس ۲۷؍ جولائی کو آٹھ بجے صبح شروع ہوا جس میں ذیل کی قرارداد آٹھ ووٹوں کے مقابلے میں ۲۸۴ ووٹوں کی اکثریت سے منظور ہوئی۔

''پنجاب مسلم لیگ کونسل اس صداقت کا پورا شعور رکھتی ہے کہ ختم نبوت دین اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے جس نے مسلمانانِ عالم کو ایک روحانی اخوت کے رشتے میں جکڑ رکھا ہے اور جو پاکستان میں ملت مسلمہ کے اتحاد و سالمیت کی مستحکم بنیاد کا حکم رکھتا ہے۔ اس صداقت کا یہ واضح اور طبعی نتیجہ ہے کہ عقیدہ ختم نبوت کے نہ ماننے والے اسلام کے دینی عقائد سے بنیادی اختلاف رکھتے ہیں۔

اس موقف کی بنیاد پر جس کے متعلق نہ کوئی اختلاف موجود ہے نہ ہوسکتا ہے۔ ایک تجویز پیش کی گئی ہے جو سیاسی اقدام اور دستوری قانون سازی کے دائرے سے تعلق رکھتی ہے کہ احمدی جو ایک دینی مسئلے پر اساسی اختلافی رویہ رکھتے ہیں دستور پاکستان میں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جائیں، کونسل کی رائے میں یہ تجویز کسی حد تک مسلمانوں کے اس ردعمل کو ظاہر کرتی ہے جو احمدیوں کے رویے سے پیدا ہوئے کیونکہ احمدیوں نے نہ صرف مذہبی معاملات میں بلکہ شہری اور مجلسی زندگی میں بھی اکثر علیحدگی کے قوی رجحانات کا اظہار کیا ہے۔

تاہم اس تجویز میں دستوری اور قانونی نوعیت کے بعض سنگین اور اہم امور شامل ہیں جو پاکستان کے شہریوں کے حقوق و فرائض پر اثر انداز ہوں گے اور اس دستوری نظام کی نوعیت کو معین کرینگے جو پاکستان کے لئے تجویز کیا گیا ہے ان امور پر طبعاً پرسکون اور غیر

جانبدارانہ انداز سے نہایت محتاط اور گہرا غور و خوض ضروری ہے جو جذباتیت اور شورش انگیزی سے بالکل غیر متاثر ہو، اس لئے پنجاب مسلم لیگ کونسل کی رائے یہ ہے کہ اس دستوری مسئلے کو پورے اعتماد کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ کے لیڈروں اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبروں کی پختہ اور صائب دانشمندی چھوڑ دیا جائے اور اس اثنا میں مسلم لیگ کی تنظیم کے ہر ممبر کو چاہئے کہ سکون و سنجیدگی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرے کیونکہ ایسی ہی فضا میں بنیادی دستوری پالیسی پر اثر ڈالنے والے فیصلے بوجہ احسن کئے جا سکتے ہیں۔

153

اس کے ساتھ ہی کونسل اس اصول پر اپنے غیر متزلزل ثبات کا اظہار کرتی ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کا نہ صرف جمہوری بلکہ دینی فرض یہ ہے کہ اس مملکت کے ہر شہری کے جان و مال آبرو اور شہری حقوق کی حفاظت بلا امتیاز مسلک و عقیدہ بلکہ اپنے حقوق کی مانند کریں۔ یہ کونسل پنجاب کی مسلم لیگی وزارت سے توقع رکھتی ہے کہ وہ تمام حالات میں اس اصول کی تائید و حمایت کرے گی"۔

اس کے بعد مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ۲۲ راگست کو ہوا جس میں قرار دیا گیا کہ مسلم لیگ کا کوئی ممبر یا عہدہ دار آل مسلم پارٹیز کنونشن کی مجلس عمل کے جلسوں کی صدارت نہیں کرے گا۔

اب مسٹر دولتانہ اس رویے کی تصریح میں مصروف ہو گئے جو صوبہ مسلم لیگ نے اپنی قرارداد مؤرخہ ۲۷ رجولائی ۱۹۵۲ء میں اختیار کیا تھا۔ چنانچہ ۳۰ راگست ۱۹۵۲ء کو حضوری باغ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"آج دنیا بھر میں پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جو اسلامی حکومت قائم کرنے کا دعویدار ہے۔ تمام دنیا ہمارے اس تجربے کو غور سے دیکھ رہی ہے اور اگر ہم اس ذمہ داری کی تکمیل میں ناکام رہ گئے تو دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ دنیا میں حکومت کی اسلامی ہیئت کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ ختم نبوت کے مسئلے میں میرا وہی عقیدہ ہے جو ایک مسلمان کا ہونا چاہئے میرے نزدیک وہ تمام لوگ خارج از اسلام ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہیں مانتے ہیں، اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ عقیدہ ختم نبوت پر کوئی

بحث اٹھانا کفر کے مترادف ہے کیونکہ بحث کی گنجائش صرف اس مسئلے میں ممکن ہے جس میں کسی قسم کا شبہ وارد ہوتا ہو۔ عقیدہ ختم نبوت ہمارے ایمان کا جزو ہے اس لئے ہر بحث اور ہر منطق سے بالاتر ہے۔ مرزائیوں کے خلاف جو نفرت پیدا کی گئی ہے اس کی ذمہ داری خود انہی پر ہے۔ کیونکہ ان کے رجحانات علیحدگی پسندانہ ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ہم سے علیحدہ ہیں اور انہوں نے اپنی ذاتی سیاسی اور مجلسی سرگرمیوں کو صرف اپنی جماعت تک محدود کر رکھا ہے۔ قادیانی افسر اپنی جماعت کے آدمیوں کی طرفداری کے مجرم ہیں کیونکہ انہوں نے بہت سی الاٹمنٹیں محض اس بنیاد پر کی ہیں کہ الاٹی مرزائی تھا گویا انہوں نے اپنی سرکاری حیثیت کا ناجائز استعمال کیا۔

154

اس صورت حال کا علاج جذباتی تقریروں اور عام جلسوں سے نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے میں فرقہ وارانہ وجوہ کی بنا پر جانبداری کے مجرموں کے خلاف شدید کاروائی کرونگا اور جہاں اس قسم کی کوئی شکایت کی جائے گی اس کی پوری تحقیقات کراؤنگا، میں آپ لوگوں سے احکام اسلام کا واسطہ دے کر اور ملت کی آبرو کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ ہر اس شخص کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کیجئے جو اپنے آپ کو پاکستانی شہری کہتا ہے۔ جب تک میں چیف منسٹر ہوں میں اپنے صوبے میں بے گناہوں کا خون گرانا ہرگز برداشت نہ کرونگا۔ ہر شہری کی آبرو کے تحفظ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا اور ہر قیمت پر اپنا یہ دینی اخلاقی اور سرکاری فرض بجالاؤنگا۔ مرزائیوں کو اقلیت قرار دینا ایک دستوری مسئلہ ہے۔ ہمارا دستور اب تک وضع نہیں کیا گیا اور دستور ساز اسمبلی نے اب تک اس امر کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ اکثریت اور اقلیتوں کے درمیان کیا فرق و امتیاز ملحوظ رکھا جائیگا لہٰذا اس مسئلے کو دستور ساز اسمبلی پر چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن اگر بحث کی غرض سے یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دے دیا گیا۔ اگر اس کے بعد انہوں نے آپ اپنے آپ کو مرزائی کہنا بند کر دیا تو پوزیشن کیا ہوگی؟ کسی قوم یا گروہ کو اقلیت قرار دینے کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف اس قوم یا گروہ کے حقوق معین کئے جائیں بلکہ ان حقوق کی حفاظت بھی کی

جائے اور ان کو سرکاری ملازمتوں اور قانون ساز اسمبلیوں میں رعایات دی جائیں۔ اگر مرزائی اقلیت قرار دے دیئے تو ہم مجبور ہوں گے کہ ان کو وہ تمام رعایات وحقوق دیں جو بحالت موجودہ ہم انہیں نہیں دینا چاہتے۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر گہرے اور سنجیدہ غوروخوض کی ضرورت ہے یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کو عام جلسے منعقد کرنے، فساد مچانے، پتھر پھینکنے اور اسی قسم کی دوسری ناواجب حرکات سے حل کیا جاسکے۔ میں ان لوگوں سے جو ختم نبوت کی حریک کے سلسلے میں جلسے منعقد کر رہے ہیں یہ سوال کرتا ہوں کہ جس حالت میں ہم سب عقیدہ ختم نبوت پر قائم ہیں ان جلسوں کی کیا ضرورت ہے۔ ان غیر ضروری جلسوں کو دیکھ کر بعض اوقات میرے دل میں جلسے منعقد کرنے والوں کی نیت پر شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

155

''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' مؤرخہ ۱۳ر تمبر ۱۹۵۲ء میں مسٹر دولتانہ کی اس تقریر کی رپورٹ درج ہے۔ جو انہوں نے راولپنڈی میں کی۔ آپ نے کہا:۔

''میں اس ملک کو ایک صحیح اسلامی جمہوریہ بنانا چاہتا ہوں جس میں ہر شخص بلا امتیاز عقائد سیاسی مساوی حقوق رکھتا ہو جس میں ہر چیز کا فیصلہ بہترین عدل وانصاف سے کیا جائے۔ جس میں لوگوں کی اقتصادی اور اخلاقی حالت بہت اچھی ہو اور جس کے لوگ ملک کی مشترکہ بہبود کے حصول کے لئے سنجیدگی، ہوشمندی اور خلوص سے کام کریں۔

میرا پختہ ایمان ہے کہ نبی کریم صلعم آخری نبی ہیں جس شخص کا یہ عقیدہ نہیں وہ مسلمان نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو شخص یہ عقیدہ نہ رکھتا ہو اسے اس ملک میں رہنے کا حق نہیں۔ تمام وہ لوگ جو پاکستان میں رہتے ہیں اور پاکستان کے وفادار ہیں خواہ وہ ہندو ہوں عیسائی ہوں یا کسی اور فرقے یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، اس ملک کی حکومت اور اس ملک کے باشندوں کی حفاظت میں ہیں۔ اہل وطن میں سے ایک ایک فرد کی حفاظت مسلمان کا اور حکومت کا بھی اولین فریضہ ہے جب تک امور حکومت کی عنان میرے ہاتھ میں ہے میں پورا انتظام کرونگا کہ کسی وفادار پاکستانی کو محض اس بنا پر کوئی ضرر نہ پہنچنے پائے کہ اس کا مذہب

اس کی ذات پات یا اس کا مسلک ہم سے جداگانہ ہے۔

احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا مسئلہ کوئی دینی مسئلہ نہیں۔ بلکہ ایک دستوری معاملہ ہے جس کو یہی حیثیت دینی چاہیئے اور اس پر ٹھنڈے دل سے بحث کرنی چاہیئے۔ میں احرار اور دوسری مذہبی انجمنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ اس مسئلے پر غور وخوض کے لئے پرسکون فضا پیدا کریں۔

نظام آباد کے مقام پر ۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو مسٹر دولتانہ نے فرقہ بندی کی مخالفت کی اور کہا کہ جو لوگ مسلمانوں کے درمیان افتراق پیدا کر رہے ہیں وہ نہ صرف اتحاد اسلامی کو بلکہ پاکستان کی سالمیت کو برباد کر رہے ہیں آپ نے عوام کو مشورہ دیا کہ فرقہ پرستوں کی افتراق انگیز سرگرمیوں میں شریک ہونے سے اجتناب کریں۔

156

ان تقریروں میں جن نکات پر زور دیا گیا وہ یہ ہیں کہ جو شخص عقیدہ ختم نبوت پر ایمان نہیں رکھتا، وہ مسلمان نہیں، احمدیوں کے متعلق جو مطالبہ ہے وہ اسی دینی مؤقف کا تقاضا ہے۔ مطالبات کی نوعیت دستوری اور سیاسی ہے جس پر صرف مرکزی اربابِ اختیار (دستوری یا مسلم لیگی) ہی غور کر سکتے ہیں۔ صوبے کو ان مطالبات سے کوئی تعلق نہیں اور احرار کو اس معاملے پر پنجاب میں کوئی گڑبڑ نہ کرنی چاہیئے۔

بعد کے واقعات

جب تمام امتناعی احکام واپس لے لئے گئے۔ ان کی خلاف ورزی کے مقدمات بھی ختم کر دیئے گئے، اس خلاف ورزی کے ماخوذین کی سزائیں بھی معاف کر دی گئیں اور مطالبات کا وجود سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا تو احرار اور ان کے رفقا کو کھلی چھٹی مل گئی کہ وہ اپنے مطالبات پر زور دینے اور ان کی حمایت میں پروپیگنڈا جاری رکھنے کے لئے جن طریقوں کو آئینی سمجھیں ان کو اختیار کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی مہم کو تیز تر کر کے اپنے پروپیگنڈا کی شدت اور وسعت میں اضافہ کر دیا۔ سیکرٹ انٹیلی جنس ایبسٹرکٹ (خلاصۂ اطلاعات خفیہ) ایک سرکاری تحریر

ہے جو چیف منسٹر کو بغرض اطلاع ارسال ہوا کرتی تھی۔ اس تحریر سے معلوم ہوا کہ مارشل لاء کے اعلان مؤرخہ ۶ مارچ سے پہلے صوبے بھر میں ۳۹۰ جلسے منعقد ہوئے۔ جن میں سے ۱۶۷، ایسے تھے جن کا اہتمام خالصۃً احراریوں نے کیا تھا۔ سید مظفر علی شمسی، شیخ حسام الدین، صاحبزادہ فیض الحسن، ماسٹر تاج الدین انصاری اور محمد علی جالندھری نے جو مجلس احرار کے ممتاز ممبر تھے۔ اپنے آپ کو اس تحریک کا دائمی مبلغ بنا دیا۔ گویا احمدیوں کی مخالفت ہی ان کی زندگیوں کا واحد مقصد تھا۔ جلسوں میں احمدیوں کے خلاف ہر قسم کے دلائل دہرائے جاتے تھے اور احمدیوں اور ان کے لیڈروں کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ تقریری مہم کے ساتھ ہی ساتھ پوسٹر اشتہار، کتابچے اخباروں میں مضامین اور جلوس بھی جاری تھے۔ ۲۴ جولائی ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے حکومت کو اطلاع دی کہ صوبے کے مختلف مقامات پر چوہدری ظفر اللہ خان کے جنازے نکالے جا رہے ہیں۔ لہٰذا پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۳ کے ماتحت کاروائی کرنی چاہیئے۔ لیکن ہوم سیکرٹری نے کہا کہ یہ ایکٹ ایسے معاملات میں استعمال نہیں ہوسکتا اور اس کے بجائے یہ تجویز کی کہ چیف منسٹر صاحب احراری لیڈروں سے بات چیت کریں اور انہیں اس وعدے کی پابندی کی طرف متوجہ کریں جو انہوں نے کر رکھا ہے۔ یہ تجویز چیف سیکرٹری کی وساطت سے چیف منسٹر کی خدمت میں پیش کی گئی جس پر انہوں نے ۳۰ جولائی کو اپنے مختصر دستخط ثبت کر دیئے۔

ایم بی ہائی سکول وزیر آباد کے طالب علموں نے ایک جلوس نکالا جس میں ایک چار پائی کے ساتھ کتا بندھا ہوا تھا اور اس کو چوہدری ظفر اللہ خان ظاہر کیا گیا تھا۔

اور ایک جلوس ۲۵ جون ۱۹۵۲ء کو قصور کے بازاروں میں بعد نماز جمعہ نکالا جس کی رپورٹ ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس قصور نے اپنی ڈائری مؤرخہ ۲۶ جولائی ۱۹۵۲ء میں قلمبند کی اور وہ بھی چیف منسٹر صاحب کے علم میں لائی گئی۔ اس جلوس میں جو نعرے لگائے گئے ان میں چوہدری ظفر اللہ خان کو نہایت ذلیل گالیاں دی گئیں۔ مثلاً "ظفر اللہ کنجر، ظفر اللہ کتا، ظفر اللہ سور" اور بعد میں شرکائے جلوس ایک گدھی کو پکڑ لائے جس پر "بیگم ظفر اللہ" لکھا تھا۔ اس گدھی پر ایک آدمی سوار تھا جس کے سر پر ٹاپ ہیٹ اور گلے میں جوتیوں کا ہار تھا اور اس پر مرزا غلام احمد کا نام لکھا تھا۔ جب مسٹر قربان علی

خان کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے لکھا کہ یہ واقعہ شورش کا قدرتی نتیجہ ہے جو قانون کے خلاف جاری ہے۔ ایک لاقانونی حرکت سے دوسری لاقانونی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ اور اگر کوئی انسدادی طریقہ دریافت نہ کیا گیا تو اس کا انجام انقلاب ہوگا اور یہ تاریخ کا وہ سبق ہے جس میں تاخیر تو ہوسکتی ہے لیکن اس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ چیف منسٹر صاحب نے اس کیس کا معائنہ تو کیا لیکن اس واقعہ پر کوئی توجہ نہ کی گئی۔

158 اس دوران میں لاقانونی کے متعدد اور واقعات کی اطلاعات بھی موصول ہوئیں۔ ان سب کا ذکر سرکاری کاغذات میں موجود ہے اور وہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) ۲۰ر جولائی ۱۹۵۲ء کو لائل پور میں ایک احمدی کی دکان پر رائفل چلائی گئی اور احمدیوں کی ایک مسجد پر پتھر پھینکے گئے۔

(۲) ۵ر اگست ۱۹۵۲ء کو مصری شاہ لاہور میں ایک احمدی پر حملہ کیا گیا۔

(۳) چک نمبر ۴۹۷ جھنگ میں احمدیوں اور غیر احمدیوں میں لڑائی ہوگئی۔

(۴) ۲ر ستمبر ۱۹۵۲ء کو ایک جھگڑے کے دوران میں مسماۃ طالع بی بی پر حملہ کیا گیا کیونکہ وہ احمدی عورت تھی۔

(۵) ۱۸ر ستمبر ۱۹۵۲ء کو منڈی جڑانوالہ میں ڈاکٹر محمد حسین خان احمدی پر ایک شخص نے حملہ کیا جو احمدیت کے خلاف ایک کتابچے سے قابل اعتراض اشعار پڑھ رہا تھا اور ڈاکٹر نے اس کو اس حرکت سے روکا تھا۔

(۶) ۱۶ر فروری ۱۹۵۳ء کو جب خواجہ ناظم الدین لاہور آئے تو ہڑتال ہوئی۔ جو لوگ ہڑتال کرنے کے خلاف تھے ان کے منہ کالے کیے گئے۔ دیال سنگھ کالج کا محاصرہ کر کے اس پر خشت باری کی گئی۔ تعلیم الاسلام کالج پر پتھر پھینکے گئے اور اس کا بڑا دروازہ توڑ دیا گیا۔

(۷) ۲۷ر جولائی کو مسلم لیگ کے دفتر کے باہر بلوہ ہوگیا جس میں ۴۶ پولیس کے آدمی زخمی ہوئے اور کاریں توڑ دی گئیں۔

(۸) محلہ اراضی یعقوب سیالکوٹ میں احمدیوں کی ایک مسجد کو آگ لگانے کی کوشش کی گئی۔

اخبارات

اس زمانے میں اخبارات کے ذریعے مسلسل ومتواتر پروپیگنڈا جاری رہا۔"زمیندار" جوان چار اخباروں میں سے ایک تھا جن کی مربی گیری حکومت کر رہی تھی اور جن کو بعض معاملات کے حکومت سے بہت بڑی رقم مل چکی تھی مطالبات کی حمایت اور احمدیت کی مخالفت میں برابر لکھ رہا تھا احراریوں کے اخبار "آزاد" کا بھی یہی حال تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ احمدیوں کی مخالفت اس اخبار کے کالموں کا واضح موضوع تھا۔

159

"آزاد"

اس اخبار کی اشاعت مؤرخہ ۹ رستمبر ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون چھپا جس کا جائزہ لینے پر خیال کیا گیا کہ اخبار کے خلاف مقدمہ چلایا جانا ضروری ہے۔ لیکن ہوم سیکرٹری چیف سیکرٹری اور چیف منسٹر نے یہ رائے دی کہ اخبار کو ایک اور تنبیہ کی جائے اور دیکھا جائے کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔

اس اخبار کی اشاعت مؤرخہ ۱۱ رستمبر ۱۹۵۲ء کا نام "مطالبہ نمبر" تھا۔ یہ پرچہ کاملاً احمدیوں کی مخالفت کے لئے وقف کیا گیا تھا۔ اس میں ایک اہم چیز ایک نظم تھی "ملتان پوچھتا ہے" جس میں ان اشخاص کی مدح سرائی کی گئی تھی جو کپ کے واقعہ میں مارے گئے تھے۔ ڈائریکٹر تعلقات عامہ نے ۱۲ ستمبر ۱۹۵۲ء کو اور لیگل ریممبرنسر نے ۱۷ رستمبر ۱۹۵۲ء کو اس نظم کا جائزہ لیا اور دونوں نے اتفاق کیا کہ اس کے خلاف کارروائی ہونی چاہئے۔ لیکن اس کے متعلق کچھ بھی نہ کیا گیا۔

اس اخبار نے اپنے صفحہ اول پر ایک کارٹون شائع کیا۔ اس کا جائزہ لینے والے افسر نے اس کی حسب ذیل تصریح کی:۔

سرورق پر اس اخبار نے ایک رنگا رنگ کارٹون شائع کیا ہے جس میں جان بل کو ایک سپیرا ظاہر کیا گیا ہے جو احمدیت کی ٹوکری سے سانپ نکال رہا ہے۔ ایک بڑا سانپ اس ٹوکری سے اٹھ کر قادیان پر (جس کو ایک بلند مینار سے ظاہر کیا گیا ہے۔) چھا گیا ہے، وہاں سے وہ ایک سوراخ میں

داخل ہو کر ربوہ میں مرزا بشیر الدین محمود احمد کی صورت میں نمودار ہو گیا ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد کو اپنے منہ سے تین سانپ خارج کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ان سانپوں میں سے ایک تو راولپنڈی میں قائد ملت مرحوم کو ڈس رہا ہے۔ دوسرا ایک ہوائی جہاز کو تباہ کر رہا ہے۔ (جنگ شاہی کے ہوائی حادثے کی طرف اشارہ) اور تیسرا چوہدری ظفر اللہ خان کی شکل میں وزیر اعظم پاکستان کو ڈسنے کے درپے ہے۔

مرکزی حکومت نے اپنی چٹھی نمبر (۱)28/43/52poll مؤرخہ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۵۲ء میں حکومت پنجاب کی توجہ اس کارٹون کی طرف مبذول کرائی۔ اس چٹھی میں لکھا تھا کہ غالباً حکومت پنجاب اس کارٹون کو ملاحظہ کر چکی ہے اور اس کے خلاف مناسب کاروائی کر کے مرکزی حکومت کو اطلاع دے گی۔ اس کے جواب میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ نے اپنا چھٹی نمبر 3754 P.B-52/985- مؤرخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں مرکزی حکومت کو صرف یہ اطلاع دی کہ حکومت صوبہ نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہدایت کی ہے کہ اس اخبار کے پرنٹر پبلشر کو طلب کر کے تنبیہ کر دیں کہ اگر وہ اس قسم کا مواد شائع کرنے سے باز نہ آئیگا تو حکومت اس کے اخبار کو بند کر دے گی۔

اس اخبار نے اپنی اشاعت مؤرخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۵۲ء میں ایک افتتاحیہ شائع کیا جس کا عنوان صرف ایک استفہامی علامت (؟) تھی اس مضمون میں جماعت احمدیہ کے موجودہ امام کو گندی گالیاں دی گئی تھیں اور حکومت پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ کفر وارتداد کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے اس اخبار نے جو الفاظ اس سلسلے میں استعمال کئے۔ وہ ہو بہو درج ذیل ہیں:۔

آخر کب تک ایک زانی وشرابی ایک غنڈے اور بدمعاش مفتری وکاذب اور دجال کو اس ملک میں ہمارے کان نبی مسیح موعود اور احمد ومحمد کے نام سے پکارے جاتے سنتے رہیں گے اور کب تک امت کی مقدس ومطہر ماؤں کو ایک ننگ انسانیت عورت کے لئے اپنی قبروں میں بے چین ہونا پڑے گا اور کب تک انبیاء اولیا کی توہین وتذلیل اور عقائد وشعائر دین کی رسوائی کا تماشائے بے حمیتی جاری رہے گا۔ آخر یہ زندگی بے حیائی و بے غیرتی اور دیوثی کی زندگی نہیں تو اور کیا ہے؟ قوم آج مجسم طور پر ایک سوالیہ نشان بن کر خداوندانِ حکومت اور

قومی ذمہ داروں کا منہ تک رہی ہے لہٰذا ان کا فرض ہے کہ وہ ان کے جانے پہچانے سوال کا جلد از جلد کوئی مفصل و مدلل اور دوٹوک جواب دیں۔ ورنہ سمجھ لیں کہ یہ خاموشی یہ بے اعتنائی و بے نیازی یہ مداہنت و تغافل۔ یہ کفر و ارتداد پروری اور غدار نوازی کا سوچا سمجھا ہوا شرمناک رویہ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکے گا۔

مرکزی حکومت نے اپنی چٹھی مؤرخہ ۲۱ نومبر ۱۹۵۲ء کے ذریعے سے حکومت صوبہ کو اس مضمون کی طرف توجہ دلائی اور اس کے متعلق منٹگمری کی احمدی جماعت کی شکایتی قرارداد بھی بغرض کاروائی منسلک کردی جو مرکزی حکومت کو موصول ہوئی تھی۔ یہ مضمون زیر دفعہ ۱۵۳ الف تعزیرات پاکستان اور زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ قابل اقدام سمجھا گیا لیکن مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یہ عجیب رائے ظاہر کی کہ مرکزی حکومت نے اس بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کی اور حکومت پنجاب کچھ مدت سے مرکزی حکومت کے اس رویے پر اظہار تاسف کر رہی ہے۔ آپ نے کہا کہ مرکزی حکومت کی اس بے پروائی کے پیش نظر حکومت صوبہ کو چاہئے کہ کوئی کاروائی نہ کرے۔ اور میں خود اس اخبار کے ایڈیٹر ماسٹر تاج الدین انصاری سے بات چیت کرونگا۔ ہوم سیکرٹری نے اس رائے سے اتفاق کیا اور چیف منسٹر صاحب نے کیس پر دستخط کر دیئے۔

پھر ۱۰ دسمبر ۱۹۵۲ء کو وزارت داخلہ نے اپنی ڈی او نمبر (ا)44/9/52poll بنام ہوم سیکرٹری حکومت پنجاب میں حکومت پنجاب کو اس اخبار کی سرگرمیوں کی طرف توجہ دلائی، اس چٹھی میں ہوم سیکرٹری کی سابقہ چٹھی ڈی او نمبر 273-ST(HS)52 مؤرخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء اور مسٹر نور احمد کی چٹھی بجواب چٹھی وزارت داخلہ نمبر (ا)28/43/52-Poll ۱۱/ اکتوبر ۱۹۵۲ء کا حوالہ دے کر یہ لکھا گیا کہ حکومت پنجاب کے بیان کے مطابق اس اخبار کو کئی دفعہ تنبیہ کی جا چکی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایسا مواد شائع کر رہا ہے جس سے پاکستانیوں کے ایک طبقے کے مذہبی جذبات کو قطعی طور پر صدمہ پہنچتا ہے اور جس کا مقصد ہی یہ ہے کہ جمہور کے مختلف طبقات کے درمیان دشمنی پیدا ہو۔ ایسی حالت میں مرکزی حکومت کی رائے یہ ہے کہ چونکہ گزشتہ تنبیہات کا کوئی اثر نہیں ہوا لہٰذا حکومت صوبہ دوسرے متبادل طریق کو اختیار کرنے میں تامل نہ کرے یعنی اس اخبار کے خلاف

مقدمہ چلائے، حکومت صوبہ سے یہ بھی التماس کی گئی کہ وہ جلد سے جلد مرکزی حکومت کو اطلاع دے کہ اس بارے میں کیا اقدام کیا گیا ہے۔ اس چٹھی پر بھی کوئی اقدام نہ کیا گیا اور وزارت داخلہ نے اپنی چٹھی نمبر (۱) 44/9/52-Poll مؤرخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۵۲ء میں ہوم سیکرٹری کو دوبارہ یاد دہانی کرائی۔ اس چٹھی میں وزارت وزارت کی سابقہ چٹھی مؤرخہ ۱۰/۱۹۵۲ء کا حوالہ دے کر یہ بتایا گیا تھا کہ چٹھی کے ارسال کے بعد بھی اس اخبار کی اشاعت مؤرخہ ۲۱ ردسمبر ۱۹۵۲ء میں ایک اور قابل اعتراض نظم ''دردمندان قوم'' کے عنوان سے شائع ہوئی جو نہ صرف پریس ایکٹ (ایمرجنسی پاورز) اور پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت بلکہ ملک کے مستقبل قانون فوجداری کے ماتحت بھی قابل اقدام ہے۔ اس چٹھی میں حکومت صوبہ سے دوبارہ التماس کی گئی کہ اس مضمون پر جو کاروائی کی جائے اس سے مرکزی حکومت کو مطلع کیا جائے یہ چٹھی چیف سیکرٹری اور ڈائریکٹر تعلقات عامہ کی نظر سے گزری لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

162

''آفاق''

''آفاق'' مؤرخہ ۱۹ رجولائی میں ''قادیانیوں کے امام کی ایک نہایت افسوس ناک تقریر'' کے عنوان سے امام جماعت احمدیہ کا ایک خطبہ نقل کیا گیا جو ''الفضل'' مؤرخہ ۱۱ رجنوری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ''آفاق'' نے اس خطبے پر مخالفانہ تبصرہ کیا اور ۲۰ جولائی کے پرچے میں صوبے کے مختلف مقامات پر ''یوم مطالبہ'' منانے کی اطلاعات درج کیں۔

اس اخبار نے اپنی اشاعت مؤرخہ ۳۰ جولائی میں ایک افتتاحیہ لکھا جس میں ختم نبوت کے متعلق مسلم لیگ کی قرارداد پر بحث کی۔ اس مضمون میں بتایا گیا کہ صوبہ مسلم لیگ سے ایک مطالبہ یہ کیا گیا ہے کہ مرزائیوں کے خارج از اسلام ہونے کا اعلان کیا جائے۔ مسلم لیگ اس مطالبہ کی صحت کو تسلیم کر چکی ہے اور مسٹر دولتانہ اپنی تقریر میں صاف صاف اعلان کر چکے ہیں کہ مسلم لیگ میں اس معاملے پر اتفاق رائے ہے کہ مرزائی مسلمان نہیں ہیں کیونکہ وہ عقیدہ ختم نبوت کے منکر ہیں۔ اس

مضمون میں اس اعلان کی تعریف کی گئی اور کہا گیا کہ اور کسی ذمہ دار لیڈر نے ایسا واضح اعلان نہیں کیا اوراس معاملے میں پنجاب مسلم لیگ اوراس کے صدر محترم قابل تحسین ہیں۔ مضمون میں تصریح کی گئی کہ مسلم لیگ نے مطالبات کی حمایت کرنے کے باوجود اس موضوع پر کوئی فیصلہ اس لئے نہیں کیا کہ یہ مسئلہ دستوری ہے، جس کا تعلق صرف پنجاب سے نہیں بلکہ پورے پاکستان سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے کا فیصلہ آل پاکستان مسلم لیگ اور دستور ساز اسمبلی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مضمون میں یہ امید ظاہر کی گئی کہ اب پاکستان مسلم لیگ اور دستور ساز اسمبلی قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے میں تامل نہ کرینگی اور قرارداد کے اس حصے کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی جس میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی تھی کہ پاکستان کے تمام شہریوں کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت ان کا مذہبی فریضہ ہے۔

۱۹رجولائی ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں ایک اور مضمون شائع ہوا، جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ آج کل ملک میں جو تشویش انگیز اور خطرناک صورت حال پیدا ہو رہی ہے یہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کی تقریروں اور خطبوں اور احمدیوں کے جارحانہ منصوبوں کی پیداوار ہے۔

۶راگست ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں ''الفضل'' کے قابل اعتراض اقتباسات کا ایک انتخاب شائع کیا گیا جس میں موجودہ امام جماعت احمدیہ کے بعض بیانات شامل تھے۔ یکم ستمبر کے پرچے میں مسٹر دولتانہ کی حضوری باغ والی تقریر درج کی گئی۔

۲۸رفروری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں ایک نامہ نگار اکبر مراد پوری کا ایک مراسلہ شائع ہوا جس میں بعض سوالات اور احمدی تحریروں سے ان کے جوابات شائع کر کے یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ احمدی ایک علیحدہ امت ہیں۔

''احسان''

۲۱رجولائی ۱۹۵۲ء کے ''احسان'' میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کی مجلس عمل کی طرف سے ایک اپیل شائع ہوئی۔ جس میں لوگوں کو تلقین کی گئی تھی کہ احمدیوں کی اشتعال انگیزی کے باوجود پر امن

رہیں اور مساجد کے اماموں سے استدعا کی گئی تھی کہ آئندہ نماز جمعہ کے موقع پر نمازیوں کو ہر قسم کی بدنظمی پیدا کرنے سے اجتناب کی نصیحت کریں۔ اس اپیل میں یہ بتایا گیا تھا کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے اور چوہدری ظفر اللہ خان کو برطرف کرنے کے مطالبات بالکل آئینی ہیں۔ ان پر ایسی فضا میں زور دینا چاہئے جو قانون شکنی سے بالکل پاک ہو۔

۳/اگست ۱۹۵۲ء کے احسان میں ان قراردادوں کی رپورٹ شائع ہوئی جو یکم اگست کو جمعہ کی مختلف مساجد میں منظور کی گئی تھیں ان قراردادوں میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کے موقف کی حمایت کی گئی۔ تحریک کو کاملاً پرامن رکھنے کے عزم کا اظہار کیا گیا اور مطالبات کی تکمیل پر اصرار کیا گیا۔ مساجد میں جو تقریریں کی گئیں ان میں بھی پنجاب مسلم لیگ کی اس قرارداد کی تعریف کی گئی جس میں مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا لیکن قرارداد کے اس حصے کے متعلق بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا جس میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا تھا، اس مضمون میں یہ تشویش انگیز خبر بھی درج کی گئی کہ ایک چٹھی موصول ہوئی جس میں مولانا ابوالحسنات، مولانا مودودی، سید عطا اللہ شاہ بخاری، مولانا احمد علی اور مولانا مسلم کو قتل کی دھمکی دی گئی ہے۔

۸/اگست ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں ''قادیانی نبوت'' کے عنوان سے سید فقیر حسین بخاری ایم اے بی ٹی پروفیسر اسلامیہ کالج کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں احمدیہ عقائد پر نقطہ چینی کی گئی تھی اور وعدہ کیا گیا تھا کہ آئندہ اشاعت میں ایک اور جامع مقالہ درج کیا جائے گا۔

۱۰/اگست ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں جماعت احمدیہ اور چوہدری ظفر اللہ خان کے خلاف ایک نہایت شدت آمیز افتتاحیہ درج کیا گیا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ قادیانی پاکستان کے لئے حقیقی خطرہ ہیں اور وہ ملت مسلمہ کے ممبر نہیں ہیں۔ اس میں یہ خبر بھی درج تھی کہ خواجہ ناظم الدین نے وعدہ کیا ہے کہ وہ یوم پاکستان یعنی ۱۴/اگست کی تقریر میں ان مطالبات کو تسلیم کر لیں گے جو مرزائیوں کے خلاف کئے گئے ہیں اور لوگ اس تاریخی اعلان کا نہایت بیتابی سے انتظار کر رہے ہیں۔

۱۸/اگست ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں وزیراعظم کی تقریر (یوم پاکستان) پر تبصرہ کیا گیا ہے اور

اس امر پر مایوسی کا اظہار کیا گیا کہ وزیراعظم مسئلہ مرزائیت کا ذکر حذف کر گئے حالانکہ یہ مسئلہ پاکستان کے لئے حقیقی داخلی خطرہ بن چکا ہے۔ حکومت پاکستان کے اس سرکاری اعلان کی تعریف کی گئی کہ کوئی مرکزی یا صوبائی وزیر اپنے ماتحتوں میں فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کرنے کا مجاز نہیں۔ ان جلسوں جلسوسوں اور ہنگاموں کی مذمت کی گئی جو مرزائیت کے خلاف جاری ہیں۔ تجویز کی گئی کہ یہ مسئلہ آئینی طریقے سے مجلس دستور ساز پاکستان میں اور ایک قرارداد کی شکل میں آل پاکستان مسلم لیگ کونسل کے آئندہ اجلاس ڈھاکہ میں پیش کرنا چاہیے۔

165

۳۱ر جنوری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں ایک شخص عتیق الرحمٰن چشتی کی کتاب ''قادیانی فتنہ'' پر ریویو شائع کیا گیا، اس ریویو میں بیان کیا گیا کہ مرزائیت کو انگریزوں نے دانستہ پیدا کیا تھا اور اب یہ اسلام کو تباہ کر رہی ہے اور اس کتاب میں ایک مرتد فرقے کی غلط عقائد کی قلعی کھولی گئی ہے اور اس فرقے کے جھوٹے نبی کے چال چلن کی نفرت انگیز تصویر کھینچی گئی ہے۔ اسی طرح ۵ر فروری کی اشاعت میں پروفیسر الیاس برنی کی کتاب ''قادیانی مذہب'' پر ایک کالم کا ریویو درج کیا گیا۔ یہ کتاب درحقیقت قادیانی عقائد پر ایک بلاواسطہ تبصرہ ہے۔

مغربی پاکستان

اس اخبار نے اپنی اشاعت مؤرخہ ۳ر اگست ۱۹۵۲ء میں حکومت پاکستان کی خارجہ حکمت عملی پر تنقید کی اور بتایا کہ چوہدری ظفر اللہ خان کی ذاتی حکمت عملی ہے اور چوہدری ظفر اللہ خاں تنازعہ کشمیر کے سلجھانے میں ناکام رہے ہیں۔ ''سنگ وخشت'' کے عنوان سے اس اخبار نے چوہدری ظفر اللہ خاں کو ازراہِ طعن یہ مشورہ دیا کہ آئندہ جب وہ لاہور آئیں تو پولیس کی حفاظت طلب کرنے کے بجائے حضرت صاحب (امام جماعت احمدیہ) سے کہیں کہ وہ ان کی سلامتی کی دعا مانگیں۔ پھر ۱۰ر اگست کی اشاعت میں چوہدری ظفر اللہ خاں کے استعفےٰ کی خبر پر طنزیہ اشارے کئے گئے کہ انہوں نے غالباً پیغمبر زادے (امام جماعت احمدیہ) کے مشورے کے بعد استعفاد یا ہو کیونکہ انہوں نے اپنی

وزارت کے دوران میں جو کچھ کیا ہے ہمیشہ اپنے امام جماعت کے مشورے کے بعد کیا ہے۔ اسی اشاعت میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کا ایک بیان شائع کیا گیا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ کنونشن کی مساعی بارآور ہو رہی ہے اور اپیل کی گئی تھی کہ تبلیغ کانفرنسوں کے انعقاد وفود کی ترسیل اور سرمائے کی فراہمی کے ذریعے وسیع پروپیگنڈا کر کے اس کی تائید وحمایت کی جائے۔ اس اشاعت میں زیر اہتمام مجلس عمل ایک جلسہ کا اعلان بھی کیا گیا۔ جس میں مقررین کے نام درج کئے گئے اور لوگوں سے [166] گئی کہ وہ جوق در جوق اس جلسے میں شامل ہوں۔

اشاعت مؤرخہ ۱۵ راگست ۱۹۵۲ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی یہ رائے درج کی گئی کہ مرزا غلام احمد نبوت کا دعویٰ کرنے کی وجہ سے مرتد ہے۔

۱۸ راگست کی اشاعت میں حکومت پاکستان کے سرکاری اعلان مؤرخہ ۱۴ اگست پر تبصرہ کیا گیا اور کہا گیا کہ حکومت نے احمدیوں کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات کو غلط سمجھا ہے۔ مسلمانوں کو اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خان اپنے ماتحتوں کو قادیانی مذہب میں شامل کرنے کی کوشش کرینگے۔ بلکہ ان کی برطرفی کے مطالبہ کی یہ وجوہ ہیں۔ اول:۔ کہ وہ مرزائی ہیں۔ دوم:۔ کہ وہ کاملاً خلیفہ قادیان کے قبضے میں ہیں۔ سوم:۔ کہ وہ پاکستان کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ چہارم:۔ کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے کوئی روابط نہیں ہیں۔

یکم ستمبر کی اشاعت میں مسٹر دولتانہ کی اس تقریر کی رپورٹ درج ہے جو انہوں نے ۳۰ راگست کو حضوری باغ میں کی تھی اور جس میں دوسرے امور کے علاوہ انہوں نے عقیدہ ختم نبوت کے متعلق یہ اعلان کیا تھا کہ ان کا اس عقیدے پر ایمان ہے بلکہ ان کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ جو شخص پیغمبر اسلام صلعم کو آخری نبی نہیں مانتا وہ مسلمان نہیں ہے۔

۲۷ رستمبر کی اشاعت میں ایک نظم شائع کی گئی جس میں شاعر نے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ختم نبوت کے پاکیزہ مقاصد کے لئے جدوجہد کرنے کی غرض سے کفر اور دشمن کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں۔

۲۹ رستمبر کی اشاعت میں مجلس عمل کے بعض ارکان اور چیف منسٹر کی ایک ملاقات کا حال

درج کیا گیا جس کے دوران میں وفد مجلس نے مولانا ابوالحسنات کی سرکردگی میں ایک تحریری عرضداشت پیش کی تھی جس میں یہ شکایات مندرج تھیں کہ ربوہ کی زمین مرزائیوں کے ہاتھ فروخت کی گئی ہے۔ مرزائیوں کے حق میں اندھا دھند الاٹمنٹیں کی گئی ہیں، مرزائیوں کی تبلیغی سرگرمیاں قابل اعتراض ہیں، ان کا لٹریچر اشتعال انگیز ہے اور وہ اسلام کی وہ خاص اصطلاحات اپنے لئے استعمال کررہے ہیں جواب تک صرف اسلام کی بعض مخصوص مقدس ہستیوں کے لئے مخصوص رہی ہیں۔

167

مسٹر دولتانہ نے دعویٰ کیا ہے کہ جولائی کے قریباً تیسرے ہفتے سے ''آفاق'' ''احسان'' اور ''مغربی پاکستان'' نے جن سے ہر ایک کو حکومت سے بڑی بڑی رقمیں وصول ہوئی تھیں، احمدیوں کے خلاف شورش کی کوئی خبر نہیں چھاپی، لیکن جو کچھ ہم نے اب تک لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تینوں اخبار اس عرصے میں برابر اس موضوع پر لکھتے رہے۔ جب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وزیر اطلاعات ونشریات جولائی ۱۹۵۲ء کے نصف آخر میں لاہور آئے تو ان سے شکایت کی گئی کہ حکومت پنجاب خود احمدیوں کے خلاف شورش کی حوصلہ افزائی کررہی ہے اور مسٹر حمید نظامی ایڈیٹر ''نوائے وقت'' نے کھلم کھلا میر نور احمد ڈائریکٹر تعلقات عامہ پر اس سازش میں شریک ہونے کا الزام عائد کیا۔ مسٹر نظامی کا بیان ہے کہ جب ڈاکٹر قریشی جولائی یا اگست میں لاہور آئے تو انہوں نے بعض مقامی اخباروں کے ایڈیٹروں کو ایک پرائیویٹ چائے پر دعوت دی جس میں بعض افسر جن میں میر نور احمد بھی شامل تھے اور لاہور کے کے تمام اہم روزناموں کے ایڈیٹر بھی شریک ہوئے۔ اس پارٹی میں احمدیوں کے خلاف شورش پر گفتگو ہوئی اور ڈاکٹر قریشی نے کہا کہ چوہدری ظفراللہ خان کے خلاف جو مہم اخبارات میں جاری ہے وہ ملک کے مفاد کے لئے مضرت رساں ہے اور اس سے سنگین نتائج کا احتمال ہے۔ پارٹی میں جو مہمان شریک تھے انہوں نے اس معاملے کے متعلق اپنی آرا کا اظہار کیا۔ مسٹر حمید نظامی خاموش رہے۔ ڈاکٹر قریشی نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنی رائے کیوں ظاہر نہیں کرتے۔ مسٹر نظامی نے جواب دیا کہ میری کوئی رائے ظاہر کرنا بالکل بے کار ہے، کیونکہ یہ مہم ان اخباروں نے جاری کر رکھی ہے جن کو حکومت سے مالی امداد مل رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اپنا مطلب واضح طور پر بیان کیجئے۔ اس پر مسٹر نظامی نے کہا کہ یہ پوری شورش حکومت کے ایما سے

ہو رہی ہے اور اگر حکومت چاہے تو یہ شورش ایک لمحے کے اندر بند ہو سکتی ہے کیونکہ جو اخبارات اس مہم میں مصروف ہیں وہ حکومت کی ہدایت کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں کر سکتے، ڈاکٹر قریشی نے کہا میں نے اس قسم کی افواہیں پہلے بھی سنی ہیں لیکن مجھے اس سلسلے میں حقائق میسر نہیں ہو سکے۔ مسٹر حمید نظامی نے اس پر میر نور احمد کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس معاملے میں سب سے بڑے مجرم یہ ہیں کیونکہ یہی اس تحریک کے متعلق تمام مضامین لکھوا رہے ہیں۔ ڈاکٹر قریشی نے مسٹر حمید نظامی سے پوچھا کہ آپ اپنے اس بیان کا کوئی ثبوت مہیا کر سکتے ہیں۔ مسٹر نظامی نے کہا۔ کہ اگر میر نور احمد میرے الزام کی صحت سے انکار کر دیں تو میں ثبوت مہیا کر دونگا۔ میر نور احمد نے یہ سب کچھ سنا اور خاموش رہے۔ ڈاکٹر قریشی نے حمید نظامی سے پوچھا کہ آیا آپ اس الزام کو وزیر اعظم پاکستان کے سامنے دہرانے پر آمادہ ہیں۔ مسٹر نظامی نے کہا کہ میں بالکل آمادہ ہوں اس کے ایک ماہ بعد مسٹر نظامی کراچی گئے اور وزیر اعظم سے ملے۔ وزیر اعظم نے ان سے پوچھا۔ آیا آپ ان مضامین کی فہرست مہیا کرنے کو تیار ہیں جو میر نور احمد نے لکھوائے تھے۔ مسٹر نظامی نے کہا کہ میں آئندہ کراچی آؤنگا، تو فہرست پیش کر دونگا۔ جب مسٹر نظامی ایک ماہ بعد دوبارہ کراچی گئے تو اپنے ساتھ ان مضامین کی ایک فائل لیتے گئے جو ان کے نزدیک میر نور احمد نے لکھوائے تھے۔ مسٹر نظامی نے یہ فائل مسٹر مشتاق احمد گورمانی کے حوالے کر دی تا کہ وہ وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کر دیں۔ جب اس کے بعد ایک موقع پر ہوم سیکرٹری نے مسٹر نظامی کو طلب کیا تو انہوں نے ہوم سیکرٹری کے سامنے بھی اس الزام کا اعادہ کیا۔ ایک یا دو دن بعد انہوں نے مسٹر قربان علی خان کے سامنے بھی یہی الزام دہرایا اور یہ بھی کہا کہ اگر حالات بدستور جاری رہے تو صوبہ بالکل تباہ ہو جائے گا، جب ہوم سیکرٹری نے ۲۸ فروری کو اخباروں کے ایڈیٹروں کا ایک اجلاس طلب کیا تو مسٹر نظامی نے دوبارہ یہی شکایت ہوم سیکرٹری سے بیان کر دی۔ مسٹر نظامی نے گورنر صاحب کے سامنے بھی اپنے الزام کا اعادہ کیا۔

مسٹر حمید نظامی نے اس موضوع پر ستمبر ۱۹۵۲ء میں مسٹر دولتانہ سے بھی بات چیت کی۔ مسٹر دولتانہ نے کہا کہ میر نور احمد حکومت کو تباہ کر رہا ہے اور میں چند ہی روز میں اس کو برطرف کرنے والا ہوں۔ لیکن مسٹر نظامی نے جواب دیا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے اور میں مسٹر دولتانہ کے بیان پر یقین نہیں

168

کرتا۔ کیونکہ میر نور احمد جو کچھ کر رہے ہیں خود مسٹر دولتانہ ہی کے ایما پر کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر قریشی کی شہادت سے مسٹر نظامی کی شہادت کی پوری تائید ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ میں جولائی ۱۹۵۲ء کے نصف آخر میں لاہور آیا۔ کیونکہ مجھے یہاں الیکشن پٹیشن کی سماعت کی غرض سے دستور ساز اسمبلی کی کریڈنشل کمیٹی کے ایک اجلاس میں شامل ہونا تھا۔ وزیر اطلاعات و نشریات کی حیثیت سے میرا معمول ہے کہ غیر رسمی طور پر اخباروں کے ایڈیٹروں سے ضرور ملاقات کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ ایک ملاقاتی نے مجھ سے بیان کیا کہ ڈائریکٹر تعلقات عامہ اخباروں کو ایسے مضامین مہیا کرتے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ احمدیوں کے خلاف شورش کی آگ کو ہوا دی جائے۔ ملاقاتی نے یہ بھی کہا کہ میں کسی اخبار کے دفتر سے ایک مضمون لا کر آپ کو دوں گا جو مسٹر چشتی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہوگا جو محکمہ تعلقات عامہ کے ایک ملازم ہیں اس سے ثابت ہو جائے گا کہ حکومت خود اخباروں کو مضامین مہیا کرتی رہی ہے۔ مجھے اخلاقی طور پر تو اس اطلاع کی صداقت پر پورا یقین تھا لیکن میں نے سوچا کہ میرے لئے یہ زیبا نہ ہوگا کہ اپنے اطلاع دہندہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کروں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے لئے کسی اخبار کے دفتر سے کاغذات چوری کر کے لائے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد میر نور احمد مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے میر نور احمد سے کہا کہ محکمہ اسلامیات جو ان کے ماتحت کام کر رہا ہے اخباروں کو احمدیوں کے خلاف مضامین مہیا کرتا رہا ہے اور اس کے بعد میں نے یہ حقیقت بھی ان کے سامنے پیش کر دی کہ ”آفاق“ جو عملاً ڈائریکٹر تعلقات عامہ کے ماتحت ہے اپنے کالموں میں برابر اس مطالبہ پر زور دے رہا ہے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ میر نور نے سوال کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اصرار کیا۔ اور بالآخر میر نور احمد نے اعتراف کیا کہ میں نے اس شورش کو خاص راستوں پر لگانے کی کوشش ضرور کی ہے۔ اس پر میں نے میر نور احمد سے کہا کہ یہ راستے پر لگانا نہیں بلکہ بھڑکانا ہے چونکہ یہ ایک سنگین معاملہ تھا اس لئے میں نے سوچا کہ اس کا ذکر مسٹر دولتانہ سے کرنا چاہئے۔ مسٹر دولتانہ نے ۱۹ر جولائی کو مجھے چائے پر بلایا۔ میں نے مسٹر دولتانہ سے اس شکایت کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر صوبائی حکومت نے ایک خاص طرز عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو نشر و اشاعت کی سابقہ پالیسی

نے تحریک کو "راستے پر لگانے" کی یقیناً کوشش کی اور مسر دولتانہ نے ان کی اس پالیسی سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے۔

اب شورش کی رفتار سرعت سے تیز ہوگئی اور اس نے تشویش انگیز وسعت اختیار کرلی۔ اب حکومت حملے کا نشانہ بن گئی اور اس کی رشوت ستانی نا قابلیت اور عوام کے حالات سے بے پروائی کے متعلق بالواسطہ اور مبہم اشارات کئے جانے لگے۔ حکومت پنجاب کے ہوم سیکرٹری نے ڈی او نمبر 14682-BD مؤرخہ ۱۲/ اکتوبر ۱۹۵۲ء کے ذریعے موجود صورت حالات کی مندرجہ ذیل کیفیت ڈپٹی سیکرٹری وزارت داخلہ کو ارسال کی:۔

172

"سابقہ یادداشت تیار کردہ ملک حبیب اللہ مؤرخہ ۳۰/ جولائی ۱۹۵۲ء کے تسلسل میں پنجاب کی احراری احمدی شورش کے متعلق یکم اگست ۱۹۵۲ء سے اب تک حالات کے متعلق یادداشت ارسال ہے۔

ا۔ ۲۰/ جولائی کو ملتان میں جو گولی چلائی گئی اس سے احراری شورش پسندوں اور ان کے حامیوں کو مزید موقع مل گیا کہ مسئلہ ختم نبوت پر احمدیوں کے خلاف شورش کو شدید تر کردیں۔ چنانچہ صوبے بھر میں ان کے جلسوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا جب دوسری جماعتوں مثلاً جماعت اسلامی، اسلام لیگ اور فرقہ شیعہ نے دیکھا کہ احرار ختم نبوت کے مسئلے پر رائے عامہ کو اپنے حق میں کر کے ان جماعتوں پر بازی لے جا رہے ہیں تو گزشتہ اگست کے آغاز میں وہ بھی احمدیوں کی مذمت ومخالفت میں ان کے ساتھ دل و جان شامل ہوگئے۔ جماعت اسلامی نے اپنے آٹھ مطالبات پر ایک نویں مطالبہ کو اضافہ کردیا کہ مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے اور چوہدری ظفر اللہ خان کو ان کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔ اسلام لیگ کے کارکنوں نے بھی اپنی تقریروں میں اس پر زور دینا شروع کیا کہ مرزائی علیحدہ اقلیت قرار دیئے جائیں اور چوہدری ظفر اللہ خان کو برطرف کیا جائے۔ شیعہ لیڈر بھی اپنے جلسوں میں یہی کہنے لگے کہ وہ مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے اور چوہدری ظفر اللہ خان کو برطرف کرنے کے مطالبے میں احراریوں کے ہم زبان ہیں

۲۔ شہروں اور قصبوں کی تمام مساجد کے خطیبوں نے اپنا معمول بنالیا کہ جمعہ کے خطبات میں احمدیوں کے خلاف ان مطالبات کا اعادہ کریں کہ مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ چوہدری ظفر اللہ خان کو ان کے عہدے سے برطرف کیا جائے، ربوہ تمام مسلمانوں کے لئے کھلا شہر قرار دیا جائے اور اس کی اراضی مہاجرین میں تقسیم کردی جائے کوئی ایسی اہم مسجد باقی نہ تھی جس میں نماز جمعہ کے موقع پر یہ مطالبات دہرائے نہ جاتے ہوں۔

۳۔ مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین مظفر علی شمسی اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش ۱۶؍اگست کو کراچی میں عزت مآب وزیراعظم کی خدمت میں بصورت وفد حاضر ہوئے اور احمدیوں کے متعلق اپنے مطالبات سے ان کو مطلع کیا۔ واپسی پر انہوں نے ۱۹؍اگست کو ملتان میں اور ۲۳؍اگست کو لاہور میں عام جلسے منعقد کئے۔ جن میں یہ انکشاف کیا کہ وزیراعظم نے ان سے کہا تھا کہ احمدیوں کے خلاف شورش صرف پنجاب تک محدود ہے اور دوسرے صوبے اس سے بالکل پاک ہیں۔ چنانچہ آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل نے فیصلہ کیا کہ مزید سرمایہ فراہم کیا جائے اور احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا صوبہ سرحد سندھ اور مشرقی بنگال میں بھی پھیلا دیا جائے تاکہ مرکزی حکومت کو ان مطالبات کی منظوری پر مجبور کیا جاسکے۔ اس فیصلے کے مطابق ماہ اگست میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور احمدیوں کے خلاف مسلسل تقریریں کیں شورش کی اس گرما گرمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ احمدی بدحواس ہونے لگے اور انہیں اپنا موقف بہت دشوار معلوم ہونے لگا۔ احراری کارکنوں اور ملاؤں نے اپنی تقریروں اور وعظوں میں احمدیوں کے مجلسی اور تجارتی مقاطعہ پر بھی زور دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مرحلے پر احراریوں کی جاری کی ہوئی تحریک ملاؤں کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی اور انہوں نے مسئلہ ختم نبوت کو اپنی مسجدوں میں خطبات جمعہ کا نہایت محبوب موضوع بنالیا۔

۴۔ جب گزشتہ اگست کے نصفِ اول کے خلاف احرار کی شورش درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی تو ایک خفیہ اطلاع موصول ہوئی کہ احراری شورش کے دباؤ اور جان و مال کے خطرات کی وجہ

سے بعض احمدی اپنے فرقے سے قطع تعلق کر رہے ہیں۔ اور اس صوبے کے اضلاع سے جو اطلاعات موصول ہوئیں وہ مظہر تھیں کہ جولائی اور اگست کے دوران میں ۱۱۵ احمدیوں نے اپنے فرقے کو ترک کر کے سنی مذہب اختیار کر لیا ہے اور گیارہ احمدی اپنے گھروں کو چھوڑ کر ربوہ یا دوسرے مقامات کو منتقل ہو گئے ہیں احمدیوں کو زبردستی غیر احمدی بنانے کے واقعات اگست کے آخر تک کم ہو گئے۔

174

۵۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس گوجرانوالہ کی مرسلہ رپورٹ سے معلوم ہوا کہ دو احمدی مرد مدرس اور چار احمدی استانیاں یہ چھ افراد وزیر آباد کے میونسپل بورڈ ہائی سکول اور مڈل سکول میں ملازمت کر رہے تھے۔ ۲۷ر جولائی کو انہیں وزیر آباد میونسپلٹی نے نوٹس دے دیا کہ ان کی ملازمت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے یہ احراری شورش کا نتیجہ تھا لیکن ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ نے ۴ر مورچ ۱۹۵۳ء کو وزیر آباد میونسپل کمیٹی کی اس قرارداد کو معطل کر دیا۔

۶۔ احمدیوں کے خلاف احراری شورش کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اہم شہروں اور قصبوں میں متعدد نئی انجمنیں "مجلس تحفظ نبوت"، مجلس خدام رسول اور آل مسلم پارٹیز کنونشن کے نام سے قائم ہو گئیں تاکہ مسئلہ ختم نبوت پر احمدیوں کے خلاف شورش کو تیز تر کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان تمام انجمنوں کا یہ مقصد بھی تھا کہ تحریک کے سرمائے کے لئے چندہ فراہم کیا جائے۔ "زمیندار" کے مولانا اختر علی خاں نے اپنے وطن کرم آباد میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر حاضرین سے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کی اپیل کی۔ تاکہ تحریک ختم نبوت کو کامیاب بنایا جائے۔ آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل (لاہور) تحریک ختم نبوت کو چلانے کے لئے گزشتہ جولائی میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے نام پر گزشتہ ستمبر میں ۴۲۴،۱۱ روپے ۲ آنے کی رقم انڈسٹریل کوآپریٹو بنک لاہور میں موجود تھی۔

۷۔ احراریوں اور ان کے حامیوں نے اپنی شورش کی مالی تقویت کے لئے گزشتہ عیدالضحیٰ کے موقع پر پورے صوبے میں قربانی کے جانوروں کی بے شمار کھالیں جمع کیں جن کی مالیت ۴۰۲،۴۶ روپے تھی اس کے علاوہ دوسرے ذرائع سے انہوں نے گزشتہ چھ ماہ کے دوران

میں کوئی ۱۰۷، ۱۵ روپے جمع کئے۔

۸۔ احراریوں اور ان کے حامیوں کو بڑی امیدیں تھیں کہ ان کی شورش بارآور ہوگی اور عزت مآب وزیر اعظم پاکستان ۱۴ راگست کی تقریر میں اعلان کر دیں گے کہ احمدیوں کے خلاف ان کے مطالبات تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ لیکن جب عزت مآب وزیر اعظم نے اپنے نشریہ مؤرخہ ۱۴ راگست میں یہ اعلان کیا کہ مملکت پاکستان کی سالمیت اور اس کے استحکام کا تقاضا ہے کہ طبقہ آرائی اور فرقہ بندی سے کامل اجتناب کیا جائے تو احراری اور ان کے حامی بے حد دل شکستہ ہوئے۔ احراریوں اور ان کے حامیوں کو مزید مایوسی اس وقت ہوئی جب عزت مآب وزیر اعلیٰ پنجاب نے لاہور میں ۳۰ راگست کو اور پھر راولپنڈی میں ۱۱ رستمبر کو تقریریں کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ احمدیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے کے لئے کوئی دلیل جواز نہیں اور طبقہ آرائی اور فرقہ بندی سے انتشار پیدا ہوتا ہے، لہٰذا ایسے رجحانات کو دبا دینا چاہئے۔

۹۔ مسٹر جسٹس کیانی نے ملتان فائرنگ پر جو رائے ظاہر کی اس سے احراری اور ان کے حامی اور بھی زیادہ دل شکستہ ہوئے اور عوام الناس اور حکام پر اس کا نہایت صحت مند اثر ہوا۔

۱۰۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ احمدیوں کے خلاف احرار نے جس شورش کی قیادت کی تھی اس میں پہلے کا سا زور باقی نہیں رہا۔ نہ عوام میں اس تحریک کی دلکشی باقی ہے اور مُلا لوگ جو اس تحریک کے بڑے علم بردار تھے مایوسی و ناکامی محسوس کر رہے ہیں تاہم احرار آج کل صوبے بھر میں مسلسل کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں تاکہ اپنی تحریک کو زندہ رکھیں اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کر لیں تاکہ انہیں ادھر ادھر گھومنے اور مزے اڑانے کی سہولت حاصل رہے۔ اطلاعات کے مطابق بعض احراری مقررین نے اپنی تقریروں میں کہا ہے کہ مرزائی مرتد ہیں اور احکام اسلام کے مطابق واجب القتل ہیں۔

۱۱۔ منٹگمری کے ایک رسوائے عام احراری کارکن مفتی ضیاء الحسن نے جو حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا چچیرا بھائی ہے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۵۲ء کو اے ڈی ایم منٹگمری کی عدالت میں مرزا

175

محمود احمد امام جماعت احمدیہ، روشن دین تنویر ایڈیٹر روزنامہ ''الفضل'' مؤرخہ ۱۵رجولائی ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون ''خونی مُلاّ کے آخری دن'' کے عنوان سے شائع کیا ہے جو دفعہ ۳۰۲، ۱۵۵۔۵، ۵تعزیراتِ پاکستان کے ماتحت آتا ہے۔ یہ مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ اب تک چھ گواہان استغاثہ پیش ہو چکے ہیں اور اس کی آخری پیشی ۸راکتوبر ۱۹۵۲ء کو ہوئی تھی۔

۱۲۔ احراریوں اور ان کے حامیوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مرزا غلام احمد کذاب اور جھوٹا نبی تھا، گزشتہ دو مہینے کے دوران میں کثیر التعداد کتابچے اور پوسٹر شائع کیے ہیں۔ اسی طرح احمدیوں نے بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ رسول پاک صلعم کے خاتم النبیین ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور احراری پاکستان کے دشمن ہیں بے شمار پوسٹر اور کتابچے شائع کیے۔ ۱۱، ۱۲ اور ۱۳رستمبر کو جناح عوامی مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام لاہور اور لائل پور میں دو عام جلسے منعقد ہوئے جس میں بعض مقررین نے فرقہ احمدیہ کے خلاف نکتہ چینی کی۔ چوہدری ظفر اللہ خان کی پالیسی بحیثیت وزیرِ خارجہ کو ناکام بتایا اور ان کو وزارت سے برطرف کرنے پر زور دیا لیکن صاف لفظوں میں مرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے کی حمایت نہیں کی۔

۱۴۔ ایک تازہ خفیہ اطلاع مظہر ہے کہ آل پارٹیز کی مجلس عمل لاہور کے سرگرم ارکان، مستقبل کی راہِ عمل پر متفق نہیں ہیں جو گروہ حکومت کے خلاف براہِ راست اقدام کر کے اس کو مطالبات کی منظوری پر مجبور کرنے کا حامی ہے اس میں آل پاکستان مجلس احرار کے شیخ حسام الدین جماعت اسلامی کے نصر اللہ خاں عزیز اور امین احسن اصلاحی اہل حدیث کے مولانا داؤدی غزنوی اور جمعیۃ علمائے اسلام کے عبدالحلیم قاسمی شامل ہیں۔ دوسرا گروہ جو آئینی اور پرامن طریق سے تحریک کو جاری رکھنے کا حامی ہے اس میں آل پاکستان مجلس احرار کے ماسٹر تاج الدین انصاری، جمعیۃ العلمائے پاکستان کے مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری اور غلام محمد ترنم، حزب الاحناف کے مولانا محمد ارشد پناہوی شیعہ جماعت کے حافظ کفایت حسین اور مظفر علی شمسی اور ''زمیندار'' کے مالک مولانا اختر علی شریک ہیں۔ شیخ حسام الدین

نے ۲۸ اگست کو اس مسئلہ پر ماسٹر تاج الدین سے گفتگو کی اور ان کو اپنے گروہ کے ممبروں کے خیالات بتائے۔ انہوں نے ماسٹر تاج الدین کو بتایا کہ جماعت اسلامی جمیعۃ العلمائے اسلام اور انجمن اہل حدیث کے ممبر آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل کی موجودہ پالیسی کو پسند نہیں کرتے اور صاف طور پر کہہ دیا کہ اگر آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل کسی کمزور پالیسی پر کاربند ہونا چاہتی ہے تو ہمارا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ ماسٹر تاج الدین نے جواب دیا کہ اگر احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا پاکستان کے دوسرے صوبوں تک وسیع کر دیا جائے تو مرکزی حکومت احمدیوں کے خلاف ہمارے مطالبات منظور کر لیگی۔ ماسٹر تاج الدین نے شیخ حسام الدین سے یہ بھی کہا کہ ہم کو جماعتِ اسلامی کی ہدایات سے دھوکے میں آ کر احمق نہیں بننا چاہتے کیونکہ اس جماعت کی تو پالیسی یہ ہے کہ حکومت وقت کے لئے مشکلات پیدا کی جائیں۔ شیخ حسام الدین کی رائے یہ تھی کہ حکومت کے فیصلے پر مجبور کرنے کے لئے جلوس نکالنے چاہئیں اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنا چاہیئے۔ آخر وہ دونوں اس پر متفق ہوئے کہ نیا پروگرام مجلس عمل کے سامنے بغرض غور پیش کر دیا جائے۔ آل مسلم پارٹیز کی مجلس عمل کے ممبروں کی اکثریت کو ماسٹر تاج الدین پر اعتماد ہے۔ اس مقام پر یہ بھی بیان کر دینا چاہیئے کہ شیخ حسام الدین ایک شعلہ مزاج آدمی ہے اور پاکستان مجلس احرار کے اس گروہ کا نمائندہ ہے جو مسلم لیگ سے انقطاع اور کھلم کھلا مخالفت کا حامی ہے جو عناصر راست اقدام کے حامی ہیں ان کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھی جائے گی۔ کیونکہ ان کا سب سے بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ برسر اقتدار سیاسی جماعت کو بدنام کریں اور اس کی قیمت پر اپنی ساکھ میں اضافہ کریں۔ کسی قسم کی آئینی سرگرمی کے خلاف خواہ وہ کتنی ہی لا حاصل اور بیہودہ ہو کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کوئی حکومت اس امر کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اختیارِ حکومت کو چیلنج دیا جائے اور راست اقدام کی دھمکیاں دی جائیں۔ موجودہ پالیسی کے مطابق ان احراری مقررین اور ملاؤں کے خلاف قانونی اقدام نہیں کیا جا رہا ہے جو مساجد کے اندر گھناؤنی اور اشتعال انگیز تقریریں کرتے ہیں۔

177

فیصلہ کیا ہے کہ ایک کروڑ روپے کے نوٹ (رسیدیں) چھاپے جائیں جن کو عوام کے ہاتھ فروخت کر کے احمدیوں کے خلاف شورش کے لئے ایک فنڈ قائم کیا جائے۔

(۲) تقریروں کے لہجے کی یہ عام کیفیت ہے کہ ان میں احمدیوں کے خلاف فحش دشنام آمیز اور ناشائستہ باتیں کہی جاتی ہیں۔

(۳) مجلسی مقاطعہ اور دوسرے طریقوں سے ایذا پہنچانے کی تائید بھی کی گئی ہے۔ کبیر والہ میں مقامی نائب تحصیلدار کے نوکروں کو روزانہ ضرورت کی چیزیں خریدنے سے روک دیا گیا۔ وزیر آباد کی میونسپلٹی نے احرار کے اکسانے پر دو احمدی استانیوں کو موقوف کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر اس قرارداد کی منسوخی کے لئے تدبیر کر رہے ہیں۔

(۴) جماعت احمدیہ کے خلاف جو نفرت پھیلائی گئی اس کی وجہ سے متعدد احمدیوں نے مجبور ہو کر اپنے بال بچوں کو ربوہ بھیج دیا ہے اور ایک خاصی تعداد احمدیت کو ترک بھی کر چکی ہے یہ معلوم نہیں کہ ان کے یہ فیصلے کس حد تک رضا کارانہ اور کس حد تک مجبورانہ تھے۔

(۵) اضلاع کے جاہل اور ناخواندہ ملاؤں نے جرأت پا کر صوبے کے دوردست مقامات پر بھی احمدیوں پر حملے شروع کر دیئے ہیں یہ تحریک آئینی نہیں ہے اور اس کے پھیلانے کے لئے قابل اعتراض طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں۔

(۶) چند احمدی عورتوں اور بچوں نے انڈین ڈپٹی ہائی کمشنر سے بھارت میں مستقل طور پر آباد ہونے کے پرمٹ حاصل کر لئے ہیں اور وہ پاکستان سے ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں۔ یہ عورتیں اور بچے ان احمدیوں کے پاس پہنچنا چاہتے ہیں جو بعد تقسیم کے بلووں کے باوجود قادیان میں رہ گئے تھے حکومت ہند نے ان کے لئے بلا تامل مستقل آبادی کے پرمٹ جاری کر دیئے۔

(۷) حکومت کے مخالف عناصر مثلاً جماعت اسلامی (جس نے اپنے آٹھ مطالبات پر نویں مطالبے کا اضافہ کر دیا ہے کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے) اور اسلام لیگ (جس کا راولپنڈی میں خاص زور ہے) اور حکومت کے مخالف افراد مثلاً عبدالستار نیازی نے شورش

پسندوں کی تائید وحمایت اختیار کر لی ہے۔

(۸) تحریک کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اکثر مقررین احمدیوں پر حملہ کرنے کے بعد حکومت کی مذمت کرتے ہیں؟ اور اس کو نا قابلیت، رشوت خواری اور خوراک کی کمی وغیرہ کے لئے مواد والزام قرار دیتے ہیں۔

(یہ بات بہت اہم اور قابل توجہ ہے)

(دستخط) قربان علی خان ۲۳/ اکتوبر

180

اس سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ احمدیوں کے خلاف شورش کو محض رائے عامہ کو منظم کرنے کے لئے ایک آلہ کار کا طور پر استعمال کیا جارہا ہے تاکہ بالآخر حکومت کے خلاف نفرت وحقارت کی آگ مشتعل کی جاسکے۔

(۹) راولپنڈی میں پچھلے دنوں بہت شرارت برپا کی گئی۔ کیونکہ ایک خفیہ چٹھی جس میں ایک خاص کمانڈنگ آفیسر نے احمدیوں پر نکتہ چینی کی تھی۔ دفتر سے چرا کر کھلم کھلا شائع کردی گئی۔ ایک کلرک نے (جو ڈی ڈی ایم آئی کے دفتر سے تعلق رکھتا ہے) اپنے بیان میں احمدی افسروں کے خلاف نہایت اوٹ پٹانگ الزامات لگائے۔

(یہ رجحانات پھیلیں گے اور اپنے ساتھ تباہی وبربادی لائیں گے۔ ہماری ساری مشینری ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگی (دستخط) قربان علی خاں

(۱۰) اگرچہ تازہ ترین اطلاعات یہ ہیں کہ احراری لیڈر اپنی تحریک سے کسی قدر تھک چکے ہیں۔ لیکن بیرونجات کے جن جلسوں میں وہ تقریریں کررہے ہیں ان کی تعداد میں ابھی کوئی کمی نہیں آئی۔

میری رائے یہ ہے کہ احراری شورش میں نہایت خطرناک ممکنات پوشیدہ ہیں اس نے سادہ لوح اور بے علم عوام کی توجہ کو ان بنیادی مسئلوں کی طرف سے منحرف کردیا ہے جو پاکستان کو درپیش ہیں یہ شورش قطعی طور پر تخریبی ہے۔ اس نے ایک ایسے وقت میں فرقہ وارا ختلافات کو نمایاں کیا ہے جب قوم کی تمام صفوں کو ایک دوسرے سے قریب تر آجانا چاہیے"۔

سمجھے بیٹھے ہیں.. ....

مستقبل پر ایمان:

اگر کسی مریض کو معلوم ہو کہ اس کا مرض قابل علاج ہے۔ اور اس کو جلد سے جلد بیماری سے نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے تو اس کی ہمت بندھ جاتی ہے اور وہ مرض کا بہتر مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے لیکن اگر اس کے برعکس مریض کو یہ احساس ہو کہ اس کا مرض نا قابل علاج بھی ہے اور اس کے مناسب علاج کی کوئی تدبیر بھی نہیں کی جارہی ہے تو وہ جلد موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ حکومت کے خلاف جو پراپیگنڈا حکومت کے مخالفین اور دوسرے تخریبی عناصر نے جاری کر رکھا ہے اس نے مستقبل پر ایمان کو تباہ کر دیا ہے۔ عوام کا خاصہ حصہ امید سے بیگانہ ہو رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ صورت حال حد سے زیادہ خراب ہو چکی ہے اور اب اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لیکن نشر و اشاعت کی مدد سے امید افزا پروپیگنڈا آسانی سے منظم کیا جا سکتا ہے اور مستقبل پر ایمان دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے۔

ملائیت:

اس میں کوئی شک نہیں کہ مُلا زیادہ تر ایسے طبقے سے پیدا ہوتے ہیں جن کو تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جن کا دائرہ نظر انتہائی طور پر تنگ ہوتا ہے ملاؤں کو دراصل ارباب سیاست ہی نے بنایا ہے لیکن اب وہ ان کی حمایت کرنے کے بجائے ان قوتوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں جنہوں نے ان کو پیدا کیا تھا۔ وہ اب خود اقتدار حکومت پر قابض ہونے کے در پے ہیں اور ترقی کے دشمن بھی ہیں اس لئے ملاؤں کی ایک ذہین وفطین اور تعلیم یافتہ جماعت پیدا کرنی چاہئے اور اس اثنا میں لیڈروں کو چاہئے کہ تقریریں کرتے ہوئے مذہبی دوائر کے متعلق کوئی وعدے نہ کیا کریں۔ جن کا ایفا ان کے بس کا روگ نہیں ہے........ ....

....

مزید تقریریں: پالیسی پر نظر ثانی

اس مرحلے پر بعض مقدمات کا جائزہ لینا ضروری ہے کیونکہ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء کو افسروں کی ایک کانفرنس میں ایک ہی حکم کے ماتحت ان تمام مقدمات کا فیصلہ کیا گیا تھا مقدمات یہ ہیں: مقدمہ میلہ گلوشاہ فائل نمبر (129(2)16) اور مقدمہ شجاع آباد فائل نمبر (130(2)16)

183

ضلع سیالکوٹ کے تھانہ ستراہ کے علاقے میں ایک گاؤں ہے کوریکے۔ اس گاؤں میں ہر سال ایک میلہ مویشیاں ہوتا ہے جسے گلوشاہ کا میلہ کہتے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں یہ میلہ ۳/اکتوبر سے ۱۰/اکتوبر ۱۹۵۲ء تک ہوا۔ جس میں بہت سے لوگ اپنے مویشوں کے ساتھ جمع ہوئے۔ احراریوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہاں آل مسلم پارٹیز کنونشن کا ایک جلسہ منعقد کرلیا۔ جس میں میلے کے مجمع کے سامنے حسب معمول زہر چکانی کی۔ بعض لیڈروں نے ۳ کو اور بعض نے ۷/اکتوبر کو تقریریں کیں۔ تقریروں کا موضوع وہی احمدیت تھا اور چونکہ ان سے فرقہ وارنہ منافرت پھیلانا ہی مقصود تھا اور یہ تقریریں قابل اقدام تھیں۔ اس لئے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مسٹر عبدالسعید ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو حکم دیا کہ ان کا جائزہ لیں مسٹر عبدالسعید نے نہایت احتیاط سے ہر تقریر کو دیکھ پرکھ کر حسب ذیل رائے پیش کی۔

(۱) مولوی کرامت علی نے ۷/اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ایک تقریر کی جس میں یہ کہا کہ مرزا غلام احمد نے مسلمانوں کو فاحشہ عورتوں کی اولاد، ان کی عورتوں کو کتیاں اور مرزا کو نہ ماننے والوں کو طوائفوں کی اولاد بتایا ہے۔ یہ تقریر زیر دفعہ ۲۱(۳) پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ قابل اقدام ہے کیونکہ اس سے غیر احمدی مسلمانوں کی طرف سے مزید ایسی سرگرمیوں کا احتمال ہے جو سلامتی عامہ اور قیام امن وانتظام کے لئے مضر ہونگی۔

(۲) اسی موقع پر مولانا بشیر احمد صدر مجلس احرار پسرور نے تقریر کی۔ جس میں انہوں نے ایک مبینہ واقعہ کا ذکر کیا کہ ایک شخص ڈاکٹر احسان علی نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی سیالی

سلمیٰ بیگم کے ساتھ زنا بالجبر کیا اور اس کو مرزا بشیر الدین محمود احمد کے حکم سے دس ضرب پاپوش کی سزا دی گئی۔ اس تقریر کے دوران میں یہ بھی کہا گیا کہ آیا کسی اور شخص کو بھی اس جرم میں دس جوتوں کی سزا دینا مناسب ہوگا کہ اس نے ایک اور شخص کے کنبے کی ایک عورت سے زنا بالجبر کیا تھا۔ مقرر نے مرزائیوں کو مرتد قرار دیا جو شرع اسلام کی رو سے واجب القتل ہیں۔ یہ تقریر پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے دفعہ ۲۱ کی شق (۱)(۳) کے ماتحت مستوجب سزا ہے۔

(۳) اس موقع پر ۳/اکتوبر ۱۹۵۲ء کو قاضی منظور احمد نے ایک تقریر کی۔ جس میں اس نے مرزا غلام احمد کے بعض اقوال کو کسی قدر بگاڑ کر نقل کیا۔ جن میں ایک قول یہ بھی تھا کہ مرزا غلام احمد کو اللہ کی طرف سے حمل ہوا تھا اور جو مسلمان ان کو نہیں مانتے وہ سور ہیں اور جو عورتیں ان کے دعوے کو تسلیم نہیں کرتیں وہ کتیاں ہیں۔ اور وہ مرزائیوں کے حامی ہیں یہ تقریر پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۱ کی شق (۱)(۲) اور (۳) کے ماتحت قابل اقدام ہے۔

مسٹر عبدالسمیع پبلک پراسیکیوٹر نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اس قانونی رائے کو حاصل کر لینے کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس نے یہ معاملہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر کے اس سے درخواست کی کہ ۵/جولائی ۱۹۵۲ء کو چیف سیکرٹری کے زیر صدارت حکام کی کانفرنس میں جو فیصلے ہوئے تھے ان کے پیراگراف ۲ اور ۷ کی مشمولہ ہدایات کے مطابق آپ حکومت پنجاب سے ان تقریروں کے خلاف مقدمات دائر کرنے کی منظوری حاصل کریں۔ مسٹر غلام سرور خاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنی چٹھی مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۵۲ء کے ذریعے سے بوساطت کمشنر صاحب یہ تجویز حکومت کو بھیج دی۔ مسٹر نذیر احمد سپرنٹنڈنٹ پولیس (B) نے اس کیس کا جائزہ لیا اور اپنی یادداشت مؤرخہ ۱۸/نومبر ۱۹۵۲ء میں یہ تجویز پیش کی کہ بشیر احمد اور منظور احمد کے خلاف مقدمات دائر کرنے کے بجائے ان کو زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی گرفتار کر لینا چاہیئے۔ مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے ان دونوں آدمیوں کے ریکارڈ کا معائنہ کیا اور ۲۲ نومبر ۱۹۵۲ء کو یہ کیس ہوم سیکرٹری کو بھیج دیا۔ مسٹر انور علی نے یہ رائے ظاہر کی کہ جو تفرقہ انگیز لوگ مملکت کے استحکام کو نقصان پہنچا رہے ہیں ان کے خلاف مقدمات دائر کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے اور اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ خلاف قانون

تقریروں کے متعلق کوئی نہ کوئی کاروائی ضرور کی جائے گی تو وہ آئندہ مزید ضبط کا ثبوت دینگے۔اس پر ہوم سیکرٹری نے ۲۱ رنومبر ۱۹۵۲ء کو لکھا کہ چیف منسٹر صاحب کراچی سے واپسی پر احمدیوں کے خلاف شورش کے متعلق پوری صورت حال پر حکام سے گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔اس لئے اس کیس پر بھی اسی موقع پر بات چیت ہوگی۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی لکھا کہ اس سلسلے میں اور بھی بہت سی قابل اعتراض تقریریں ہمارے علم میں آچکی ہیں جن کے متعلق یہی مناسب سمجھا گیا ہے کہ ان کو نہ چھیڑا جائے۔

لائل پور میں ۲۶، ۲۷ رستمبر کو زیر اہتمام آل مسلم پارٹیز کنونشن ایک ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی اور کنونشن ہی کے زیر اہتمام ۲۸ ستمبر ۱۹۵۲ء کو سمندری میں بھی ایک جلسہ عام کیا گیا۔لائل پور کے مقررین میں مرزا غلام نبی جانباز، ماسٹر تاج الدین انصاری، صاحبزادہ فیض الحسن، شیخ حسام الدین، تاج محمد لائل پوری، مظفر علی شمسی اور مولانا داؤد غزنوی شامل تھے۔صاحبزادہ فیض الحسن نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ مرزا غلام احمد نہایت پست اخلاق کا آدمی تھا اس نے حضرت بی بی فاطمہ کی پاکیزگی پر حملہ کیا۔جس کی بنا پر وہ اس امر کا مستحق تھا کہ اس کے خلاف غنڈا ایکٹ کے ماتحت مقدمہ چلایا جاتا۔اس مقرر نے چوہدری ظفر اللہ خاں کو بھی غنڈا کہا اور یہ بھی کہا کہ مرزا مظفر احمد جو احمدی ہے اور مرزا محمود احمد کا داماد ہے حکومت پنجاب کا فنانس سیکرٹری مقرر نہ ہونا چاہئے۔شیخ حسام الدین نے کہا کہ چوہدری ظفر اللہ خاں خبیث ہے اور جب تک وہ وزیر خارجہ ہے پاکستان کی بہتری کی کوئی صورت نہیں۔سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ملکہ وکٹوریہ اور ملکہ الزبتھ کے متعلق جو کچھ کہا بہتر یہی ہے کہ اس کا ذکر نہ کیا جائے۔اس نے کہا کہ لاہور چھاؤنی کے پاس اور جنگ شاہی کے قریب ہوائی جہازوں کے جو حادثے پیش آئے اور جن میں جنرل افتخار خاں اور جنرل شیر خاں ہلاک ہوگئے ان کی ذمہ داری مرزائیوں پر ہے۔سمندری کانفرنس میں سید مظفر علی شمسی، ماسٹر تاج الدین شیخ حسام الدین، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، غلام نبی جانباز اور چک نمبر ۴۲۳ کے غازی محمد حسین نے تقریریں کیں۔سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بیان کیا کہ مرزا غلام احمد کے والد حکیم غلام مرتضیٰ نے بالاکوٹ کی لڑائی میں مسلمان بادشاہ بہادر شاہ کے خلاف جنگ کرنے کے لئے سردار نونہال سنگھ کو پچاس سوار مہیا

محمد علی جالندھری کے خلاف جو احراریوں میں بدترین مقرر ہے مقدمہ دائر کیا جائے یا اس کو پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند کیا جائے۔ ۲۵ر نومبر ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے یہ کیس حکومت کو بغرض اطلاع ارسال کیا اور لکھا کہ چیف منسٹر صاحب کا ارشاد ہے کہ وہ کراچی سے واپسی پر اس مسئلے کے متعلق گفتگو کرینگے کہ فرقہ بندی کے متعلق جنگجویانہ تقریریں کرنے والوں کے متعلق کیا اقدام کیا جائے۔

188

شجاع آباد ضلع ملتان میں ۱۹، ۲۰ر نومبر کو ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس موقع پر اہم مقررین یہ تھے: مولوی محمد علی جالندھری، مرزا غلام نبی جانباز، شیخ حسام الدین، مولوی غلام غوث سرحدی، قاضی احسان احمد شجاع آباد اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری مولوی غلام غوث نے اپنی تقریر میں کہا کہ مرزا غلام احمد عورتوں سے ٹانگیں دبوایا کرتے تھے۔ ان عورتوں میں سے ایک کا نام بھانو تھا، مرزا صاحب ننگی عورتوں کو دیکھنے کے بہت مشتاق تھے اور یہ تو ان کا بیٹا (مرزا بشیر الدین محمود احمد) بھی تسلیم کر چکا ہے کہ وہ شراب پیا کرتے تھے۔ مولوی محمد علی جالندھری نے مرزا غلام احمد کو ''اُلو کا پٹھا'' بتایا اور کہا کہ خواجہ ناظم الدین کی ماں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ سکتی ہے کہ اس کا بیٹا وزیر اعظم بن گیا لیکن ملک بدقسمت ہے کیونکہ وزیر اعظم امور و معاملات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے یہاں پھر ملکہ وکٹوریہ کے متعلق فحش اشارات کئے۔

یہ کیس مسٹر انور علی کے پاس پہنچا تو انہوں نے ۸ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو اس پر مندرجہ ذیل یادداشت لکھی:۔

(۱) میں ایک دفعہ پہلے بھی حکومت کے علم میں لا چکا ہوں کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لائل پور میں تقریر کرتے ہوئے ملکہ وکٹوریہ کے خلاف ناشائستہ اور بدتمیزانہ باتیں کیں اب شجاع آباد میں بھی اس نے ملکہ وکٹوریہ کے متعلق فحش اور مکروہ اشارات کئے ہیں۔

(۲) محمد علی جالندھری یہاں تک پہنچ گئے کہ انہوں نے جماعت احمدیہ کے بانی کو ''اُلو کا پٹھا'' کہہ دیا اگر احمدی ایسی باتوں پر برہم ہوں اور جوش میں آجائیں تو کیا ہم انہیں الزام دے سکتے ہیں؟ اگر وہ غصے میں بھر کر کچھ کر بیٹھیں تو احراری احمدیوں کی آزاد رسانی میں اور

کے خلاف علی الاعلان توہین آمیز باتیں کہنے سے روکا جائے۔ وہ عام طور پر اپنی تقریروں میں مرزا غلام احمد کو دجال، کذاب اور زانی اور چوہدری ظفر اللہ خاں کو غدار اور دشمن پاکستان کہتے ہیں۔

۳۔ احرار مقررین عوام پر یہ اثر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر بعض لوگ مثلاً احمدی مرزا غلام احمد کو نبی خیال کریں تو یہ رسول پاک صلعم کی سخت توہین ہے۔ اس طریقے سے عام آدمی کے جذبات سے کھیلا جاتا ہے اور اس کو احمدیوں کے خلاف متشددانہ اقدام پر مشتعل کیا جاتا ہے۔

۴۔ اب احراری مقررین اپنی توجہات اس امر پر صرف کر رہے ہیں کہ احمدیوں کا مجلسی اور اقتصادی بائیکاٹ کیا جائے کیونکہ وہ غیر مسلم ہیں یہ لوگ دکانداروں سے کہتے ہیں کہ اپنی دوکانوں پر مرزائیوں کے لئے علیحدہ برتن رکھو اور اس کا اعلان بورڈ لگا کر کرو۔

۵۔ احرار مقررین مسلمانوں کو اس امر پر بھی اکسا رہے ہیں کہ وہ اپنے قبرستانوں میں احمدیوں کی نعشوں کو دفن ہونے کی اجازت نہ دیں۔

۶۔ احرار مقررین عوام کے ذہنوں میں یہ نقش بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وزیراعظم پاکستان اور وزیراعلیٰ پنجاب احمدیوں کے حامی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اب تک احمدیوں کو علیحدہ قوم قرار نہیں دیا اور چوہدری ظفر اللہ خاں کو کابینہ پاکستان سے موقوف نہیں کیا۔

۷۔ احرار مقررین اپنی تقریروں میں اس امر پر زور دیتے ہیں کہ مرزائیوں کو پاکستانی فوج اور دوسری ملازمتوں میں کلیدی عہدے ہرگز نہ دیئے جائیں۔ اس طریقے سے وہ ملازمتوں کے اندر احمدیوں اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان فرقہ واری پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۸۔ احراری مقررین کھلم کھلا یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ ربوہ کے مرزا محمد احمد اور ان کے پیرو مملکت پاکستان کے وفادار نہیں ہیں اور وہ بھارت اور پاکستان کو دوبارہ متحد کر دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ قادیان جہاں ان کا بانی مدفون ہے بھارت میں واقع ہے اور مرزائی واپس قادیان جانے کے بے حد خواہاں ہیں۔

۹۔ احراری مقررین کئی دفعہ اپنی تقریروں میں کہہ چکے ہیں کہ مرزا محمود احمد اور چوہدری ظفراللہ خاں کی غداری ہی کی وجہ سے ضلع گورداسپور بھارت میں شامل ہوگیا اور پاکستان کو نہ مل سکا۔

۱۰۔ احراری مقررین یہ بھی کہتے رہے ہیں کہ مسئلہ کشمیر صرف چوہدری ظفراللہ خاں کے عدم خلوص کی وجہ سے اب تک حل نہیں ہوسکا اور پاکستان وافغانستان کے تعلقات کی کشیدگی کا باعث بھی یہی ہے کہ چوہدری ظفراللہ خاں کابینہ پاکستان میں شامل ہیں۔

۱۱۔ احراری مقررین اپنی تقریروں میں اس امر کی اشاعت بھی کرتے رہے ہیں کہ چوہدری ظفراللہ خاں انگریزوں کے ایجنٹ ہیں اور فرقہ احمدیہ کی حوصلہ افزائی اور ترقی بھی حکومت برطانیہ ہی نے کی تھی کیونکہ اس فرقے کا بانی ''جہاد'' کا مخالف تھا روزنامہ ''زمیندار'' اور ''آزاد'' (احرار کا اخبار) دونوں قریب قریب روزانہ ایسے مضامین شائع کررہے ہیں جو احمدیوں کے خلاف فرقہ احمدیہ کے بانی کے خلاف اور چوہدری ظفراللہ خاں کے خلاف شدید بدگوئی اور دشنام طرازی سے لبریز ہوتے ہیں۔

۱۲۔ احراریوں کی اس شورش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں اور احراریوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہوگئے ہیں اور عام لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس ملک کے ارباب اختیار کو لوگوں کے احساسات سے کوئی ہمدردی نہیں اور وہ احمدیوں کے حامی ہیں۔ اس طریقے سے مملکت کو نقصان پہنچا ہے اور احراری لیڈروں کی حیثیت عوام کی نظروں میں بہتر ہوگئی ہے۔ اس شورش کا ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملاؤں کا پورا طبقہ اپنی روزانہ تقریروں اور جمعہ کے خطبوں میں بے حد تیز وتند لہجہ اختیار کرچکا ہے، وہ اپنے وعظوں کو دینی معاملات تک محدود رکھنے کی بجائے اب خالص سیاسیات کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ خصوصاً ان کے خطبات جمعہ اسی موضوع سے لبریز ہوتے ہیں۔

۲۴ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو چیف منسٹر صاحب کے کمرے میں کانفرنس ہوئی جس میں مسٹر قربان علی خاں انسپکٹر پولیس ہوم سیکرٹری اور مسٹر انور علی ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے حصہ لیا۔ اس گفتگو میں صرف ایک فیصلہ کیا گیا کہ جہاں کوئی تقریر قانون کے خلاف ہو وہاں قانونی کاروائی کی جائے اور کسی مزید

علما کی سرگرمیاں اور وزیراعظم اور وزیراعلیٰ سے ان کی ملاقاتیں

پہلا شخص جس نے خواجہ ناظم الدین وزیراعظم کی توجہ قادیانی تحریک کی سنگینی کی طرف مبذول کروائی وہ قاضی احسان احمد شجاع آبادی تھا۔ قادیانیت کی مخالفت اس شخص کی زندگی کا واحد مقصد ہوتا ہے اور وہ جہاں کہیں بھی جاتا ہے اپنے ساتھ ایک بڑا چوبی صندوق لے جاتا ہے جس میں احمدیوں کا اور احمدیوں کے خلاف لٹریچر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ زیادہ اہم سیاسی واقعات کا ذکر تو درکنار پاکستان یا کسی اور شخص کو کوئی آفت پیش آ جائے کوئی افسوسناک واقعہ رونما ہو جائے۔ قائد ملت قتل کر دیئے جائیں یا ہوائی جہاز گر پڑیں۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے نزدیک وہ ہمیشہ احمدیوں کی سازش کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں شجاع آبادی کراچی کے ایک اور مولانا احتشام الحق تھانوی کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر کے خواجہ ناظم الدین کے پاس لے گیا۔ تاکہ وہ ان کو اس غیظ و غضب سے مطلع کریں جو احمدیوں کے خلاف ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ دونوں ۳/مارچ ۱۹۵۰ء کو خواجہ ناظم الدین سے ملے۔ شجاع آبادی کا چوبی صندوق اس کے ساتھ ہی تھا اس نے اس صندوق میں سے کچھ قادیانی لٹریچر نکالا جسے پڑھ کر خواجہ ناظم الدین سخت پریشان ہوئے۔

اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کے احمدیوں کے خلاف مطالبات علما نے جون ۵۲ء میں بمقام کراچی اور ۱۳ جولائی ۵۲ء کو بمقام لاہور وضع کیے تھے۔ اور اسی وقت ان مطالبات کی منظوری کے لیے تدابیر سوچنے کی غرض سے مجلس عمل مرتب کی گئی تھی۔ مجلس عمل کے ارکان نے جو طریقے اختیار کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ خواجہ ناظم الدین وزیراعظم سے ایک وفد ملاقات کرے اور ان کو مطالبات کی معقولیت کا قائل بنائے۔ وزیراعظم سے پہلی ملاقات مولانا اختر علی خاں نے جولائی ۱۹۵۲ء میں کی جب وہ ایک پریس کانفرنس کی غرض سے کراچی میں مقیم تھے۔ مولانا نے خواجہ ناظم الدین سے مطالبات کا ذکر کیا اور دیکھنے لگا کہ خواجہ صاحب پر ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ مولانا نے

ایک میمورنڈم (EXD.E16) پیش کر دعویٰ کیا ہے خواجہ ناظم الدین نے ان سے جو کچھ کہا تھا وہ بے کم وکاست اس میں درج ہے:۔

"مجھے ملک کے جذبات اور احساسات کا پورا علم ہے میں جانتا ہوں کہ مسلمان کیا چاہتے ہیں لیکن میں ان سے کہوں گا کہ حکومت ان کے جذبات کا پورا پورا احترام کرتی ہے۔لیکن ان کے مطالبات کو پورا کرنے کے راستے میں کچھ آئینی دشواریاں ہیں۔ان دشواریوں کو پورا کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔اس لیے مسلمانوں کو توقف اور اطمینان سے کام لینا چاہئے۔امن اور قانون کو برقرار رکھنے میں حکومت سے تعاون کرنا چاہئے۔ہم جو بھی فیصلہ کریں گے وہ مسلمانوں کو قابل قبول ہوگا۔آپ نے کہا کہ یہ فیصلہ علمائے کرام کی عین مرضی کے مطابق ہوگا۔میری حکومت ۱۴ اگست کو بنیادی حکمت عملی کا اعلان کردے گی۔مجھے امید ہے کہ یہ وضاحت ملک کی رائے عامہ کو مطمئن کرے گی"۔

195

خواجہ ناظم الدین کا بیان اس ملاقات کے واقعات کے متعلق مختلف ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ میں نے تو مولانا اختر علی خان سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں مسئلے کے متعلق یوم پاکستان مورخہ ۱۴۔اگست کو اپنی تقریر میں کچھ بیان کروں گا۔مولانا اختر علی خاں نے کراچی سے واپس آکر "زمیندار" مورخہ ۴/۱۴ اگست میں جلی قلم اعلان شائع کیا کہ قادیانیوں کے متعلق مرکزی حکومت کی پالیسی کا اعلان وزیراعظم صاحب یوم پاکستان پر اپنی تقریر میں کردیں گے اور یہ اعلان شریعت اور علما کی خواہش کے مطابق ہوگا۔مولانا نے اس خبر میں یہ غلط بیانی کی کہ انہوں نے وزیراعظم کی خدمت میں تحریک ختم نبوت کے ایک وفد کی قیادت کی تھی۔حالانکہ واقعہ صرف اتنا تھا کہ مولانا کسی پریس کانفرنس کے ممبر کی حیثیت سے کراچی گئے تھے۔اور اسی سلسلے میں کانفرنس کے بعض دیگر ممبروں کی معیّت میں وزیراعظم سے ملے تھے۔احمدیوں کے مسئلے کا ذکر صرف ضمنی حیثیت سے ہوا تھا۔۱۳ اگست ۱۹۵۲ء کو ایک وفد وزیراعظم کی خدمت میں حاضر ہوا جس کے ارکان یہ تھے: ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا ابوالحسنات محمد احمد، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، شیخ حسام الدین، مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا عبدالحامد ایوبی۔اس وفد نے ایک تحریری یادداشت پیش کی جس میں احمدیوں کے

ختم کر دیا جائے اور آئندہ کے لیے اس قابل اعتراض طریقے سے فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کو ممنوع قرار دیا جائے۔

گورنمنٹ سروس کنڈکٹ رولز (قوائد کردار ملازمان سرکاری) میں اس منشا کے مطابق ترمیم کر دی گئی ہے۔

حکومت اعلان عام کر دینا چاہتی ہے کہ جو شخص خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو اس قائدے کی خلاف ورزی کرے گا۔ اس کے خلاف شدید کاروائی کی جائے گی۔ پاکستان کی صوبائی ریاستی حکومتوں کو بھی اسی قسم کے اقدامات کی ہدایت کی گئی ہے۔''

چونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سرکاری اعلان کا روئے سخن چودھری ظفر اللہ خاں اور دوسرے احمدی افسروں کی طرف ہے، اس لیے چودھری ظفر اللہ خاں نے فوراً مندرجہ ذیل بیان اخبارات میں شائع کروایا:۔

''میں ان تعلیمات اسلامی کے مطابق جو قرآن مجید میں مندرج ہیں اور جن کا نمونہ رسول پاک کی حیات طیبہ میں موجود ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے آزادی ضمیر پر پورا اعتقاد رکھتا ہوں میرے خیال میں سرکاری اثر و نفوذ کا استعمال بھی براہ راست دباؤ یا تشدد ہی کی مانند آزاد ضمیری میں مداخلت کا حکم رکھتا ہے۔ بلکہ اسلام نے تو ہر مسلمان پر یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں قول و فعل سے احکام اسلامی کی تعمیل کا ثبوت دے۔ یہ وہ فرض ہے جس کی طرف سے مسلمانوں نے اپنے دور زوال میں افسوسناک غفلت برتی۔ جس کے نتائج ان کی انفرادی اور قومی زندگیوں پر بالکل واضح ہیں۔

خود میرے عقائد میرے جاننے والوں سے (خواہ وہ مجھے شخصاً جانتے ہوں یا میری شہرت کی وجہ سے واقف ہوں) کبھی پوشیدہ نہیں رہے گا۔ گو پچھلے دنوں بعض حلقوں میں ان کو بگاڑ کر پیش کرنے اور ان کے متعلق غلط بیانی کرنے کی مسلسل کوششیں کی گئیں ہیں۔ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں میں اس امر کو خلاف دیانت اور خلاف تعلیمات اسلامی سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص اپنے سرکاری عہدہ و اختیار کو بالواسطہ یا بلاواسطہ استعمال کر کے اپنے مذہبی عقائد کو دوسروں

حکومت کی طرف سے جو اعلان کیا گیا ہے میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے باشندگان پاکستان کے طبقے اس اعلان کو ہر دم پیش نظر رکھیں گیا اور دین وایمان کے متعلقہ امور میں سکون ومتانت اور سنجیدگی اور رواداری کی فضا قائم کرنے میں معاون ہونگے۔ جن موضوعات سے انسانی ذہن کا تعلق ہے اور جن کا اثر ذہن قبول کرتا ہے ان میں بلند ترین موضوعات ایمان واعتقاد ہیں۔ اس دائرے میں انتہائی حزم واحتیاط لازمی ہے۔ مبادا اللہ کی نظروں میں ہم اس گناہ کے مرتکب قرار پائیں کہ ہم نے کسی شخص کو ایسے عقیدے کے اعلان پر مجبور کیا جسے اس کا ضمیر مجبور نہیں کرتا تھا۔ اور ان عقائد سے انکار کی ترغیب دی جن کو اس کا قلب وضمیر مخلصانہ قبول کرتا تھا کوئی شخص جو اس قسم کے فعل کا مرتکب ہے وہ وزیر ہو یا حاکم ہو۔ یا کوئی غیر سرکاری فرد ہو حقیقت میں مومنین مخلصین کی نہیں بلکہ منافقین کی جماعت پیدا کرنے کے خواہاں ہیں'۔

مجلس عمل کے وہ ممبر جو ۱۳ اگست کو خواجہ ناظم الدین سے ملے تھے۔ ۱۶ اگست کو پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس موقع پر سردار عبدالرب نشتر، مسٹر گورمانی اور مسٹر فضل الرحمٰن بھی موجود تھے۔ اس ملاقات کا نتیجہ ارکان وفد کے لیے واضح طور پر دل شکن تھا۔ خواجہ ناظم الدین نے کہا کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مسئلہ دستور ساز اسمبلی کے دائرہ اختیار میں ہے۔ اور اس معاملے میں کسی اقدام پر آمادہ نہیں ہوں۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ چودھری ظفر اللہ خاں کو خود قائداعظم نے مقرر کیا تھا۔ اس لیے میں انہیں برطرف کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ احمدی افسروں کو کلیدی عہدوں سے الگ کیا جائے تو اس سے متعلق ارکان وفد کو دلائل و براہین کی مدد سے کیس تیار کرنا چاہیے اور ربوہ کے متعلق جو شکایات ہیں وہ صوبائی حکومتوں کے سامنے پیش کرنی چاہیں۔

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، شیخ حسام ال ین اور مولانا داؤد غزنوی نے ۲۹ ستمبر ۱۹۵۲ء کو چیف منسٹر پنجاب سے ملاقات کی اور احمدیوں کے خلاف اپنی شکایات ان کے سامنے پیش کیں جن میں امور یہ شامل تھے ربوہ میں خالص احمدی بستی کے لیے اراضی کا عطیہ، ناواجب الاٹمنٹیں اور وہ مسئلہ جس کو ارکان وفد گولی بارود کی سازش سے موسوم کرتے

۱۶ ۱۷ور ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو منعقد ہوگا۔

اس کنونشن کی کاروائی کے متعلق دو بیانات ہیں ایک طرف مجلس عمل اور احرار کا بیان ہے اور دوسری جماعت اسلامی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا۔ اور دونوں میں کچھ فرق ہے مجلس عمل کے تحریری بیان یہ لکھا ہے کہ کنونشن کا اجلاس ۱۶ جنوری ۱۹۵۳ء کو بعد نماز جمعہ منعقد ہوا جس میں پاکستان کے بڑے بڑے علما شریک ہوئے۔ مسئلہ احمدیت پر بحث ہوئی اور سبجیکٹس کمیٹی مرتب کی گئی۔ اس تحریری بیان میں مندرجہ ذیل علما کے نام درج ہیں جو اس اجلاس میں شریک تھے:۔

(۱) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صدر جماعت اسلامی لاہور

(۲) حاجی محمد امین امیر جماعت ناجیہ

(۳) خلیفہ حاجی ترنگ زئی پشاور

(۴) حضرت پیر سرسینہ شریف امیر حزب اللہ ڈھاکہ۔ بنگال

(۵) مولانا راغب احسن ایم اے۔ ڈھاکہ

(۶) مولانا عزیز الرحمٰن ناظم حزب اللہ۔ ڈھاکہ

(۷) مولانا اطہر علی۔ ڈھاکہ

(۸) مولانا سخاوت الانبیا ڈھاکہ

(۹) مولانا محمد یوسف بنوری، صدر مدرس دارالعلوم ٹنڈو الہ یار

(۱۰) مولانا شمس الحق وزیر معارف۔ قلات

(۱۱) مولانا ابراہیم میر سیالکوٹ

(۱۲) مولانا احمد علی صدر جمعیۃ العلمائے اسلام۔ شیرانوالہ گیٹ۔ لاہور۔

(۱۳) مولانا محمد حسن جامعہ اشرفیہ، نیلا گنبد۔ لاہور

(۱۴) مولانا محمد ادریس صدر مدرس جامعہ اشرفیہ، نیلا گنبد۔ لاہور۔

(۱۵) مولانا ظفر احمد عثانی سیکرٹری تعلیمات اسلامی بورڈ۔ کراچی

(۱۶) مولانا سید سلیمان ندوی صدر تعلیمات اسلامی بورڈ۔ کراچی

(۱۷) مولانا محمد شفیع مفتی دیوبند۔ ممبر تعلیمات اسلامی بورڈ۔ کراچی۔

(۱۸) مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی وسندھ

(۱۹) مولانا مفتی صاحب داد خاں مدرس عربی۔ سندھ مدرسہ کراچی۔

(۲۰) مولانا عبدالحامد بدایوانی صدر جمعیت العلمائے کراچی۔

(۲۱) مولانا محمد یوسف کلکتوی صدر جمعیت اہل حدیث۔ کراچی

(۲۲) مولانا محمد اسماعیل ناظم جمعیت اہل حدیث

(۲۳) مولانا سید داؤد غزنوی ایم ایل اے صدر جمعیت اہل حدیث۔ مغربی پاکستان

202

(۲۴) مولوی محمد علی جالندھری جنرل سیکرٹری مجلس احرار۔ ملتان

(۲۵) مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیر شریعت

(۲۶) مولانا متین، ناظم جمعیت علمائے اسلام کراچی۔

(۲۷) مولانا احتشام الحق کنوینر آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن۔ کراچی۔

(۲۸) مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت علمائے پاکستان وصدر مجلس عمل۔

۱۷ جنوری ۱۹۵۳ء کو نماز مغرب کے بعد ایگزیکٹیو کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ ۱۸ جنوری کو کنونشن کی دوسری نشست ہوئی جس میں حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

(۱) چونکہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کے رویے کے پیش نظر اس امر کی کوئی امید نہیں کہ مرزائیوں کے متعلق مطالبات تسلیم کر لیے جائیں گے۔ اس لیے پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ان حالات میں مطالبات کو تسلیم کرانے کی غرض سے راست اقدام ناگزیر ہو گیا ہے۔

(۲) چونکہ حکومت مرزائیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں ہے اس لیے ایسی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ فرقہ مرزائیہ کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیا جائے۔ ان تدابیر میں سے ایک یہ ہے کہ اس فرقے سے کامل مقاطعہ کیا جائے۔

(۳) چونکہ مرزائی وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خاں کی برطرفی کا مطالبہ اب تک منظور نہیں

ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ

۲۶ فروری ۱۹۵۳ء کو مرکزی مجلس عمل کا ایک اجلاس کراچی میں ہوا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل اشخاص حاضر تھے (۱) ماسٹر تاج دین انصاری (۲) صاحبزادہ فیض الحسن (۳) سید نورالحسن بخاری (۴) مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی سندھ وکراچی (۵) مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد قادری (۶) مولانا محمد عبدالحامد بدایونی (۷) مولانا احتشام الحق تھانوی (۸) سید عطاء اللہ شاہ بخاری [...]لانا محمد یوسف کلکتوی (۱۰) سید مظفر علی شمسی۔

اس اجلاس کی صدارت مولانا ابوالحسنات نے کی۔ اس میں اس مطلب کی ایک قرارداد منظور کی گئی کہ ۱۸ جنوری کی کنونشن میں مرکزی حکومت کو جو نوٹس دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ وہ چونکہ مجلس عمل کے ایک وفد نے اس حکومت کے حوالے کر دیا تھا۔ اور ۲۲ فروری کو اس نوٹس کی معیاد ختم ہو گئی۔ بلکہ مزید چار دن بھی گزر چکے ہیں۔ اس لیے اب پرامن راست اقدام کی شکل کا فیصلہ کیا جانا ضروری ہے۔ راست اقدام کی شکل کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ پانچ رضا کار جو ایسے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہونگے جن پر مطالبات ثبت ہونگے۔ شارع عام پر نہیں بلکہ چھوٹی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے وزیراعظم کی کوٹھی پر جائیں گے۔ اگر وہاں سنتری ان رضا کاروں کو روکے گا تو وہ اس سے کہیں گے کہ وزیراعظم کی خدمت میں مطالبات پیش کرنے اوران کو تسلیم کرنے کی درخواست کرنے آئے ہیں۔ اور وہ اسی صورت میں واپس جائیں گے کہ وزیراعظم ان مطالبات کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیں۔ اگر یہ رضا کار گرفتار کر لیے جائیں گے تو مجلس عمل پانچ اور رضا کاروں کا دستہ بھیجے گی اور یہ سلسلہ پرامن طریقے پر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک مطالبات تسلیم نہ کیے جائیں گے۔ گورنر جنرل کی کوٹھی پر بھی اسی قسم کا پہرہ لگایا جائے گا تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس تحریک کا رخ خواجہ ناظم الدین کی طرف اس لیے ہے کہ وہ بنگالی ہیں۔ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری اس متبرک تحریک کے ڈکٹیٹر مقرر کیے گئے تھے۔ اور انہیں گرفتاری کی صورت میں اپنے جانشین کی نامزدگی کا اختیار دیا گیا۔ یہ بھی قرار دیا گیا کہ اسی دن شام کو آرام باغ میں جو جلسہ ہو رہا ہے۔ اس میں

"نمبر 2249-BDSB

پنجاب سول سیکرٹریٹ لاہور

۲۱ فروری ۱۹۵۳ء

مکرمی احمد صاحب

ازراہ کرم غیاث الدین احمد کی ڈی او چٹھی نمبر 14682-BDSB مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۲ء بنام حمید الدین احمد احرار شورش کے موضوع پر لکھی گئی تھی۔ بغرض حوالہ پیش نظر رکھ لیجئے۔

۲۔ کچھ وقت کے لیے شورش کی رفتار نرم پڑ گئی تھی لیکن حال ہی میں عوام کی دلچسپی کو تیز کرنے کی کوششیں خاصی شدت کے ساتھ دوبارہ جاری کر دی گئی ہیں۔ صوبے بھر میں بیشمار کانفرنسیں اور جلسے منعقد کیے گئے ہیں اور آتش ریز تقریریں کی گئی ہیں۔ ملاؤں کی تائید و حمایت حاصل کر لی گئی ہے اور احمدیوں کے خلاف زہر اگلا جا رہا ہے۔ گوجرانوالہ میں مطبوعہ اشتہارات نشر کیے گئے ہیں۔ جن میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ احمدیوں سے اچھوتوں کا سا سلوک کیا جائے اور کھانے پینے چیزوں کی دکانوں پر ان کے لیے علیحدہ برتن رکھیں جائیں۔ کچھ مدت تک ضلع گوجرانوالہ میں اس امر پر بھی زور دیا گیا ہے کہ احمدیوں کو مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ صرف پولیس کی مداخلت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایسے واقعات نہ ہونے پائے۔ احمدیوں نے جو اس نئی حرکت سے بہت زیادہ مضطرب ہو گئے تھے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو درخواست دی کہ انہیں اپنا علیحدہ قبرستان بنانے کے لیے زمین الاٹ کی جائے۔ یکم فروری ۱۹۵۳ء کو سرگودھا میں مسلمانوں کے قبرستان میں ایک احمدی میّت کی تدفین کے خلاف مزاحمت کی گئی۔ پولیس موقع پر پہنچ گئی جس سے صورتحال پر قابو پا لیا گیا۔ احمدیوں کے مجلسی مقاطعہ کی تلقین کھلم کھلا کی جا رہی ہے۔ منٹگمری میں ایک مقرر نے کہا کے احمدیوں کی دکانوں پر پکٹنگ کی جائے۔ اور ان کو عوامی کنوؤں سے پانی بھرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ شورش کا لہجہ قطعی طور پر نہایت پست اور مبتذل صورت اختیار کر گیا ہے۔ صوبے بھر میں رضا کاروں کی بھرتی کے لیے ایک مہم کا آغاز کر دیا

مقررین یہ کہہ رہے ہیں کہ عزت مآب وزیراعظم کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانا چاہیے۔

۴۔ کہا جاتا ہے کہ ڈائریکٹ ایکشن، کراچی میں شروع کیا جائے گا اور اس کے لیے رضا کار پنجاب اور دوسرے صوبوں سے بھیجے جائیں گے 'ڈائریکٹ ایکشن احمدیوں کی دکانوں پر پکٹنگ کی شکل اختیار کرے گا۔ یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر دفعہ ۱۴۴ کے ماتحت احکام جاری کیے گئے تو ان کی خلاف ورزی کی جائے گی۔ مطالبات حسب ذیل ہیں:۔

(ا) سر ظفر اللہ خاں کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔

(اا) احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

(ااا) جو احمدی حکومت کے کلیدی عہدوں پر قابض ہیں ان کو عہدوں سے موقوف کیا جائے۔

۵۔ اس شورش کو جماعت اسلامی، اہلسنت والجماعت، اہلحدیث اور شیعوں کی حمایت حاصل ہے۔ پیر صاحب گولڑہ شریف (ضلع راولپنڈی) پیر صاحب سیال شریف (ضلع سرگودھا) پیر صاحب علی پور سیداں (سیالکوٹ) پیر شوکت حسین (سجادہ نشین پیر صاحب ملتان) اور بعض دیگر حضرات نے اس شورش کو برکت کی دعا دی ہے سرمایہ جمع کیا جا رہا ہے اور ایک روپے کے نوٹ (رسیدیں) چھاپ کر فروخت کیے جا رہے ہیں۔ بازاری اور غنڈا عناصر نے بھی شورش پسندوں کی تائید و حمایت اختیار کر لی ہے۔ آزاد پاکستان پارٹی کی شاخ بہاولپور نے شورش پسندوں کو ایک ہزار روپے کی رقم عطا کی ہے۔

۶۔ جب یہ معلوم ہوا کہ عزت مآب وزیراعظم ۱۶ تاریخ کو لاہور آ رہے ہیں تو ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا۔ جس میں اعلان کیا گیا کہ وزیراعظم کے دورہ کی تاریخ کو ہڑتال کی جائے اور مکانوں کی چھتوں پر کالی جھنڈیاں لگائی جائیں۔ مقررین نے احتیاطاً نے اس بات پر زور دیا کہ تشدد سے کام نہ لیا جائے۔ لیکن علما عوام کے احساسات کو مشتعل کرنے میں برابر مشتعل رہے۔ بعض مقررین نے اپنی تقریروں میں کہا کہ نافرمانی شروع ہونے کی حالت میں پولیس کے جن ملازموں کو گرفتاریاں کرنے کا حکم دیا جائے انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ روز

ہے کہ ایک دفعہ زور فصاحت میں اس مقرر نے اعتراف کیا کہ وہ اور ان کی جماعت تقسیم ملک کے خلاف تھے، وہ لوگوں پر ظاہر ہونے چاہئیں لیکن اگر اب تک انہیں ان کا شعور حاصل نہیں ہوا تو ایک یا دو سال کے اندر انہیں سب معلوم ہو جائے گا۔ اس نے حکومت کی شدید مذمت کی اور اس کے حملوں کا سب سے بڑا ہدف وزیر اعظم پاکستان تھے۔ اس جلسے میں مقررین پاکستان نے پنجاب اور صوبہ سرحد کے چیف منسٹروں کو بھی برا بھلا کہا۔ وزیر اعظم پاکستان کو کھلم کھلا مرزائی کہا جا رہا ہے۔ ایک اور جلسہ میں عطاءاللہ شاہ بخاری نے ان کو 'بدھو الذین احمقون کہا'۔ ان تقریروں کی خصوصیت صرف تحقیر تھی۔

۲۔ جس زمانے میں غذا کی کمی ہو، بیروزگاری عام ہو، کاروبار کی کساد بازاری ہو اور کشمیر کے متعلق عام خیال یہ ہو اس کو ہم کھو چکے ہیں۔ جو شخص بدنظمی اور ابتری پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ پاکستان کا دوست نہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ احرار اور دیگر علما جو ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ عوام کی توجہ ان سنگین مسائل کی طرف سے جو آج ملک کو درپیش ہیں۔ منحرف کرنے میں خاص طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔ اس ابتری کی وجہ سے عوام کا وہ عزم کمزور ہو جائے گا۔ جو ان مسائل کا مقابلہ اور ان کا مداوا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ہمارے پاس اس امر کی شہادت موجود ہے کہ احرار نے آزاد پاکستان پارٹی کی شاخ بہاولپور سے روپیہ لیا۔ یہ لوگ پاکستان کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ حکومت کو کمر ہمت باندھ کر اس خطرے کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ حکومت پڑھے لکھے طبقے کی ہمدردی کھو چکی ہے اور اب غیر ملکی لوگوں پر بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ غالباً حکومت اس بحران کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی جو علما نے پیدا کر رکھا ہے۔ 'لندن ٹائمز' کے نمائندے نے حکومت پنجاب کے ایک افسر سے یہ کہا کہ مرکزی حکومت کمزور ہے اور موجودہ مسائل کے موثر مداوا کی اہلیت نہیں رکھتی۔ رات لاہور کے برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر نے مجھے بتایا کہ ایسی اطلاعات موصول ہوئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کی صورتحال بیحد تشویش انگیز ہے۔ اور ایک عام ہنگامہ عنقریب برپا ہونے والا ہے۔ حسین شہید سہروردی، ملک خضر حیات خاں اور نواب ممدوٹ برطانوی ڈپٹی

کی گئی تھی کہ مرکزی حکومت کو بتا دیں کہ حکومت پنجاب کی رائے میں مطالبات غیر معقول ہیں اور سختی سے ان کی مزاحمت ہونی چاہیے۔ کابینہ کا اجلاس ۹ بجے شب تک جاری رہا۔ لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ بعد کی صبح کو دو بجے کابینہ کا ایک اور اجلاس طلب کیا گیا۔ کیونکہ یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ اس دن صبح کو رضا کار گورنر جنرل اور وزیر اعظم کی کوٹھیوں پر پکٹنگ کریں گے۔ اس اجلاس میں گورنر سندھ، گورنر صوبہ سرحد، وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد، چیف کمشنر اور انسپکٹر جنرل پولیس کراچی۔ سیکرٹری وزارت داخلہ اور ڈپٹی چیف سٹاف شریک تھے۔ اس میں مندرجہ ذیل فیصلے کیے گئے:۔

(۱) اس شورش کے تمام نمایاں لیڈر بشمول مولانا اختر علی خاں مالک ''زمیندار'' گرفتار کر لیے جائیں۔

(۲) ''آزاد''، ''زمیندار'' اور ''الفضل'' کی اشاعت روک دی جائے۔

(۳) مرزا بشیر الدین محمود کو تنبیہ کی جائے کہ وہ ربوہ سے باہر نہ جائیں۔ نہ کوئی ایسا فعل کریں جس سے ہیجان واشتعال پیدا ہونے کا احتمال ہو۔

(۴) رضا کاروں کو کراچی آنے سے روکا جائے ان کے خلاف اسی سٹیشن پر کاروائی کی جائے جہاں سے وہ سوار ہو رہے ہوں۔ ان فیصلوں سے مسلح ہونے کے بعد مسٹر چھٹہ وزیر مال، مسٹر غیاث الدین احمد ہوم سیکرٹری اور مسٹر انور علی انسپکٹر جنرل پولیس اسی دن لاہور واپس چلے آئے۔

ابتدائی تدابیر

مجلس عمل پنجاب میں جس دن قائم ہوئی تھی۔ اس نے تیاریاں شروع کر دیں تھیں تا کہ اگر حکومت سے تصادم ناگزیر ہو جائے تو بڑے پیمانے پر مقابلہ کیا جا سکے۔ چنانچہ جب ۲۲ جنوری کو وزیر اعظم کے سامنے الٹی میٹم پیش کیا گیا۔ اس وقت سول نافرمانی کا سارا ساز و سامان تیار تھا۔ رضا کار، سرمایہ، مورچے کے مقامات، مجالس عمل، ڈکٹیٹروں کی فہرست ہر چیز مکمل تھی۔ عوام حکومت اور احمدیوں کی نفرت سے لبریز تھے اور کسی قسم کی نظریاتی مزاحمت کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ڈائریکٹ

اطلاع دی جائے تا کہ سر براہ ان کی گرفتاریوں کا انتظام کیا جا سکے۔

(vii) ہوم سیکرٹری ۲۸ تاریخ کو ایک پریس کانفرنس منعقد کریں جس میں اخباروں کو حکومت کا نقطہ نگاہ سمجھائیں اور ان سے اپیل کریں کہ وہ لوگوں کو صبر و سکون اور ضبط کی تلقین کریں۔

(viii) ایک گشتی مراسلہ تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کو بھیجا جائے جس میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اس اقدام کا پس منظر واضح کی جائے۔ان افسروں کو یہ بھی کہا جائے کہ وہ معقول و سنجیدہ عناصر کی امداد سے عوام کو قانون و انتظام کی اہمیت کا قائل بنائیں''۔

224

ہوم سیکرٹری نے مندرجہ ذیل لاسلکی پیغام فی الفور اضلاع راولپنڈی، گجرات، سیالکوٹ، لائل پور، منٹگمری، ملتان، سرگودھا اور شیخوپورہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کوارسال کر دیا ہے:۔

''چونکہ احمدیوں کے خلاف شورش بدترین صورت اختیار کر گئی ہے۔اس لیے ذیل کے اشخاص کو زیر دفعہ ۳ پبلک سیفٹی ایکٹ چودہ دن کے لیے گرفتار کر لیجیے۔مزید نظر بندی کے احکامات حکومت جاری کرے گی اور مناسب وقت کے اندر اندر ارسال کر دے گی۔آپ دونوں میں جسے جو صاحب بھی صدر مقام پر موجود ہیں وہ ۲۷۔۲۸ فروری کی درمیانی رات کو یہ کاروائی کر کے تعمیل کی رپورٹ بھیج دیں۔چٹھی اس پیغام کے ساتھ بھیجی جا رہی ہے۔

صرف پولیس سپرنٹنڈوں کے لیے:۔تا احکام ثانی آپ روزانہ ضمنیاں ڈی آئی جی سی آئی ڈی کو لاسلکی کے ذریعے بھیجا کریں۔یہ ضمنیاں مختصر ہونی چاہیں۔ان میں ہر قسم کی اہم معلومات جو دستیاب ہو سکے درج ہونی چاہیے۔یہ بھی بتایا جائے کہ حکومت کے اقدام کا عام ردِّعمل کیا ہے۔خصوصاً اگر لاہور یا کراچی کو رضا کار بھیجنے یا مقامی طور پر سول نافرمانی کرنے یا اس سلسلے میں سرمایہ فراہم کرنے کی سرگرم کوشش نظر آئے تو اس کی پوری اطلاع دی جائے۔

راولپنڈی: مولوی غلام اللہ خاں خطیب مسجد پرانا قلعہ۔راولپنڈی

گوجرانوالہ: مولوی محمد اسماعیل گوجرانوالہ شہر

سیالکوٹ: (۱) قاضی منظور احمد رنگپورہ سیالکوٹ شہر۔ (۲) غازی محمد حسین سالار تاندلیانوالہ (۳) مولوی عبیداللہ لائل پور۔

منٹگمری:۔ (۱) مولوی عبیداللہ جامعہ رشیدیہ منٹگمری (۲) مولوی لطف اللہ خاں منٹگمری۔

ملتان: (۱) محمد علی جالندھری ملتان (۲) قاضی احسان احمد شجاع آبادی ضلع ملتان (۳) شیخ محمد سعید خانیوال ضلع ملتان

سرگودھا:۔ مولوی عبداللہ۔ سرگودھا۔

شیخوپورہ: قاضی محمد امین۔ شیخوپورہ''

225

ایک اور لاسلکی پیغام کے ذریعے سے ضلع گجرات، جہلم، کیمبل پور، جھنگ، ڈیرہ غازی خاں، میانوالی، مظفر گڑھ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور پولیس سپرنٹنڈنٹوں کو اطلاع دی گئی ہے کہ دوسرے اضلاع میں احمدیوں کے خلاف شورش کے سلسلے میں جماعت احرار کے بعض ممبروں اور بعض غیر احراریوں کی گرفتاری کے احکام صادر کیے گئے ہیں۔ لہٰذا آپ لوگ چوکنے رہیے اور اگر آپ کے اضلاع میں کوئی اہم واقعہ رونما ہو یا ہونے کی توقع ہو تو فی الفور حکومت کو اطلاع دیجیے۔

ایک ''نہایت فوری'' انتہائی مُرجح''۔ خفیہ'' او ٹی پی مرموز تار مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء مرکزی حکومت کی طرف سے حکومت پنجاب کو موصول ہوا جس میں اول الذکر نے مطالبات کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا تھا:۔

۲(۱) احمدی ہوں یا پاکستانیوں کا کوئی دوسرا طبقہ ہو اس کو اسکی خواہشات کے خلاف اقلیت قرار نہیں دیا جاسکتا یہ امر حکومت کے وظائف میں داخل نہیں ہے کہ وہ کسی گروہ کو زبردستی اقلیت بن جانے پر مجبور کرے۔

(ii) احمدیوں کو صرف اس بنا پر کہ وہ احمدی ہیں حکومت کے کلیدی عہدوں سے برطرف نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کسی وزیر کو عہدے سے برطرف کرنے کے لیے ایک آئینی مشینری مہیا ہے۔ جب تک کسی وزیر کو اپنے رفقائے کار کا اور مرکزی اسمبلی میں منتخب نمائندگان جمہور کا

اعتماد حاصل رہے، اس کو عہدے سے برطرف نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی وزیر صرف اس لیے عہدے سے برطرف نہیں کیا جاسکتا کہ عوام کا ایک طبقہ 'ڈائرکٹ ایکشن' کی دھمکی دے کر اس کی برطرفی کا مطالبہ کررہا ہے۔ کوئی سرکاری ملازم خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم حکومت کے کسی ماتحت عہدے سے محض اپنے مذہب کی وجہ سے موقوف نہیں کیا جاسکتا۔

(III) حکومت کے کلیدی عہدوں سے احمدیوں کی برطرفی کا مطالبہ بظاہر اس اندیشے کی بنا پر کیا جارہا ہے کہ غالباً وہ لوگ اپنے مخصوص فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کی غرض سے اپنی پوزیشن کا ناجائز استعمال کریں۔ اس اندیشے کو دور کرنے کے لیے حکومت نے سخت ہدایات جاری کر دی ہیں کہ کوئی وزیر یا سرکاری افسر اپنے فرقے کے عقائد کی تبلیغ نہ کرے۔

226

(۳) مرکزی حکومت پیراگراف ۲ کے مطابق کوئی سرکاری اعلان کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تاکہ وقتی صورتحال اس قسم کے اعلان کی متقاضی نہ ہو لیکن صوبائی حکومتوں سے استدعا کی جاتی ہے کہ فی الفوران خطوط پر نشر واشاعت کا وسیع انتظام کریں اور اخبارات کی مناسب رہنمائی کریں۔

۴۔ کراچی میں اس شورش کے نمایاں لیڈروں کی گرفتاری کے بعد آج ایک سرکاری اعلان جاری کیا جارہا ہے یہ ضروری ہے کہ احراریوں کو شورش کے ان حامیوں سے جو نسبتاً کم جوشیلے ہیں علیحدہ اور منقطع کر دیا جائے اور فی الحال حملے کو احراریوں ہی پر مرتکز کیا جائے۔ سرکاری اعلان میں احراریوں کے متعلق جو طریق اختیار کیا گیا ہے اس کو تقویت دینے کے لیے احراریوں کی گزشتہ بدافعالیوں اور موجودہ افتراق انگیز سرگرمیوں کی پرزور اشاعت کی جائے''۔

مرکزی حکومت کے سرکاری اعلان میں یہ صراحت کی گئی کہ احمدیوں کے خلاف شورش کو احراریوں نے منظم کیا ہے۔ اور ان کے ماضی سے ظاہر ہے کہ وہ تقسیم سے پیشتر کانگرس اور ان دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے جو قائداعظم کی اس جدوجہد کے خلاف صف آرا ہو رہی تھیں جو مرحوم نے مسلمانوں کی آزادی کے لیے جاری کر رکھی تھیں۔ اس جماعت نے اب تک

پاکستان کے قیام کو دل سے گوارا نہیں کیا۔ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا کریں۔اور پاکستان کے استحکام کے متعلق عوام کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائیں اس شورش کا یہ مقصد بالکل واضح ہے کہ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر فرقہ وار اختلاف کی آگ کو بھڑکایا جائے اور مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کردیا جائے۔اب اس شورش کے علمبرداروں نے فیصلہ کیا ہے کہ ''ڈائریکٹ ایکشن'' کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی بڑے پیمانے پر فسادات برپا کرنے کا منصوبہ بھی تیار کرلیا ہے تاکہ اس کے طریقے سے حکومت ان کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جائے۔کوئی قابل ذکر حکومت ملت کے کسی طبقے کے ''ڈائرکٹ ایکشن'' سے مرعوب نہیں ہوسکتی حکومت نے عزم مصمم کرلیا ہے کہ اپنے تمام ذرائع و وسائل سے کام لیکر قانون و انتظام کو برقرار رکھے گی۔اگر امن عامہ میں خلل ڈالا گیا تو قانون اپنا کام کریگا اور اس کو توڑنے والے اس کے نتائج کو بھگتیں گے۔اس سرکاری اعلان میں جمہور کے تمام طبقوں سے اپیل کی گئی کہ خلاف قانون سرگرمیوں کو ہرگز روا نہ رکھیں اور کوئی ایسا فعل نہ ہونے دیں جس سے پاکستان کی سلامتی یا استواری کو کسی اعتبار سے بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔

اس سرکاری اعلان کی نقول چیف سیکرٹری نے ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء کو تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں اور ڈویژنل افسروں کے نام ارسال کیں اور ان کو اطلاع دی حکومت نے جماعت احرار کے سرغنوں اور بعض دوسرے اشخاص کو جو اس شورش میں سرگرم حصہ لے رہے تھے گرفتار کرنے کا حکم صادر کیا ہے ''آزاد'' اور ''الفضل''، جو علی الترتیب احراریوں اور احمدیوں کے جماعتی آرگن ہیں۔ممنوع الاشاعت قرار دیے گئے ہیں۔اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے اضلاع کی صورتحال پر چوکنے ہو کر نگاہ رکھیں۔اس منسلکہ چٹھی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ مرکزی حکومت کے سرکاری اعلان کی بنیادوں پر حکومت کا نقطہ نگاہ جمہور پر واضح کریں۔اور اس حقیقت پر خاص زور دیں کہ یہ شورش احراریوں نے صرف اپنے اغراض و مقاصد کے لیے برپا کی ہے اور حکومت کے اقدامات کا رخ زیادہ انہی کی طرف ہے۔اس چٹھی میں حکام اضلاع پر حکومت کا یہ منشا بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ کوئی مزید گرفتاریاں نہ کی جائیں تاوقتیکہ مقامی حالات کے ماتحت ایسا اقدام

حصہ سوم

فسادات

(۲۷ فروری سے فسادات کے خاتمے تک)

231

فسادات کا حال

مجلس عمل کے ممبر ۲۷ فروری کو کراچی میں گرفتار کر لیے گئے۔ تحریک کے جو لیڈر کراچی میں تھے۔ ان کی طرف سے ٹیلیفون پر لاہور میں ہدایات موصول ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس وقت تک رضا کاروں کے چند دستے لاہور سے کراچی کو روانہ ہو چکے تھے۔ جو دستہ ۲۷ فروری کو غازی علم الدین کی سرگردگی میں روانہ ہوا تھا اس کو پنجاب پولیس نے لودھراں ریلوے سٹیشن پر روک کر ٹرین سے اتار لیا۔ باقی دو دستے جن میں سے ایک ۲۵ کو زیر سرکردگی معراج الدین سالار اور دوسرا ۲۶ کو زیر سرکردگی صاحبزادہ فیض الحسن روانہ ہوا تھا کراچی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور وہاں گرفتار کر لیے گئے۔ ۲۶۔ ۲۷ فروری کی درمیانی رات کو کراچی میں جس اقدام کا فیصلہ ہوا تھا اس پر حکومت پنجاب نے عمل کیا۔ اور وہ اشخاص جن کی فہرست انسپکٹر جنرل پولیس نے کراچی سے واپسی پر تیار کی تھی، گرفتار کر لیے گئے۔ ان گرفتاریوں سے صوبے بھر میں اور بالخصوص لاہور میں اور سیالکوٹ گوجرانوالہ راولپنڈی لائل پور اور منٹگمری کے شہروں میں برہمی اور لاقانونی کی ایک لہر دوڑ گئی اور لاہور میں بدنظمی اور ابتری کا سیلاب اس قدر قابو سے باہر ہو گیا کہ ۶ مارچ کو فوج شہر میں داخل ہو گئی اور مارشل لا کا اعلان کر دیا گیا۔

لاہور

۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کراچی کے فیصلے کی تعمیل میں مولانا اختر علی خاں کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا۔ لیکن جب پولیس افسر نے جو اس وارنٹ کی تعمیل پر مامور تھا، یہ وارنٹ مولانا کو دکھایا تو انہوں نے کہا اگر مجھے گرفتار نہ کیا جائے تو میں لکھ دینے کو تیار ہوں کہ اس شورش سے قطع تعلق کر لوں گا۔ پولیس افسر انہیں سول لائنز کے تھانے میں لے گیا وہاں مولانا نے یہ معافی نامہ لکھ کر دے دیا:۔

’’میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ تحریک نے جو شکل اختیار کر لی ہے وہ پاکستان کی سالمیت کے لیے نقصان رساں ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر تحریک اس طریقے سے جاری رہی تو پاکستان کے دشمن اس سے ناواجب فائدہ اٹھائیں گے اور ہر پاکستانی ایسی تحریک کو ناپسند کرے گا جس سے پاکستان کی سالمیت تباہ ہو جائے۔ اس تحریک کا موجودہ رجحان ملک میں افتراق اور ابتری پید کرنے کا موجب ہوگا۔ اگر خدانخواستہ فسادات بڑھ گئے اور حکومت قوت استعمال کرنے پر مجبور ہوگئی تو یہ امر فریقین کے لیے سخت ذلت کا باعث ہوگا میری رائے میں مسلمان کے خون کا ایک قطرہ پوری کائنات سے بھی زیادہ بیش بہا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس معاملے میں مزید غور کرنا چاہیے تاکہ صورتحال کو درست کیا جا سکے۔ میرا کوئی تعلق موجودہ ’’ڈائریکٹ ایکشن‘‘ سے نہیں ہے۔ میں نے نہ کبھی تشدد کی حمایت کی ہے نہ میں گورنر جنرل وزیراعظم اور دوسرے اکابر پاکستان کو ملامت و دشنام کا نشانہ بنانے ان کے جنازوں کے جلوس نکالنے نہ ان کی کوٹھیوں پر پکٹنگ کرنے کا حامی رہا ہوں۔ اس قسم کے افعال کا ارتکاب تو درکنار، میری رائے میں ایسے افعال کا تصور بھی کسی صحیح الخیال پاکستانی کے لیے زیبا نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے ملک کے داخلی نظم ونسق کو مستحکم کرنے اور غیر ممالک کی نظروں میں حکومت کی ساکھ اور عزت کو بلند کرنے کے لیے ایسے افعال کے ارتکاب سے اجتناب کریں۔ جن کا نتیجہ یہ ہو کہ ہم دنیا کی نگاہوں میں اضحوکہ بن جائیں۔‘‘

اس تحریر کی رو سے مولانا کے نزدیک مسلمانوں کے خون کا ایک قطرہ پوری کائنات سے زیادہ قیمتی تھا۔ ''ڈائریکٹ ایکشن'' کے ساتھ مولانا کا کوئی تعلق نہ تھا۔ تحریک نے جو صورت اختیار کر لی تھی وہ پاکستان کے استحکام کے لیے خطرناک تھی۔ مولانا ہر قسم کے تشدد اور بدنظمی کے خلاف تھے۔ وہ ایسی باتوں کو روا رکھنے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ وزیر اعظم یا دوسرے رہنماؤں کے جنازے نکالے جائیں یا ان کی کوٹھیوں پر پکٹنگ کی جائے۔ اور وہ ہر شے کے مخالف تھے جس سے پاکستان اور اس کے باشندے اضحوکۂ روزگار بن جائیں۔ اس ذلت آمیز معافی نامے کی بنا پر مولانا اختر علی خاں گرفتار نہ کیے گئے۔ نہ ان کے اخبار ''زمیندار'' کے خلاف کوئی کاروائی کی گئی تا آنکہ ۲۸ فروری کو اس نے وہ رویہ اختیار کیا۔

233

۲۸۔ فروری ۱۹۵۳ء: جونہی ۲۷ فروری کو کراچی میں اور ۲۷۔۲۸ فروری کی شب کو لاہور میں لیڈروں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں، لاہور میں دکانیں بند ہوگئیں اور بعض اشخاص کی ٹولیاں غیر رضامند دکانداروں کو دکانیں بند کرنے پر مجبور کرنے کے لیے بازاروں میں چکر کاٹنے لگیں۔ تیسرے پہر باغ بیرون دہلی دروازہ میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ جہاں گرفتاری کے لیے تیار ہونے والے بعض رضا کاروں کو ہار پہنائے گئے۔ اور ان کا ایک جلوس نکالا گیا جو سول سیکرٹریٹ کی طرف روانہ ہوا لیکن راستے میں ہجوم نے اپنا راستہ بدل لیا اور گورنمنٹ ہاؤس پہنچنے کے لیے مال روڈ پر چل دیا۔ ہجوم کی تعداد پانچ اور چھ ہزار کے درمیان تھی اور اس کا رجحان بظاہر تشدد کی طرف نہ تھا شرکائے جلوس صرف حکومت کے خلاف پولیس کے خلاف اور احمدیوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ چیرنگ کراس کے قریب جلوس کو روکا گیا اور اس کو منتشر ہونے کی ہدایت دی گئی۔ اس وقت وہاں کمشنر، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس پہنچ چکے تھے۔ ہار پہنے ہوئے رضا کاروں نے باہر نکل کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ لیکن ان سے کہا گیا کہ عام جلسوں اور جلوسوں پر چونکہ کوئی پابندی نہیں اور انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اس لیے وہ گرفتار نہیں کیے جا سکتے۔ تاہم رضا کاروں نے گرفتاری پر اصرار کیا۔ اس پر

ٹریفک کے لیے سڑک صاف کرنے کی غرض سے زیر دفعہ ۱۰۷/۱۵۱ ضابطہ فوجداری چونتیس اشخاص گرفتار کر لیے گئے۔ ان کو ٹرک میں بٹھایا گیا اور شہر سے کچھ فاصلے پر لیجا کر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد ہجوم منتشر ہو کر مختلف اطراف کو روانہ ہو گیا۔ اس سے کچھ دیر بعد کمشنر، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس سول لائینز کے تھانے میں جمع ہوئے اور انہوں نے صورتحال پر گفتگو کرنے کے بعد عام جلسوں اور جلوسوں کو ممنوع قرار دینے کا فیصلہ کیا۔

یکم مارچ: یہ جلوس اور گرفتاریوں کا دن تھا

مولانا اختر علی خاں کے معافی مانگ لینے کی خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ عوام غضبناک ہو کر انہوں نے میکلوڈ روڈ پر مولانا کے مکان کو گھیر لیا۔ پولیس کا ایک دستہ وہاں پہنچ گیا اور جب مولانا کے بیٹے نے ہجوم کو یقین دلایا کہ مولانا اپنے گاؤں کرم آباد (ضلع گوجرانوالہ) میں ہیں تو ہجوم منتشر ہو گیا۔ تقریباً اسی وقت مولانا احمد علی نے دہلی دروازے کے باہر ایک بڑا جلوس مرتب کیا۔ یہاں ہجوم تشدد پر آمادہ معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے خشت باری کر کے پولیس کی ایک گاڑی کو نقصان پہنچایا مولانا احمد علی زیر دفعہ ۳۔ پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کر لیے گئے۔ اور تینتیس اشخاص کی گرفتاری زیر دفعہ ۱۰۷/۱۵۱ ضابطہ فوجداری عمل میں آئی۔ ایک اور جلوس ہائی کورٹ کی عمارت کے نزدیک نمودار ہوا جو گورنمنٹ ہاؤس کی طرف جانا چاہتا تھا۔ یہ جلوس روک دیا گیا اور ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ۱۲۹ اشخاص کو گرفتار کر لیا۔ اسی افسر نے مال روڈ پر ایک جلوس کا سامنا کیا اور ۲۳ مزید افراد کو گرفتار کر لیا۔ تیسرے پہر ایک بڑا جلوس دہلی دروازے سے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہوا جس کو چیرنگ کراس کے قریب روکا گیا۔ اس وقت کمشنر، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ موجود تھے۔ بہت سے لوگوں نے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ وہ بھی ٹرکوں پر سوار کرائے گئے اور یوم گزشتہ کی طرح لاہور سے کچھ فاصلے پر لے جا کر اتار دیے گئے۔ اس کے بعد ہجوم تشدد کے کوئی آثار ظاہر کیے بغیر منتشر ہو گیا۔

۲۔ مارچ: معلوم ہوتا ہے کہ جب بعض لوگوں نے سنا کہ مولانا اختر علی خاں نے معافی

مانگ لی ہے اور اب کرم آباد جا کر اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔تو بعض مقامی آدمی ان کے پاس وہاں گئے اور انہیں بزدلی کا طعنہ دیا۔مولانا نے الزام کی صحت سے انکار کیا اور یکم مارچ کی شام کو یا ۲ مارچ کی صبح کو لاہور پہنچ گئے۔انہوں نے وزیر خاں کی مسجد میں جا کر لوگوں پر اپنا موقف واضح کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ میں اس تحریک کا اسی طرح وفادار ہوں جیسے پہلے تھا۔انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ میں تیسرے پہر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کروں گا۔چنانچہ شام کے وقت دس ہزار کا ایک جلوس مسجد سے نکلا یہ ہجوم نہایت تند اور سرکش تھا۔یہ جلوس چیرنگ کراس پر روکا گیا۔جہاں کمشنر، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈی آئی جی پولیس اور سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس موجود تھے یہ مجمع خلاف قانون قرار دیا گیا۔مولانا اور بعض دوسرے اشخاص گرفتار کر لیے گئے اور ایک ایسی جگہ لے جائے گئے جس کے گرد پولیس نے حلقہ باندھ لیا تھا۔دفعتہً کوئی ایک ہزار اشخاص کے ہجوم نے اینٹوں، ڈبوں، بوتلوں اور دوسری چیزوں سے پولیس کے حلقے پر حملہ کیا۔اس حملے میں گیارہ پولیس افسر جن میں دو سپرنٹنڈنٹ پولیس یعنی مسٹر ذوالقرنین خاں اور مسٹر ٹیلر بھی تھے مجروح ہو گئے اور ہجوم پر لاٹھی چارج کرنا پڑا۔مولانا جیل پہنچا دیے گئے اور اکتالیس اشخاص بلوے کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے۔جو اشخاص اسے سے پہلے مولانا اختر علی خاں کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے تھے ان کو حسب معمول لاہور سے دور لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔اس پر ہجوم منتشر ہو گیا۔جب سب لوگ چلے گئے تو کمشنر، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی انسپکٹر جنرل پولیس نے سول لائینز کے تھانے میں اپنی کانفرنس منعقد کی۔چونکہ صورتحال نہایت تیزی سے بدتر ہو رہی تھی اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ جنرل آفیسر کمانڈنگ دہم ڈویژن کو اطلاع دی جائے اور استدعا کی جائے کہ وہ فوج لے کر آئیں اور سول حکام کی امداد کے لیے موجود رہیں۔جنرل آفیسر کمانڈنگ خود تو نہ آئے لیکن انہوں نے اپنے جی ایس او آئی (لفٹیننٹ کرنل شیر خاں) اور دوسرے افسروں کو بھیجا جنھوں نے یہ سمجھایا کہ اگر فوجی امداد کی ضرورت ہے تو اس کے لیے صوبائی حکومت کی طرف سے مطالبہ ضروری ہے۔اس پر کچھ بحث کی گئی۔سول کے حکام کا دعویٰ تھا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ حکومت کو کسی قسم کی اطلاع دیے بغیر یہ اختیار رکھتے ہیں کہ فوج

سے امداد طلب کریں۔ لیکن فوجی افسر اس موقف پر ڈٹے ہوئے تھے کہ اس معاملے میں چونکہ فوج کے مصارف کا سوال بھی شامل ہے کہ فوجی امداد کا مطالبہ رسماً صوبائی حکومت کی طرف سے آنا چاہئے۔۔ بحث کے دوران بھی انسپکٹر جنرل پولیس نے کہا کہ میں حکومت پنجاب کی جانب سے تحریری مطالبہ پیش کیے دیتا ہوں۔ لہذا ایک چٹھی کا مسودہ تیار کیا گیا جو ہوم سیکرٹری نے فوجی افسروں کے حوالے کر دیا چٹھی میں یہ لکھا تھا کہ چونکہ لاہور میں سخت فساد کے پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے اور یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ شاید سول حکام اس صورتحال کا میاب مقابلہ نہ کر سکیں لہذا حکومت پنجاب نے ہوم سیکرٹری کو ہدایت کی ہے کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس بدنظمی کے سدباب اور سرکوبی میں مدد دینے فوجی امداد طلب کریں۔ اس تحریری مطالبہ میں یہ امور درج نہ کیے گئے کہ فوج کی کتنی تعداد مطلوب ہے، کتنی مدت تک اس کی ضرورت ہوگی اور اس کی ڈیوٹیاں کس طریق پر لگائی جائیں گی اور کہا گیا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مناسب وقت کے اندر ان امور سے جی او سی صاحب کو مطلع کر دیں گے۔ اس کانفرنس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ زیر دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری کا ایک حکم صادر کر کے لاہور کارپوریشن کے مخصوص حصوں میں جلوس کا نکالنا ممنوع قرار دیا جائے۔ اسی شام کو چیف منسٹر کے مکان پر کابینہ کا ایک اجلاس ہوا۔ جس میں چیف سیکرٹری اور وہ سب افسر بھی شامل ہوئے جو سول لائینز کے تھانے میں اجلاس کر چکے تھے۔ سول لائینز کے تھانے میں جو فیصلے کیے گئے تھے۔ ان کو کابینہ نے منظور کر لیا اور آدھی رات سے کچھ بعد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۴۔ ضابطہ فوجداری کا حکم صادر کیا کہ لاہور شہر کی کارپوریشن کی حدود کے اندر پانچ یا پانچ سے زیادہ آدمیوں کا اجتماع ممنوع ہے اور وہ رقبہ اس سے مستثنٰے رکھا گیا ہے۔ جس کے گرد سرکلر روڈ واقع ہے۔

۳ مارچ: اس دن نسبتاً خاموشی رہی۔ کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ فوج جناح گارڈن میں پہنچ گئی اور اس نے صبح کو سول لائینز اور کارپوریشن کے رقبہ شہر میں گشت لگانا شروع کیا۔ اندرون فصیل کا شہر مستثنٰے رکھا گیا۔ بارڈر پولیس بھی حرکت میں آ گئی تھی۔ بعض غیر اہم جلوس اندرون فصیل اور بعض ایسے رقبوں میں بھی نکالے گئے جو حکم زیر دفعہ ۱۴۴ میں آتے تھے۔ انارکلی میں اکتیس آدمی دفعہ ۱۴۴ کے

احکام کو توڑنے کی وجہ سے گرفتار کیے گئے۔ اور ایک پر شور و سرکش جلوس جو نیلا گنبد سے مال روڈ کی طرف آ رہا تھا۔ ٹولنٹن مارکیٹ کے قریب لاٹھی چارج سے منتشر کیا گیا جس کا حکم مسٹر ایم اے کے چودھری اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے دیا تھا۔ دو اور ہجوم بھی روکے گئے اور ان کو انسپکٹر جنرل پولیس نے خود ایک پولیس کے دستے سے لاٹھی چارج کرا کر منتشر کر دیا۔ اس دن صرف ایک ہی سنگین واقعہ ہوا کوئی ایک سو آدمیوں کا ہجوم میکلوڈ روڈ سے منٹگمری کے راستے سے چیرنگ کراس کی طرف بڑھ رہا تھا اس ہجوم نے پولیس کی ایک پارٹی پر پتھر برسائے۔ جو زیر سرکردگی آغا سلطان احمد انسپکٹر نولکھا مامور تھی۔ پولیس نے ہجوم پر تین راؤنڈ چلائے جن سے کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔

شام کو یہ دیکھا گیا کہ فوج نے گشت کرنا بند کر دیا ہے۔

237

۴ مارچ: اس دن کابینہ کا ایک اجلاس ہوا جس میں چیف سیکرٹری، ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس نے ایک تقریر کی رپورٹ پڑھ کر سنائی جو شب گزشتہ مولانا عبدالستار خاں نیازی نے مسجد وزیر خاں میں کی تھی۔ یہ تقریر سخت اشتعال انگیز تھی اور مقرر کی گرفتاری کے لیے ہوم سیکرٹری نے زیر دفعہ ۳ پبلک سیفٹی ایکٹ ایک حکم صادر کیا تھا۔ لیکن اس کی تعمیل نہ ہو سکی تھی کیونکہ جس مسجد میں نیازی نے اپنے آپ کو مسند نشین کر رکھا تھا۔ وہ شورش پسندوں کا ایک مضبوط گڑھ بن چکی تھی جس میں داخلہ محال تھا۔

فوج نے بظاہر ہیڈ کوارٹر کے احکام کے ماتحت گشت لگانا بند کر دیا تھا بلکہ ایک یا دو کمپنیاں جناح گارڈن سے واپس چھاؤنی بھی چلی گئی تھیں۔ بہت سے جلوس نکالے گئے اور منتشر ہو گئے۔ ان میں سے ایک جلوس نے احمدیہ بلڈنگز کا محاصرہ کر لیا جس کو اسسٹنٹ سب انسپکٹر محمد اکرم نے ہلکے لاٹھی چارج سے منتشر کر دیا۔ اب ٹرینوں سے اور لاریوں سے رضا کاروں کے بے شمار دستے لاہور میں داخل ہو رہے تھے۔ سرگودھا کے رضا کاروں کے ایک دستے کو سب انسپکٹر محمد حامد نے نولکھا تھانہ کے قریب منتشر کیا۔ برانڈرتھ روڈ پر ایک سو دس رضا کاروں کے ایک اور دستے نے سید حسنات احمد سٹی مجسٹریٹ، ملک خاں بہادر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا سامنا

کیا۔رضا کاروں نے منتشر ہونے سے انکار کیا۔اور چوک دال گراں پہنچے۔ جہاں ان پر اشک آور گیس چھوڑی گئی۔وہ پھر منتشر نہ ہوئے۔اور زمین پر بیٹھ گئے۔جب لاٹھی چارج بھی غیر موثر ثابت ہوا تو پولیس والوں نے ان کو ایک ایک کر کے اٹھایا۔ٹرکوں میں ڈالا اور لے گئے۔اس واقع کے متعلق غلط افواہیں فوراً پھیلنے لگیں۔ظاہر کیا گیا۔کہ پولیس نے رضا کاروں کو منتشر کرتے ہوئے قرآن مجید کی توہین کی،اس کو ٹھوکریں لگائیں،اس کے اوراق پھاڑے اور ایک چھوٹے سے لڑکے کو ہلاک کر دیا۔دہلی دروازے کے باہر جلسہ ہوا جس میں ایک لڑکا پیش کیا گیا جو اپنے ہاتھ میں قرآن مجید کے چند پھٹے ہوئے اوراق لیے ہوئے تھا۔اس نے بیان کیا کہ میں کلام الٰہی کی توہین کا عینی گواہ ہوں۔ایک مولوی (غالباً مولوی محمد یوسف) نے یہ اوراق ہاتھ میں لے کر حاضرین کو دکھائے اور [illegible]یت پر تشدد تقریر کی جس سے غصے میں بھرا ہوا مجمع اور بھی زیادہ غضبناک ہو گیا۔واقعہ کی یہ بناوٹی کہانی ہر جگہ جوش میں بھرے ہوئے لوگوں کا موضوع گفتگو بن گئی۔اور چند ہی گھنٹوں کے اندر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی جس سے پولیس کے خلاف غیض و نفرت کے جذبات برانگیختہ ہو گئے۔

ہم نے دال گراں کے واقعہ کا مذکورہ حال تحریری بیانات اور افسروں کی شہادت سے اخذ کیا ہے۔لیکن اس کے متعلق احراریوں اور مجلس عمل والوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ قطعاً مختلف ہے ان کا قول یہ ہے کہ اس واقعہ کے دوران میں ایک پولیس افسر نے قرآن کو ٹھوکر ماری اور ایک چھوٹے سے لڑکے کو زدوکوب کر کے مار ڈالا۔اس قول کی تائید میں محمد نذیر گواہ نمبر ۳۲۔محمد حنیف گواہ نمبر ۳۳ شیخ محمد رفیق گواہ نمبر ۳۴ اور سراج دین گواہ نمبر ۳۷ نے بیان دیے ہیں۔عدالت نے سید حسنات احمد سٹی مجسٹریٹ اور ملک خاں بہادر خاں سپرنٹنڈنٹ پولیس (پنجاب کنسٹیبلری) کی شہادت بھی قلمبند کی ہے جو موقع پر موجود تھے۔غیر سرکاری گواہوں کا بیان ہے کہ رضا کاروں کا ایک دستہ چوک دال گراں کی طرف سے ریلوے سٹیشن کی طرف آ رہا تھا کہ پولیس نے اس کو روکا۔رضا کاروں سے منتشر ہونے کے لیے کہا گیا لیکن وہ بیٹھ گئے اور جب انہیں پاس کھڑے ہوئے ٹرکوں کی طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ زمین پر لیٹ گئے۔اور انہیں گھسیٹ کر لے جانا پڑا۔جو لوگ اسطرح گھسیٹے گئے

ان میں ایک بوڑھا آدمی بھی تھا جس کے پاس ایک حمائل تھی۔ جب وہ گھسیٹا جارہا تھا تو حمائل گر پڑی اور ایک پست قامت پولیس افسر نے جس کے گلے میں گلھڑ تھا اس کو ٹھوکر ماری اس معاملے کے متعلق گواہوں میں اختلاف ہے کہ آیا وہ حمائل ٹھوکر کھا کر نالی میں گر گئی یا وہیں زمین پر پڑی رہی۔ اور آیا وہ جزدان میں ملفوف تھی یا بغیر جزدان کے تھی جو شخص یہ جزدان پہنے ہوئے تھا وہ طلب نہیں کیا گیا نہ اس شخص کا کوئی اتا پتہ دیا گیا اور نہ اس لڑکے کے متعلق کوئی تفصیلات بتائیں گئیں ہیں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کو مار مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی مسلمان پولیس آفیسر خواہ وہ کتنا ہی لامذہب کیوں نہ ہو۔ کتاب اللہ کو ٹھوکر مار سکتا ہے اور اس شدید ترین کافرانہ حرکت کا مجرم بن سکتا ہے۔ ہمارے سامنے بحث میں اس امر کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ ممکن ہے کتاب اللہ نادانستگی کی حالت میں پامال کر دی گئی ہو۔ سید حسنات احمد اور ملک خاں بہادر خاں دونوں نے اس الزام کی صحت سے انکار کیا ہے۔ اور چونکہ اس بارے میں غیر سرکاری شہادت مایوس کن حد تک ناکافی اور قلیل ہے اس لیے ہم قبول نہیں کر سکتے کہ کسی نے قرآن مجید کو ٹھوکر ماری تھی یا کسی لڑکے کو مار مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

شورش پسندوں نے حکام کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے جو دوسری چالیں اختیار کیں وہ حسب ذیل تھیں:۔

(۱) اس مضمون کے اشتہار شائع کئے گئے کہ جھنگ اور سرگودھا میں ایک ہزار سے زیادہ اشخاص گولیاں مار مار کر ہلاک کر دیے گئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس دن ان مقامات پر ایک گولی بھی نہیں چلائی گئی۔

۲۔ یہ افواہ پھیلائی گئی کہ احمدی موٹر کاروں میں سوار ہو کر اندھا دھند لوگوں پر گولیاں چلا رہے ہیں۔

۳۔ مسجد وزیر خاں سے یہ اعلان کیا گیا کہ سرکاری ملازموں نے دفتروں میں یہ ہڑتال کر دی ہے اور تحریک میں شامل ہو گئے ہیں۔

۴۔ یہ خبریں پھیلائی گئیں کہ ضلع کی پولیس نے گولی چلانے سے انکار کر دیا ہے اور اب

صرف بارڈر پولیس اور کانسٹیبلری پولیس گولیاں چلا رہی ہے۔

یہ بیان کہ بعض احمدی فوجی وردیاں پہنے ایک جیپ میں سوار ہو کر لوگوں کو اندھا دھند گولیاں کا نشانہ بنا رہے تھے۔ ہمارے سامنے موضوع ثبوت بنایا گیا اور اس کی تائید میں متعدد گواہ پیش کیے گئے۔ اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پراسرار گاڑی میں احمدی سوار تھے یا وہ گاڑی کسی احمدی کی ملکیت تھی۔

ساڑھے چار بجے شام دہلی دروازے کے باہر ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس کے حاضرین کی تعداد پانچ ہزار کے قریب تھی اس جلسے میں یہ بیان کیا گیا کہ چوک دال گراں میں پولیس نے ایک لڑکے کو گولی مار دی ہے اور قرآن مجید کو پامال کیا ہے۔ جلسے کے بعد ایک جلوس مرتب کیا گیا جو مسجد [...]ں کی طرف روانہ ہوا۔ منظور الحق اور محمد صادق اسسٹنٹ سب انسپکٹروں نے مسجد کے قریب اس ہجوم کو روکا۔ سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو فون پر اطلاع ملی کہ لوگ ان اسسٹنٹ سب انسپکٹروں کو اٹھا کر مسجد لے گئے ہیں اور یہ دونوں ہلاک کر دیے گئے ہیں یا عنقریب کیے جانے والے ہیں۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ایک مسلّح ریزرو دستہ زیر سرکردگی سب انسپکٹر مظفر خاں (تھانہ کوتوالی) ساتھ لیا اور مسجد کی طرف چل دیے، مسجد کے عین باہر ان کا سامنا ایک غضبناک ہجوم سے ہوا جب ڈی ایس پی نے پوچھا کہ دو پولیس افسر کہاں ہیں تو ان کو بلوائیوں نے گھیر لیا اور ان پر چھروں اور لاٹھیوں سے حملہ کر کے وہیں ہلاک کر دیا۔ سید فردوس شاہ کے جسم پر باون زخموں کے نشان تھے۔ ان کا اپنا ریوالور اور ان کے دو ساتھی پولیس مینوں کی بندوقیں چھین لی گئیں۔ اور سب انسپکٹر مظفر خاں زخمی ہو گیا۔ ڈی ایس پی کی نعش کو کسی نے کوتوالی پہنچا دیا۔ جہاں ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس موجود تھے۔ کرنل عالم آفیسر کمانڈنگ فرسٹ بلوچ رجمنٹ بھی بعض دوسرے افسروں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ اور بعد میں جنرل آفیسر کمانڈنگ بھی ان سے آن ملے جس وقت یہ افسر صورتحال پر غور کر رہے تھے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بتایا کہ ڈی ایس پی کے قتل کی خبر سن کر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شہر فوج کے حوالے کر دوں۔ اس کے بعد انہوں نے فوجی افسروں پر اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے اس اقدام کو پسند نہ

کیااور کہا کہ اس مرحلے پر شہر کو فوج کے حوالے کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ انتظام کو سچ مچ فوج کے حوالے کر دیتے تو ہم ان کے اس فعل کو معقول اور دانشمندانہ خیال کرتے۔ لیکن یہ صاحب خود ہی اس امر کی نیکنامی لینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمارے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ میں نے تو فوج کے حوالے کرنے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

جو افسر اس وقت موجود تھے انہوں نے کرفیو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں نے اس کے متعلق حکم نافذ کر دیا۔ پولیس نے شہر میں گشت کی۔ اس کا سابقہ کئی مجمعوں سے پڑا جن کو اس نے گولی چلا کر منتشر کر دیا۔ اس طرح ایک ہجوم جو کرفیو کے احکام کی خلاف ورزی کر رہا تھا بھاٹی [...]ے کے قریب ملا اور چند گولیاں چلانے سے منتشر ہو گیا۔ نولکھا بازار میں بھی ایک مجمع کرفیو توڑنے کے لیے اپنے گھروں سے نکل آیا تھا۔ اس پر بھی گولی چلائی گئی احراری رضا کاروں کا ایک ہجوم جو دفتر احرار کے قریب سرکلر روڈ پر جمع ہو گیا تھا کوتوالی کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ اس کو ضروری تنبیہ کی گئی۔ اور پھر اس پر گولی چلائی گئی۔ جس سے ایک شخص ہلاک اور ایک مجروح ہوا۔ ایک اور ہجوم کو چودھری محمد حسین سپرنٹنڈنٹ پولیس نے میکلوڈ روڈ پر رائفل سے فائر سے منتشر کیا۔ جس سے کچھ جانی نقصانات ہوئے۔ نسبت روڈ پر انسپکٹر آغا سلطان احمد نے چار راؤنڈ چلائے۔ سب انسپکٹر نے گوالمنڈی میں دو دفعہ گولی چلائی خود انسپکٹر جنرل نے ایک مجمع پر گولی چلوائی جو کوتوالی کی طرف بڑھ رہا تھا اس پر کچھ جانی نقصانات ہوئے۔ اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس چوکی موچی دروازے نے ان بلوائیوں پر گولی چلائی جو پولیس چوکی پر خشت باری کر رہے تھے۔ غرض پورا شہر شور و غوغا کا ایک ہنگامہ زار بنا ہوا تھا۔ رات بھر (دور دور تک مہیب و ہولناک شور کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ آدھی رات سے کچھ بعد چیف منسٹر کی کوٹھی پر ایک اجلاس ہوا جس میں ہوم سیکرٹری، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس جنرل آفیسر کمانڈنگ اور بعض دوسرے فوجی افسر شریک تھے یہ اجلاس تین بجے شب تک جاری رہا انسپکٹر جنرل پولیس نے جنرل آفیسر کمانڈنگ کو بتایا کہ کون کون سے واقعات ہو چکے ہیں۔ اور کن کن حوادث کا اندازہ ہے تا کہ اس امر کا فیصلہ کیا جا سکے کہ فوج سے کیونکر موثر کام لیا جا سکتا ہے۔

۵۔ مارچ: جو واقعات سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے قتل کے بعد رونما ہوئے اور ہولناک شور کی آوازیں ۴ مارچ کی رات کو سنیں گئیں۔ آئندہ صبح کے منحوس حوادث کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں اگرچہ ہر شخص اندازہ لگا رہا تھا کہ اب کیا ہوگا لیکن جو کچھ ہوا وہ کسی کے تصور میں بھی نہ آیا تھا۔ اول یہ امر کہ حکم زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری جس کے رو سے لوگوں کا اجتماع ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اس کا اطلاق اندرون فصیل کے شہر پر نہ ہوتا تھا۔ دوم یہ امر کہ کوئی ذمہ دار افسر مسجد وزیر خاں تک نہیں جا سکتا تھا جہاں سپرنٹنڈنٹ پولیس قتل کر دیا گیا تھا۔ ان دونوں امور سے گویا اس حقیقت کا اعتراف کر لیا گیا تھا کہ شہر ان حکام کی رسائی سے باہر ہو چکا ہے جو امن و نظم کے قیام کے ذمہ دار

۵۔ مارچ کی صبح کو نو بجے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے معززین شہر کا اجلاس طلب کیا تاکہ ان کو یہ ترغیب دی جائے کہ وہ عوام کو پر امن رہنے کی تلقین کریں اور ان پر اپنے ذاتی اثر سے دباؤ ڈالیں لیکن کسی نے اس راہ عمل پر گامزن ہونے کی حامی نہ بھری اور صرف چند عورتیں مسجد وزیر خاں میں جانے کے لیے آمادہ ہوئیں جتنا دن چڑھتا گیا۔ حادثے پر حادثہ رونما ہوتا گیا۔ پولیس اور احمدیوں پر حملے کیے گئے اور حکومت یا احمدیوں کی اموال و جائیداد کو آگ لگانے اور لوٹنے کا ہنگامہ جاری رہا۔ زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری جو حکم صادر کیا گیا تھا کہ پانچ یا پانچ سے زیادہ اشخاص ایک جگہ جمع نہ ہوں۔ وہ شہر بھر میں توڑ دیا گیا تھا ہجوم ہر جگہ جمع ہو رہے تھے لوگ ان لوگوں کو گالیاں اور دھمکیاں دے رہے تھے جو گاڑیوں میں سوار نظر آتے تھے بعض حالات میں ان لوگوں کو گھسیٹ کر سواریوں سے اتار دیا گیا۔ باغبانپورہ کا ایک احمدی مدرس منظور احمد چھرے کی ضرب سے ہلاک کر دیا گیا اور اسکے بعد قتل لوٹ اور آتش زنی کے مزید واقعات ہوئے۔ حکومت کی بعض اومنی بسیں بالکل جلا کر خاکستر کر دی گئیں اور دو ڈاک خانے پہلے لوٹے گئے اور پھر جلا دیے گئے۔ پولیس کی ایک گاڑی کو آگ لگا دی گئی اور چھ اور گاڑیاں توڑ پھوڑ دی گئیں۔ بہت سے پرائیویٹ کاروباری مرکز بھی لوٹ لیے گئے۔ پولیس کا ایک دستہ چند نعشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے میو ہسپتال لے جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک ہجوم آن

پہنچا جس نے ان نعشوں کو چھیننے کی کوشش کی تاکہ عوام کے سامنے مظاہرہ کیا جا سکے۔اس کشمکش میں دو کانسٹیبل مجروح ہوئے۔کئی مقامات پر پولیس پر خشت باری کی گئی اور دو جگہ اس پر گولی بھی چلائی گئی ۔ایک ہیڈ کانسٹیبل گولی سے زخمی ہوا۔لوہاری دروازے کے باہر فوج کے ایک گشتی دستے پر بھی اینٹیں پھینکی گئیں۔چنانچہ اس دستے کو بھی گولی چلانی پڑی، پولیس کو دن بھر میں کئی مقامات پر گولی چلانی پڑی۔سیکرٹریٹ اور دوسرے کئی دفتروں کے کلرکوں نے کام چھوڑ دیا اور باہر نکل آئے۔اسلامیہ کالج کے طالب علم بھی کلاسیں چھوڑ کر دیال سنگھ کالج کو روانہ ہو گئے اور اس کالج کے طالب علموں کو اپنے میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا۔انہوں نے خشت باری کر کے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے اور پرنسپل کی موٹر کار کو بھی توڑ پھوڑ دیا۔دیال سنگھ کالج سے وہ یونیورسٹی ہال پہنچے اور وہاں سے 243 ٹ کالج جا پہنچے۔ان کو بزور منتشر کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی کیونکہ پولیس طلبا سے تصادم پیدا کرنے پر آمادہ معلوم نہ ہوتی تھی۔

سائیکلوسٹائل سے چھاپے ہوئے اشتہار دیواروں پر چسپاں کیے گئے۔جن میں پولیس کے آدمیوں سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہتھیار ڈال دیں کیونکہ حکومت کے خلاف جدوجہد ''جہاد'' ہے۔جس میں کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان پر گولی نہ چلانی چاہیے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کرفیو لگا کر حکم دیا کہ ۵ اور ۶ مارچ کی درمیانی شب کو ساڑھے تین بجے شام سے چھ بجے تک صبح تک اور چھ سے گیارہ مارچ ۶ بجے شام سے چھ بجے صبح تک کوئی شخص کسی سڑک، بازار، گلی، چھوٹی گلی، شارع عام پر یا کسی پبلک مقام پر باہر نہ نکلے۔اس حکم کا اطلاق پورے شہر پر ہوتا تھا صرف سول لائینز کا ایک حصہ مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔اس رقبے کے اندر کسی پبلک مقام پر پانچ یا پانچ سے زیادہ اشخاص کا اجتماع اور دن اور رات کے کسی حصے میں بھی اسلحہ اٹھا کر چلنا بھی دو مہینے کے لیے ممنوع قرار دیا گیا تھا۔

صبح کو گورنر نے کابینہ کا ایک اجلاس منعقد کیا جس میں چیف سیکرٹری، ہوم سیکرٹری، جنرل آفیسر کمانڈنگ دہم ڈویژن بعض سٹاف افسر، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سینئیر سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی طلب کیے گئے۔اس جلسے میں جو وزراء و احکام شریک ہوئے۔ان سے گورنر نے کہا کہ قوت کا

گولی چلانے سے پرہیز کیا جائے۔ گورنر نے کہا کہ کرفیو کی خلاف ورزی کے معمولی واقعات پر توجہ نہ کی جائے اور حکام میں سے ایک نے یا خود گورنر نے بھی تجویز کی کہ گولی چلانا بند کر دیا جائے۔ فائرنگ کو نرم کر دینے کا فیصلہ ان پولیس افسروں کے لیے بیحد پریشان کن ثابت ہوا جو صورتحال پر قابو پانے میں مصروف تھے۔ صبح کے احکام تو یہ تھے کہ پولیس کو مضبوط تدابیر اختیار کرنی چاہیں۔ چنانچہ مسٹر ایس این عالم اور ملک حبیب اللہ خاں کی کمان میں پولیس کے گشتی دستے انہی ہدایات کے ساتھ بھیج دیے گئے تھے جب شام کے احکام کوتوالی کے مرکز میں پہنچے اور وہاں ان کے افسروں کو پہنچائے گئے جو عملی اقدامات میں مصروف تھے تو بالکل ششدر و مبہوت رہ گئے۔ اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اب کیا کریں پولیس کی بکھری ہوئی ٹولیاں بالکل پریشانی کی حالت میں تھیں۔ رات کے [illegible] ایک موقع پر گولی چلائی گئی جب ریلوے ملازمین کے ایک ہجوم نے ہڑتال کر دی تھی اور ایک سگنل اور ایک ٹرین کو تباہ کرنے میں مصروف تھا۔

۵ مارچ کے دو ایسے واقعات ہیں جو ہمارے سامنے بحث و مناقشہ کا موضوع بنے رہے۔ اس میں پہلا واقعہ تو یہ تھا کہ دوپہر کے وقت گوال منڈی میں گولی چلائی گئی جس میں (بیان کیا جاتا ہے کہ) بہت سے اشخاص ہلاک ہوئے۔ جن میں عبدالعزیز۔ مودی۔ نظام دین۔ اور محمد حبیب بھی شامل تھے۔ احرار اور مجلس عمل کا بیان ہے کہ ان لوگوں کو ملک خان بہادر خان سپرنٹنڈنٹ پولیس پنجاب کنسٹیلری اور اے ایس آئی عبدالکریم نے ہلاک کیا۔ جو ان دنوں تھانہ گوال منڈی میں تعینات تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عبدالعزیز اور مودی کو عبدالکریم نے اور نظام دین اور محمد حبیب کو ملک خان بہادر خان نے رائفل کی گولیوں سے ہلاک کیا۔ اس بیان کو ثابت کرنے کے لیے جو گواہ طلب کیے گئے۔ وہ یہ ہیں:۔

ہدایت اللہ ۴۵ حسین بخش ۴۶ غلام احمد نمبر ۴۸ چراغ دین ۴۹ عبدالرؤف نمبر ۵۰ ماسٹر عبدالمجید نمبر ۵۱، حکیم محمد جمیل نمبر ۵۳ مہر دین ۵۴ سراج دین ۵۶ غلام حسین ۵۷ تاج دین ۵۸ علاؤالدین ۵۹ سردار محمد نمبر ۵۵ محمد حنیف ۵۶ نمبر اور مقبول احمد نمبر ۶۱۔ اس واقعہ کی علیحدہ تفتیش مسٹر عطا محمد خاں نون ڈی آئی جی، مسٹر عبدالحئی مجسٹریٹ اور ایک فوجی افسر نے بھی کی۔ اس تفتیش میں بھی

ان دونوں افسروں میں سے کسی کے خلاف کسی چیز کا ثبوت فراہم نہیں ہو سکا۔ حالانکہ ہمارے سامنے شہادت میں ان دونوں پر بیگناہوں کے خون کا ناحق الزام لگایا تھا۔

اس فائرنگ کا سراغ اس سے پیشتر کے ایک واقعہ میں معلوم ہوتا تھا جس کی رپورٹ ابتدائی نمبرے تھانہ گوال منڈی میں لکھوائی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں یہ لکھا تھا۔ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ کئی سو آدمی گوال منڈی میں اے ایس آئی عبدالکریم کے گھر کو آگ لگا رہے ہیں۔ جس نے اس دن میو ہسپتال کے قریب گولی چلائی تھی۔ یہ اطلاع موصول ہوتے ہی اے ایس آئی فیض احمد، اے ایس آئی سلطان احمد اور ہیڈ کانسٹیبل عبدالقادر سمیت پولیس کا ایک دستہ اس مقام پر پہنچے۔ انہوں نے ہجوم کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان پر ایک مکان کی چھت پر سے گولی چلائی گئی۔ جو ہیڈ کانسٹیبل [illegible]ر کو لگی ایک کانسٹیبل کو چھری سے پیٹا گیا۔

متنازعہ واقعہ غالباً اس سے کچھ دیر بعد رونما ہوا۔ اور یہ بالکل ممکن ہے کہ پولیس نے عبدالقادر ہیڈ کانسٹیبل اور ایک پیادہ کانسٹیبل کے زخمی ہو جانے کی وجہ سے انتقاماً گولی چلائی ہو۔ اے ایس آئی عبدالکریم قطعی طور پر منکر ہے کہ وہ اس فائرنگ کے وقت موجود تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اس دن اس نے اپنے ریوالور سے صرف تین راؤنڈ چلائے۔ ایک گندے انجن کے پاس، دوسرا چوک امیر علی کے پاس اور تیسرا اپنے گھر کے قریب۔ لیکن ان فائروں سے کوئی ہلاک نہیں ہوا۔ تاہم وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس دن ملک خان بہادر خان سپرنٹنڈنٹ پولیس پنجاب کانسٹیبلری کے حکم سے گوال منڈی میں کوئی دوسری فائرنگ ہوئی تھی جس کا واقعہ متنازعہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہم اس واقعہ کے متعلق اپنی کوئی رائے ظاہر کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ کیونکہ ہماری شرائط تحقیقات کا دائرہ اس کا مقتضی ہے کہ ہم صرف اختیار کردہ تدابیر کے کافی یا ناکافی ہونے کے متعلق رپورٹ کریں۔ حد سے زیادہ فائرنگ ہمارے دائرۂ تحقیقات سے باہر ہے۔ بجز اس حالت کے کہ ایسی فائرنگ فسادات میں اضافہ کرنے کا باعث ہوئی ہو۔

۵۔ مارچ کے واقعات کے متعلق دوسرا متنازعہ فیہ امر کابینہ کا وہ اجلاس تھا جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ساڑھے چھ بجے شام گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوا تھا جس کی صدارت گورنر نے

لاہور اور مغلپورہ کے درمیان ریلوے کی پٹڑی توڑ دی گئی تھی اور شاہدرہ سے آنے والی ایک ٹرین راستے میں روک لی گئی تھی۔ وائی ایم سی اے کی عمارت کے قریب آٹومیٹک ٹریفک سگنل کو ہجوم نے جلا دیا تھا اور اب کمرشل بلڈنگ کو لوٹنے والا تھا۔ کچھ مزید سرکاری بسیں جلا دی گئیں تھیں۔ چیف انجینئر الیکٹرک سٹی کو کارکنوں نے ایک رسمی نوٹس دے دیا تھا کہ اگر گورنمنٹ ہاؤس اور جی او آر اسٹیٹ میں رہنے والے وزیروں اور افسروں نے رضامندی کے ساتھ بجلی نہ کاٹ دی تو شہر بھر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ ایک شخص چیف انجینئر سے یہ اطلاع لے کر آیا اور اس نے مطالبہ کیا کہ اس نوٹس کا فوری جواب دیا جائے۔ عین اس وقت گورنمنٹ ہاؤس کی بجلی کاٹ دی گئی اور فون بیکار ہو گیا۔

جب ہوم سیکرٹری گورنر کے سیکرٹری کے کمرے میں گئے تو انہوں نے دیکھا کہ گورنر، چیف منسٹر اور بعض وزرا کراچی ٹیلیفون کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہوم سیکرٹری نے اس کمرے کے حاضرین سے بات چیت کی اور ان کو بتایا کہ صورتحال پر اسی صورت قابو پایا جا سکتا ہے کہ مندرجہ ذیل کارروائی کی جائے۔

(۱) مجلس احرار پاکستان اور جماعت اسلامی خلاف قانون انجمنیں قرار دی جائیں۔

(۲) ایسے علما اور مولویوں کی جو عقل کی بات سن سکیں اور قانون وانتظام کی بحالی میں حکومت کی امداد کرنے پر آمادہ ہوں۔ ترغیب دی جائے کہ باہر نکلیں اور ختم نبوت کے نام سے جو لاقانونی پھیل رہی ہے اس کی علی اعلان مذمت کریں۔

(۳) مرکزی کابینہ سے استدعا کی جائے کہ وہ اپنے وزیر کو فی الفور لاہور بھیجیں۔

(۴) شہر مکمل طور پر فوج کے حوالے کر دیا جائے۔

ہوم سیکرٹری نے مشورہ دیا کہ مرکز سے فی الفور گفتگو کی جائے کیونکہ اندیشہ ہے کہ ٹیلیفون کسی بھی وقت بیکار ہو جائے۔ انہوں نے ملٹری ٹرنک لائن پر کراچی سے ٹیلیفون کا رابطہ قائم کرایا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ دفعتہً منقطع ہو گیا۔ ہوم سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل پولیس بھی جو کمرے آئے تھے۔ اس وقت باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد گورنر نے ہوم سیکرٹری کو طلب کر لیا اور ان کو انگریزی میں کچھ نکات بتا کر کہا کہ ان کے مطابق اردو میں ایک بیان کا مسودہ تیار کریں۔ ہوم سیکرٹری نے جواب دیا کہ میں اردو

مسجدوں سے گرایا جائے۔ گورنر نے چیف منسٹر اور کابینہ کی موجودگی میں ہوم سیکرٹری کو حکم دیا کہ یہ بیان ٹیلیفون پر خلیفہ شجاع الدین کو سنادیں۔ جو اسی دن یا ایک دن قبل کے ایک مطبوعہ اشتہار کی رو سے مجلس عمل کے چوتھے ڈکٹیٹر مقرر کیے گئے تھے۔ ہوم سیکرٹری نے حکم کی تعمیل میں یہ بیان خلیفہ شجاع الدین کو پڑھ کر سنا دیا اور گورنر کی خواہش کے مطابق اس کی نقلیں بھی صاحب کی کوٹھی پر بھجوا دیں۔ گورنر صاحب خلیفہ صاحب کو مطمئن کرنے کے لیے بہت فکرمند معلوم ہوتے تھے کیونکہ انہوں نے کئی دفعہ دریافت کیا کہ آیا خلیفہ صاحب کو بیان کی کاپیاں ارسال کر دی گئیں ہیں یا نہیں۔ گورنر نے انسپکٹر جنرل پولیس کو ہدایت کی کہ اس بیان کو لاؤڈ سپیکر والی گاڑیوں سے شہر بھر میں نشر کیا جائے۔

گورنر اور چیف منسٹر کے حکم کے مطابق اس بیان کا ترجمہ فی الفور اضلاع میں پہنچا دیا گیا۔

اس دن کے واقعات کو دیکھ کر ''سینٹ بارتھولومیو ڈے'' یاد آتا تھا حتیٰ کہ ڈیڑھ بجے بعد دوپہر مارشل لا کا اعلان کر دیا گیا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ایک دن قبل احمدی مدرس قتل کر دیا گیا تھا۔

۶۔ مارچ کو ایک احمدی محمد شفیع برماوالا مغلپورہ میں ہلاک کر دیا گیا اور کالج کے احمدی طالب علم کو بھاٹی دروازے کے اندر لوگوں نے چھرے مار مار کر قتل کر دیا۔ ایک اور احمدی (یا مفروضہ احمدی) مرزا کریم بیگ کو فلیمنگ روڈ پر چھرا مار دیا گیا اور اس کی نعش ایک چتا میں پھینک دی گئی جو فرنیچر کو آگ لگا کر تیار کی گئی تھی۔ احمدیوں کی جو جائدادیں اور دکانیں اس دن لوٹی یا جلائی گئیں، وہ یہ تھیں:۔

پاک ریز، شفا میڈیکل، اور سوکو، موسیٰ اینڈ سنز کی دوکان، راجپوت سائیکل ورکس، ملک محمد طفیل اور ملک برکت علی چوب عمارتی کے احاطے اور گودام میں، مین روڈ پر ملک عبدالرحمٰن کا مکان اور مزنگ روڈ اور ٹمپل روڈ پر پانچ احمدیوں کے مکان جن میں شیخ نور احمد کا مکان بھی شامل تھا۔ تیسرے پہر ایک ممتاز ایڈووکیٹ مسٹر بشیر احمد، امیر جماعت احمدیہ لاہور کا مکان گھیر لیا۔ ہجوم اس مکان میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ مسٹر بشیر احمد نے اپنے دفاع میں چند گولیاں چلائیں۔ ایک خاص فوجی عدالت نے ان کے اس فعل پر مقدمہ چلایا لیکن وہ بری کر دیے گئے۔ ۶ اور ۷ مارچ کی رات کو عبدالحکیم مالک پائنیر الیکٹرک اینڈ بیٹری سٹیشن کے مکان پر چھاپہ مارا گیا اور ان کی بوڑھی والدہ قتل کر دی گئی۔

مسٹر دولتانہ کی رہنمائی اور بیرون جات کی لیگوں کی پیروی

جب ٦ مارچ کو چیف منسٹر کا بیان شائع ہو گیا تو اس کے بعد صوبے کے بہت سے مسلم لیگیوں نے مطالبات کی تائید میں قراردادیں منظور کیں۔ اسی طرح ٦ مارچ کو میاں چنوں مسلم لیگ نے ایک قرارداد منظور کی کہ اس مطلب کا ایک قانون منظور ہونا چاہیے کہ کوئی شخص اپنے لیے نبی کا لفظ استعمال نہ کرے گا اور اگر کرے گا تو اس جرم کا مرتکب ہوگا۔ ۷ مارچ ۱۹۵۳ء کو سٹی مسلم لیگ وزیر آباد نے دو قراردادیں منظور کیں۔ جن میں سے ایک قرارداد میں ہر کونسلر کا فرض قرار دیا گیا کہ وہ مقامی مجلس عمل کی مالی امداد کرے گا اور بوقت ضرورت تحریک ختم نبوت کی حمایت میں اپنی جان تک دینے سے دریغ نہ کرے گا۔ قرارداد میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ سٹی مسلم لیگ من حیث الجماعت مجلس عمل کے پروگرام اور اس کی سرگرمیوں میں مداخلت نہ کرے گی۔ دوسری قراردوں میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ بذریعہ تار وزیر اعظم پاکستان اور وزیر اعلیٰ پنجاب کو اطلاع دی جائے کہ مجلس عمل کے مطالبات تین دن کے اندر تسلیم کیے جائیں۔ ورنہ سٹی مسلم لیگ کے ممبر متحدہ طور پر مستعفی ہو جائیں گے اور اپنے اپنے حلقہ انتخاب کے ایم ایل اے حضرات سے درخواست کریں گے کہ چودھری ظفر اللہ خاں کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد کے حق میں حمایت حاصل کرنے کی تحریک شروع کر دیں۔ اسی قرارداد میں یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ حکومت نے مسلمانوں کے مذہبی مطالبات کو دبانے کے لیے جو جابرانہ تدبیر اختیار کی ہیں وہ سخت قابل مذمت ہیں۔ اسی دن سٹی مسلم لیگ جلال پور جٹاں نے ایک قرارداد منظور کی جس میں تحریک ختم نبوت کی اور وزیر اعلیٰ کے بیان ٦ مارچ کی غیر مشروط حمایت کی گئی اور کہا گیا کہ اس بیان کے مطابق وہ جو بھی قدم اٹھائیں گے۔ لیگ اس کی تائید کرے گی۔ قرارداد میں یہ بھی کیا گیا کہ لیگ کے ممبر اپنی ہائی کمان سے احکام کے منتظر ہیں اور حصول مقصد کے لیے عملی اقدام اٹھانے پر آمادہ ہیں۔ دوسری قرارداد میں حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ مجلس عمل کے مطالبات کو حتی الامکان جلد سے جلد منظور کرے۔ ۸ مارچ کو مسلم لیگ گکھڑ نے تین قراردادیں منظور کیں۔ ایک کا

یہ مطلب تھا کہ لیگ کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے اس کے ممبروں کا فرض ہے کہ عوام کا ساتھ دیں اور ختم نبوت کی تحریک میں حصہ لیں۔ دوسری قرارداد میں لیگ میں اپنے صدر میر محمد بشیر کا شکریہ ادا کیا تھا جنہوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا تھا۔ اور تمام کونسلروں سے بھی اس مطلب کی اپیل تھی اور تیسری قرارداد میں حاکم علی ٹھیکیدار کو صدر مقرر کیا گیا۔ اور تمام کونسلروں سے کہا گیا کہ وہ میر محمد بشیر کی گرفتاری کے بعد رضا کاروں کے مہیا کرنے کے لیے ضروری انتظامات کریں۔ سٹی مسلم لیگ کا مونکے نے ۱۰ مارچ ۱۹۵۳ء کو احمدیوں کو اقلیت قرار دینے اور چودھری ظفر اللہ خاں کو برطرف کرنے کے مطالبات کی حمایت کی۔

257

مسٹر دولتانہ نے ۶ مارچ کا بیان واپس لے لیا

۱۰۔ مارچ ۱۹۵۳ کو مسٹر دولتانہ نے حسب ذیل اعلان کیا:۔

''اس مہینے کی چھ تاریخ کو میں نے اپنی اور اپنی وزارت کی طرف سے اہل پنجاب سے اپیل کی تھی۔ کہ قانون و انتظام کے قیام میں امداد دیں۔

میں نے ان کو یقین دلایا تھا کہ میری حکومت تحریک ختم نبوت کے لیڈروں سے فی الفور گفت وشنید کرنے پر آمادہ ہے۔ اور میرے وزرا مطالبات کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر کے سفارش کرینگے کہ ان کو تسلیم کر لیا جائے۔

یہ اپیل اس وقت کی گئی تھی جب لاہور میں قانون کے دشمن لوٹ مار، آتش زنی اور ضروری سروسوں کو تلپٹ کرنے میں مصروف تھے۔ پاکستان کے مخالف تفرقہ پرداز گروہ پاکستان کی سلامتی اور استواری کو نقصان پہنچانے کی غرض سے تحریک تحفظ ختم نبوت سے فائدہ اٹھا کر نظم حکومت کو درہم برہم کرنے اور مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے کے لیے بدنظمی کی آگ بھڑکا رہے تھے۔

میری اپیل کا مقصد یہ تھا کہ صوبے کے باشندے قانون و انتظام کے قیام کے لیے کوششیں

جو مسٹر آئی یو خان کمشنر، مسٹر ایس این عالم ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس، مسٹر غلام سرور خان ڈپٹی کمشنر اور سید عبدالرؤف سپرنٹنڈنٹ پولیس نے داخل کیے اور جو شہادت لیفٹیننٹ خوشی محمد نے دی جب مسٹر غلام سرور ڈپٹی کمشنر جن کے خلاف عوام کو بعض شکایات تھیں، تبدیل کر دیے گئے تو ہم نے اپنے چند اجلاس سیالکوٹ میں منعقد کر کے کافی غیر سرکاری شہادت قلمبند کی۔

جب سے مسٹر مظہر علی اظہر ۱۹۳۱ء کی تحریک کشمیر میں احراری رضا کاروں کا ایک دستہ لے کر جموں میں داخل ہوئے تھے۔ سیالکوٹ اسی زمانے سے احراریوں کا ایک ہدایتی مرکز چلا آتا ہے۔ یہ ایک اہم احمدی مرکز بھی رہا ہے جس کی اہمیت قادیان سے دوسرے درجے پر تھی۔ احراری احمدی نزاع کے سلسلے میں یہاں پہلا اہم واقعہ یہ ہوا کہ غلام محمد شاہ نے احمدیوں کے خلاف ایک تیز تقریر کی جس کی پاداش میں وہ زیر دفعہ ۲۹۵۔الف تعزیرات ہند ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ کو سزا یاب ہوا۔ یہ نزاع کسی نہ کسی شکل میں ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ لیکن ان برسوں کے دوران کوئی بڑا واقعہ رونما نہ ہوا۔ ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو احراریوں نے ایک تبلیغ کانفرنس اس مقصد سے منعقد کی کہ باؤنڈری کمیشن میں احمدیوں کے رویے کے خلاف نکتہ چینی کریں۔ اس کے جواب میں احمدیوں نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے ۱۵ جنوری ۱۹۵۰ء کو اپنا ایک جلسہ منعقد کیا۔ عین اسی وقت جب یہ جلسہ ہو رہا تھا، احراریوں نے ہنگامہ برپا کیا۔ اور ایک لڑکے کے چھرا مار دیا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ایک حکم صادر کیا جس کی رو سے ایک ہفتہ کے لیے جلسے ممنوع قرار دیے گئے۔ نومبر ۱۹۵۱ء میں احمدی اپنا عام سالانہ اجلاس منعقد کرنا چاہتے تھے لیکن جو جذبات اس وقت پھیل رہے تھے ان کے پیش نظر حکام ضلع نے ان کو سمجھا بجھا کر یہ اجلاس ملتوی کرا دیا۔ پھر یہ اجلاس نومبر ۱۹۵۲ء میں احمدیوں نے اپنے جلسہ گاہ میں منعقد کیا لیکن احراریوں نے حاضرین پر خشت باری کی۔

فروری ۱۹۵۲ء تک احراری احمدیوں کے خلاف رائے عامہ کو منظم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب احمدیوں کے خلاف شورش نے تحفظ ختم نبوت کی شکل اختیار کی۔ اور ۲۱ جولائی ۱۹۵۲ء کو اس شہر میں ایک آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقد کی گئی۔ اس کنونشن کے بعد تحریک تحفظ ختم نبوت زیادہ

مقبول ہوگئی اور تمام فرقوں کے مذہبی مبلغ اس میں شامل ہو گئے ۔تحریک روز بروز زیادہ قوی ہوتی جارہی تھی ۔مساجد کے اندر جمعہ کے ہر خطبے میں احمدیوں کے متعلق دشنام و بدگوئی کا سلسلہ جاری ہو گیا اور تین مطالبات زور وشور سے پیش کیے جانے لگے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۵۲ء کو پسرور کے مقام پر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کنونشن میں چیف منسٹر نے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے اعلان کیا کہ وہ ’’تحریک ختم نبوت کی پوری حمایت کرتے ہیں بشرطیکہ قانون و انتظام کو کوئی خطرہ درپیش نہ ہو‘‘ ۔اکتوبر ۱۹۵۲ء میں عرس گلو شاہ کے موقع پر مولوی بشیر احمد خطیب جامع مسجد پسرور، کرامت علی شاہ اور منظور احمد نے احمدیوں کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کی ۔ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان لوگوں کے خلاف زیر دفعہ ۲۱ ۔ پنجاب پبلک سیفٹی کمیشن ایکٹ کاروائی کی سفارش کی ۔لیکن حکومت ان سے اتفاق نہ کیا۔نومبر ۱۹۵۲ء میں ایک اور آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی جس میں تین مطالبات بیشتر زور وشور سے دہرائے گئے ۔صوبائی حکومت اب احراری احمدی نزاع کی وسعت اور شدت کا احساس کر چکی تھی ۔ چنانچہ اس نے اس معاملہ کے متعلق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے نام عام ہدایات کا ایک سلسلہ جاری کر دیا۔ان ہدایات کا مفاد یہ تھا کہ قابل اقدام تقریروں کے خلاف صرف مقدمات دائر کیے جائیں مسجدوں میں گرفتاریاں نہ کی جائیں نہ مساجد کے اجتماعات کو منتشر کیا جائے ۔ایک اور ہدایت یہ تھی کہ کاروائی صرف احراریوں اور احمدیوں تک محدود رکھی جائے ۔لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احراری مولویوں نے ہر مسجد کے ممبر سے احمدیوں کے خلاف پراپیگنڈا جاری رکھنے میں اپنے آپ کو بالکل آزاد محسوس کیا۔

مجلس عمل پنجاب کی ہدایت کے مطابق اس ضلع میں ایک مجلس عمل مرتب کی گئی ۔اس مجلس عمل نے رضا کاروں کی بھرتی اور سرمائے کی فراہمی کا کام شروع کر دیا۔صاحبزادہ فیض الحسن ضلع میں جلسوں کا ایک سلسلہ جاری کر کے شدید پروپیگنڈا کرنے میں مصروف رہے۔ ۲۰ فروری ۱۹۵۳ء کو جناح پارک میں ہزارہا آدمی نماز جمعہ کے لیے جمع ہوئے۔جن سے مولوی محمد علی کاندھلوی، پروفیسر خالد محمود، مولوی محمد یعقوب اور مولوی فضل حق نے خطاب کیا۔احمدی عقائد کے خلاف رسالے اور کتابچے فروخت کیے گئے اور آٹھ آنے تک ٹکٹ بیچ کر ہزاروں روپے جمع کیے گئے۔

کراچی میں ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کو جو فیصلے کیے گئے تھے، ان کے مطابق ہوم سیکرٹری نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک لاسلکی پیغام بھیجا جس میں قاضی منظور احمد اور ولی محمد جرنیل کو گرفتار کرنے کی ہدایت کی۔ یکم مارچ ۱۹۵۳ء کو شہر نے کامل ہڑتال کی اور دس ہزار اشخاص کا ایک ہجوم ریلوے اسٹیشن پر رضا کاروں کے اس پہلے دستے کو الوداع کہنے کے لیے جمع ہوا جو زیر سرکردگی مولوی محمد یوسف ''ڈائریکٹ ایکشن'' میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ اس ہجوم نے بازاروں میں گشت لگایا۔ احمدیوں کے خلاف نعرے لگائے اور حکومت بالخصوص وزیر اعظم پاکستان کو گالیاں دیں۔ یہ ہجوم اس قدر سرکش تھا کہ اس نے ٹرین کی روانگی میں تاخیر کرا دی اور ٹرین کے بعض ڈبوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ بعض آدمی رضا کاروں کے ساتھ ٹرین میں سوار ہو گئے۔ اور نارووال پہنچ کر اتر گئے۔ واپس آتے ہوئے انہوں نے ٹرین کو روکا۔ سٹیشن کے دوکانداروں کو لوٹا۔ اور ریل کی پٹڑی کے آس پاس گنے کی فصلوں کو برباد کیا۔

261

۲ مارچ ۱۹۵۳ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس ڈی او چٹھی نمبری 2514 - 29-BDSB مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء کو موصول ہوئی جس میں حکومت کا یہ فیصلہ بتایا گیا تھا کہ اس شورش کو سختی سے دبایا جائے۔ انہوں نے پولیس اور مجسٹریٹوں کا اجلاس طلب کیا۔ اور فیصلہ کیا کہ:۔

(ا) ۲-۳ مارچ ۱۹۵۳ء کی درمیانی رات کو شورش کے سرغنہ زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کر لیے جائیں (اس کے لیے ہوم سیکرٹری کی منظوری ٹیلیفون پر حاصل کر لی گئی)۔

۲۔ جو لوگ اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کریں، ان کو حراست میں لے لیا جائے اور پھر کسی دور دست مقام پر لے جا کر چھوڑ دیا جائے۔

۳۔ فوج سے استدعا کی جائے کہ بوقت ضرورت امداد کے لیے موجود رہے۔

۲ مارچ ۱۹۵۳ء کی شام کو رام تلائی میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ جس میں مولوی سلطان محمود، پروفیسر خالد محمود، مولوی حبیب احمد اور مولوی محمد یعقوب نے تقریریں کیں۔ ان تقریروں کا لہجہ واضح طور پر حکومت کے خلاف تھا اور پروفیسر خالد محمود نے خواجہ ناظم الدین کو آگاہ کیا کہ ان کا انجام بھی مسٹر لیاقت علی خاں کا سا ہوگا۔ اعلان کیا گیا کہ کل رضا کاروں کے دو دستے کراچی روانہ کیے

جائیں گے۔

مولوی محمد حسین، مولوی محمد علی کاندھلوی، محمد صادق ولد بھولا، مولوی حبیب احمد، عبدالغفور بٹ اور بشیر احمد ولد چراغ دین ۲۔۳ مارچ کی درمیانی رات گرفتار کر لیے گئے۔ ۳ مارچ کی صبح کو فوج اور پولیس کے دستوں کی گشت کے باوجود چھوٹے چھوٹے ہجوم بازاروں میں نمودار ہوئے۔ یہ ہجوم سرکشی پر مائل تھے۔ لیکن ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے بعض کو فوج نے اور بعض کو پولیس نے منتشر کر دیا۔ جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کوئی سوا دس بجے قبل دوپہر الشہابیہ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ اس عمارت کے اندر اور ارد گرد کے مکانوں کی چھتوں پر ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہے اور حکومت کے خلاف نعرے لگا رہا ہے۔ جب ان سے منتشر ہونے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے شہابیہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس مجمع کو خلاف قانون قرار دیا 262 مسٹر خلیل الرحمٰن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور خواجہ اقبال احمد مجسٹریٹ کو حکم دیا کہ اس مجمع کو منتشر کر دیں۔ جب مسٹر خلیل الرحمٰن خان اس عمارت میں داخل ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کا ریوالور کسی نے ان کی پیٹی سے نکال لیا ہے تاہم وہ اور خواجہ اقبال احمد چار اشخاص کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ہار پہنے ہوئے تھے۔ اور ان میں سے ایک مولوی محمد یعقوب تھا جو ۲۔۳ مارچ کی رات گرفتار نہ ہو سکا تھا۔ گرفتاریوں کے بعد ہجوم دار الشہابیہ اور ملحقہ عمارتوں کی چھتوں پر چڑھ گیا۔ اور منڈیروں پر سے اینٹیں پھینکنے لگا۔ جن کی وجہ سے پولیس نے ان گاڑیوں کے پیچھے پناہ لی جو دار الشہابیہ کے سامنے سڑک پر کھڑی تھیں۔ خشت باری کی وجہ سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا لیکن اس کے باوجود ہجوم منڈیروں پر سے اینٹیں پھینکتا رہا۔ اس مرحلے پر ایک اور ہجوم دفعتہً دار الشہابیہ کے عقب میں سڑک پر نمودار ہوا اور اس نے بھی پولیس پر خشت باری شروع کر دی۔ ان کو منتشر ہونے کے لیے کہا گیا لیکن چونکہ انہوں نے خشت باری جاری رکھی اس لیے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا گیا۔ اس پر ہجوم پیچھے ہٹ گیا ایک آدمی ہلاک پایا گیا۔ اس موقع پر کل اکیس گولیاں چلائیں گئیں پولیس نے نعش کو اٹھا لیا لیکن ہجوم پولیس پر غالب آیا۔ اس نے نعش بھی چھین لی اور مولوی محمد یعقوب کو بھی حراست سے چھڑا لیا۔ چونکہ صورتحال بالکل ہی قابو سے باہر ہو گئی

تھی اس لیے اس کو فوج کے حوالے کر دیا گیا جس کی کمان لیفٹیننٹ کرنل خوشی محمد (ہشتم پنجاب رجمنٹ) کر رہے تھے۔ ہجوم نے سول کے افسروں کو گھیر لیا جو ایک بند گلی میں بھاگے جہاں سے وہ اس گلی کے ایک مکان کی چھت پر پہنچ گئے کچھ دیر بعد وہاں غلام حسن اے ایس آئی کو لایا گیا جن کے پیٹ میں چھرا مارا گیا تھا اور جن کا ریوالور چھین لیا گیا تھا۔ اس اثنا میں ہجوم نے پولیس کی دو گاڑیاں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی جیپ کو آگ لگا دی۔ میونسپل فائر بریگیڈ طلب کر لیا گیا۔ لیکن وہ بھی جلا دیا گیا۔ اس مرحلے پر یہ اطلاع ملی کہ ہجوم ضلع کچہری کی عمارتوں، پولیس کے دفتر اور بعض دوسری سرکاری عمارتوں کو آگ لگانے کے درپے ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کسی نہ کسی طرح باہر نکلے اور انہوں نے پولیس لائن سے ایک گارد ساتھ لی تاکہ سرکاری عمارتوں اور سٹیٹ بینک [illegible]رتوں کو بچائیں۔

جس وقت دارالشہابیہ کا واقعہ ہو رہا تھا۔ سٹی انسپکٹر اور سٹی مجسٹریٹ کو رنگپورہ کے چوک سنت سنگھ میں ایک اور ہجوم کا سامنا کرنا پڑا جو دارالشہابیہ کو طرف آ رہا تھا۔ اس ہجوم کو روکا گیا لیکن وہ تشدد پر اتر آیا اور اس نے سٹی مجسٹریٹ، سٹی انسپکٹر، اے ایس آئی ثناءاللہ اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو زخمی کر دیا۔ لیکن فوج ان کی مدد کو پہنچ گئی اور انہیں مزید نقصان سے بچایا۔

دوپہر تک ہجوم بے انتہا بڑھ گیا اور ٹریفک ڈیوٹی کے پولیس کانسٹیبلوں پر حملے کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ایک جلوس کی شکل اختیار کر لی اور ایک شخص کی نعش کو ساتھ لے کر جو دارالشہابیہ میں مارا گیا تھا گشت کرنے لگا۔ یہ ہجوم سٹی مسلم لیگ کے دفتر پہنچا اور اس کی لائبریری لوٹ لی۔ خواجہ محمد صفدر ایم ایل اے صدر سٹی مسلم لیگ کو ان کے دفتر سے نکالا گیا، ان کا منہ کالا کیا گیا اور ان کو بازاروں میں پھرایا گیا۔ آخر کرنل خوشی محمد نے ان کو چھڑایا۔ اس کے بعد ہجوم جناح پارک میں پہنچا۔ جہاں کوئی پچاس ہزار اشخاص نے مولوی محمد یعقوب کی امامت میں متوفی آدمی کے جنازے کی نماز ادا کی۔ اس موقع پر مولوی نے حسب توفیق ایک پرزور تقریر کی۔

کمشنر کو ٹیلیفون پر صورتحال کے متعلق اطلاع دی گئی۔ چنانچہ وہ اسی دن شام کو پہنچ گئے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ۳ تاریخ کے ایک بجے بعد دوپہر سے لے کر ۴ تاریخ کے ایک بجے بعد دوپہر

تک چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا تھا۔لیکن چونکہ پولیس اور فوج کی نفری کم تھی۔اس لیے یہ کرفیو عمل میں نہ لایا جا سکا اور کمشنر نے اس کے اوقات تبدیل کر کے دس بجے شب سے ساڑھے چار بجے صبح تک کر دیے۔اسی شام کو غیر احمدی عبدالحیٔ قریشی کو جس نے ہجوم کو تشدد سے منع کیا تھا، زدوکوب کیا گیا اور اس کا گھر لوٹ لیا گیا۔

۴ مارچ کو زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری ایک حکم نافذ کیا گیا جس کی رو سے عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیے گئے۔اس دن ڈائریکٹ ایکشن کمیٹی نے اپنا مرکز دارالشہابیہ سے مسجد مولوی نور حسین میں منتقل کر دیا گیا جو تحصیل اور تھانہ صدر کے قریب واقع ہے۔ایک بڑا ہجوم اس مسجد کی طرف جا رہا تھا۔اس کو راستے میں روک لیا گیا۔کمشنر کی ہدایت کے مطابق ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہجوم کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔لیکن وہ افسروں پر پل پڑا۔پولیس کو اس ہجوم پر لاٹھی چارج کا حکم دیا گیا جس کے جواب میں آس پاس کے مکانوں سے اینٹیں برسائی گئیں۔مسٹر خلیل الرحمٰن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سر پر شدید زخم آیا اور پولیس کی ایک گاڑی توڑ پھوڑ دی گئی۔لہٰذا صورت حال کا انتظام فوج کے حوالے کر دیا گیا۔جس نے گولی چلا کر قابو پا لیا۔تھوڑی دیر بعد ایک ہجوم پھر مسجد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔فوج کے افسروں نے ان سے بات چیت کی اور ان سے منتشر ہو جانے کی استدعا کی لیکن کچھ اثر نہ ہوا تو بازار میں ایک طرف سے دوسری طرف تک ایک فیتہ کھینچ دیا گیا اور ہجوم کو تنبیہ دی گئی کہ اس فیتے کی حد سے آگے نہ بڑھیں لیکن کسی نے فیتہ توڑ دیا۔اور فوج کا جھنڈا جلا دیا۔بعض لوگ تلواریں اور چھرے گھماتے ہوئے ناچنے لگے اور اس روک سے آگے بڑھنے لگے۔اس پر فوج نے بریگیڈیر اے کے اکبر کے حکم سے گولی چلائی جس سے چار آدمی ہلاک اور دس مجروح ہوئے۔اس ہنگامے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جو لیفٹیننٹ کرنل خوشی محمد خاں کی زبان سے سنئے:۔

> ایک آدمی چھرے گھماتا اور ناچتا ہوا باہر نکلا اور گولی کھانے کے لیے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔لیکن میں نے اس کو بتایا جب تک وہ فیتے کے دوسری طرف رہے گا اس کو گولی نہیں ماری جائے گی لیکن جونہی اس نے فیتہ عبور کیا اسکو گولی ماری جائے گی۔جب گولی چلنی شروع ہوئی تو وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا وہ کہیں ہجوم میں غائب ہو گیا تھا۔پہلی فائرنگ کے بعد

ایک مولوی نے سامنے آکر فوج اور پولیس کو گالیاں دیں۔اوران کو کافر کہا۔میں نے بگلر سے کہا بگلر بجائے۔چنانچہ جونہی اس مولوی نے بگل کی آواز سنی وہ ہجوم پر سے پھلانگتا ہوا پیچھے کی طرف بھاگ گیا''۔

تیسرے پہر ایک ہجوم نے ایک اے ایس آئی اور کانسٹیبل پر یورش کی۔اے ایس آئی کا ریوالور اور کانسٹیبل کی بندوق چھین لی اوران کی وردیاں جلادیں۔ایک اور پیادہ کانسٹیبل کسی کیس کی مملوکات لیے جارہا تھا اس پر حملہ کیا گیا اور مملوکات چھین لی گئیں۔دو احمدیوں کے چھرا گھونپ دیا گیا اور تین دوسرے احمدیوں کے مکانات ہجوم نے لوٹ لیے۔

جب مسٹر این عالم ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس شام کو پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے معاملات فوج کے حوالے کر رکھے ہیں۔ان کے نزدیک یہ حوالگی حق بجانب نہ تھی۔چنانچہ انہوں نے کمشنر سے مشورہ کر کے صورتحال کو دوبارہ فوج سے واپس لے لینے کا فیصلہ کر لیا انہوں نے پولیس سے جو ۳ اور ۴ مارچ کے واقعات سے پست حوصلہ ہو چکی تھی، خطاب کیا اور شہر کی گشت کے انتظامات کیے۔فوج نے اپنا بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سٹی کوتوالی میں منتقل کر لیا۔

۵ مارچ کو فوج نے شہر بھر میں ''فلیگ مارچ کیا'' اور وسیع پیمانے پر گشت لگایا بعض جلوس منتشر کیے گئے اور کچھ رضا کار گرفتار کیے گئے۔

۶ مارچ کو مسٹر دولتانہ کی اپیل ریڈیو پر نشر کی گئی اور لاسلکی پیغام کے ذریعے سے بھی پہنچائی گئی۔اس سے یہ خیال پھیل گیا کہ حکومت نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔چنانچہ حکام ضلع کی پوزیشن ناقابل رشک ہوگئی۔جو جلسے اور جلوس ممنوع کیے گئے وہ جاری ہو گئے اور روزانہ بے شمار افراد گرفتار ہونے لگے۔۷ تاریخ کو ۹۸، ۸ تاریخ کو ۱۲۱ اور ۹ تاریخ کو ۱۴۹ افراد گرفتار کیے گئے۔جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ عوام پر چیف منسٹر کی اپیل کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

۷ مارچ کو پروفیسر خالد محمود اور فضل حق نے تقریریں کیں۔جن میں پولیس اور فوج سے مطالبہ کیا کہ ہتھیار ڈال دیں اور دوسرے سرکاری ملازموں کو تلقین کی کہ ہڑتال کر دیں اور تحریک میں شامل ہو جائیں۔

گوجرانوالہ

گوجرانوالہ احراریوں کا ایک اہم مرکز ہے اول اس لیے کہ گوجرانوالہ سیالکوٹ کے قریب ہے دوم اس لیے کہ یہ ایک مقبول عام احراری مقرر صاحبزادہ فیض الحسن کا وطن ہے۔

احراریوں نے ۱۹۴۹ء میں یہاں ایک تبلیغ کانفرنس منعقد کی لیکن چونکہ اس وقت تک پاکستان کی نئی مملکت کے متعلق احراریوں کی نیک نیتی پر سخت شبہات موجود تھے۔اس لیے یہ کانفرنس کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئی ا۱۹۵ء میں انہوں نے ''دفاع کانفرنس'' کے پردے میں ایک اور کانفرنس منعقد کی۔ یہ اجتماع بہت کامیاب ہوا کیونکہ اس کے انتظامات سٹی مسلم لیگ کے صدر نے کیے تھے۔ اس کانفرنس میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے تقریر کی اور اپنا یہ عقیدہ ظاہر کیا کہ احمدیوں کو قتل کرنا اور ان کی جائیدادوں کو جلا دینا کار ثواب ہے۔ اسی سال میں ایک کانفرنس بھی ہوئی جس میں احمدیوں کو کافر قرار دیا گیا اور ان کے مجلسی اور اقتصادی مقاطعہ کی حمایت کی گئی۔

267

۲۰ جون ۱۹۵۲ء ''یوم مطالبات تھا'' احراریوں نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کر کے مسجد شیرانوالہ باغ کے اندر ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ اس جلسے میں صاحبزادہ فیض الحسن، شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج دین نے تقریریں کیں جو سب کے سب گرفتار کر لیے گئے۔ لیکن بعد میں چیف منسٹر کے حکم سے رہا کر دیے گئے۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں ایک اور کانفرنس ہوئی جس میں صاحبزادہ فیض الحسن نے یہ اعلان کیا کہ کسی احمدی کو قتل کرنا رضائے الٰہی کا موجب ہے۔ جب کانفرنس ختم ہوئی تو مولانا اختر علی خاں کے اعزاز میں ایک دعوت چائے دی گئی۔ جس میں ڈپٹی کمشنر اور مسلم لیگ کے لیڈر بھی شامل ہوئے۔ بعد میں احمدیوں نے ڈپٹی کمشنر سے شکایت کی کہ اس کانفرنس میں ایک مقرر نے حاضرین کو امام جماعت احمدیہ کے قتل پر اکسایا تھا۔ احمدیوں کے خلاف جذبات کی برانگیختگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزیرآباد میونسپل کمیٹی نے دو احمدی مدرسوں اور چار احمدی استانیوں کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ صاحبزادہ فیض الحسن، مولوی عبدالواحد خطیب مسجد شیرانوالہ باغ اور مولوی محمد اسماعیل نے

سمجھ کر قتل کر دیا کہ وہ احمدی ہے تفتیش سے یہ معلوم ہوا کہ متوفی کے ایک دشمن نے اس کو قتل کرانے کے لیے چال چلی تھی۔

۸۔مارچ کو مقامی ایم ایل اے مسجد شیرانوالہ باغ میں طلب کیے گئے اور ان سے درخواست کی گئی کہ لاہور جا کر ہدایات لائیں۔ یہ ایم ایل اے چیف منسٹر سے ملے لیکن کوئی قطعی ہدایات نہ لائے گوجرانوالہ میں فوج کی ایک کمپنی ۵ مارچ کو دو بٹالین ۶ مارچ کو اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب کنسٹیبلری کے دو ریزرو دستوں کے ساتھ ۸ مارچ کو پہنچ گئے۔

جب فوج آئی تو ان نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا گیا ''پاکستانی فوج نے سیالکوٹ گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ زندہ باد پاکستانی فوج زندہ باد'' شورش پسند ہر جگہ یہ اعلان کر رہے تھے کہ وہ کفر کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں اور کئی مقامات پر ایسے پوسٹر لگائے گئے جن میں پولیس اور فوج 271 سے اپیل کی گئی تھی کہ گولی نہ چلائیں بلکہ جہاد میں شامل ہو جائیں۔

ضلع میں کوئی ایک درجن احمدیوں کو مجبور کر دیا گیا کہ اپنے عقیدے سے توبہ کر لیں۔

اس ضلع میں مسلم لیگ اس تحریک سے عملی رابطہ رکھتی تھی۔ گوجرانوالہ کی سٹی مسلم لیگ نے تحریک ختم نبوت کی حمایت میں قرارداد منظور کی اور اس کے سیکرٹری مسٹر منظور حسن نے اسی مطلب کی ایک قرارداد صوبہ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لاہور میں پیش کرنے کے لیے ارسال کی۔ انہوں نے اس قسم کی ایک قرارداد آل پاکستان مسلم لیگ کے اجلاس ڈھاکہ میں پیش کرنے کی بھی کوشش کی۔

احمدیوں کا ایک وفد ۲۰ مارچ کو سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملا لیکن انہوں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے پہلے دن میں نے چیف منسٹر سے ہدایات طلب کی تھیں اور انہوں نے ہدایات دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ انھوں نے مرکز سے اس معاملے کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

کمک پہنچنے کے بعد غنڈوں کی گرفتاریاں اور ناجائز اسلحہ کے لیے تلاشیاں شروع ہو گئیں مولوی عبدالواحد جو تحریک کی پشت پر تھے اور حکیم عبدالرحمٰن ڈکٹیٹر علی الترتیب ۱۱ اور ۱۲ مارچ کو گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے بعد چند اور مولوی آگے آئے اور وہ بھی گرفتار کر لیے گئے۔ بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا

کہ فوج کی امداد سے مسجد شیرانوالہ باغ پر چھاپہ مارا جائے۔ چھاپہ مارا گیا مسجد شورش پسندوں سے پاک کردی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رقم شیخ آفتاب احمد ،مرزا شریف بیگ ،محمد دین ،ایم اے عزیز انصاری اور گوجرانوالہ مسلم لیگ کے بعض کونسلروں نے فراہم کی تھی۔

صفدر علی اور نصیر دین عرف نصیر یا غنڈوں کے دو مشہور لیڈر تھے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان کی گرفتاری کا حکم صادر کیا۔ اولذکر کسی نہ کسی طرح ضلع سے باہر نکل گیا اور بعد ازاں جھنگ میں گرفتار کیا گیا۔ نصیر یا بھی کچھ مدت تک گرفتاری سے بچتا بچاتا رہا لیکن آخر اسے سراغ لگا کر گرفتار کر لیا گیا۔

ضلع میں شورش کے دوسرے مرکز حسب ذیل تھے:۔

(۱) کاموکے: یہاں احمدیوں اور حکومت کے خلاف مظاہرے اور جلوس مرتب کرنے والے لطیف احمد چشتی اور حافظ عبدالشکور تھے۔ جو سرمایہ ضبط کیا گیا اس کی مقدار دس ہزار ساتسو بہتر روپے تھی۔ 272

(۲) وزیر آباد: یہاں تحریک کی تنظیم کرنے والے مولوی عبدالغفور ہزاروی اور کامریڈ عبدالکریم تھے۔ یہاں ریل کی پٹڑی پر لکڑی کا ایک لٹھ رکھ کر ایک ٹرین روکی گئی۔ جو سرمایہ یہاں ضبط کیا گیا اس کی مقدار دو ہزار پانچ سو آٹھ روپے تھی۔

(۳) حافظ آباد: یہاں ابوالحسن محمد یحییٰ اور مولوی فضل الٰہی نے عوام کے جذبات کو بھڑکایا۔

(۴) گکھڑ: یہاں ٹرینیں روکی گئیں۔ میر محمد بشیر صدر گکھڑ مسلم لیگ نے مع چند کونسلروں کو اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔

(۵) نوشہرہ ورکاں: ایک پرانا کانگرسی ڈاکٹر محمد اشرف یہاں گڑبڑ کا ذمہ دار تھا۔

(۶) سوہدرہ: یہاں مولوی عبدالمجید اہل حدیث نے عام جلسوں کا اہتمام کیا۔

راولپنڈی

یہاں بھی فسادات کے آغاز سے پیشتر واقعات کی رفتار بالکل صوبے کے دوسرے قصبوں کی ہی مانند تھی ۔ احراریوں نے احمدیوں اور ان کے مذہب کی مذمت سے کام کا آغاز کیا۔اس کے جواب میں احمدیوں نے احراریوں کے ماضی کو اجاگر کرنا شروع کیا تا کہ پاکستان کے متعلق ان کی نیت کی نسبت جوشبہات تھے وہ قوی ہو جائیں۔آل پارٹیز مسلم کنونشن کے بعد احراری دوسرے مذہبی فرقوں مبلغوں اور پیروں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا مساجد احمدیوں کے خلاف پروپیگنڈا کا مرکز بن گئیں اور جمعہ کے خطبات تو احمدی عقائد کی مذمت ومخالفت کے لیے وقف کر دیے گئے ۔نومبر ۱۹۵۲ء میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے جو احراریوں کے بڑے بڑے لیڈروں میں سے ہیں ۔لیاقت باغ کے ایک جلسہ عام میں تقریریں کیں ۔اس کے بعد رضا کاروں کی بھرتی اور سرمائے کی فراہمی کی مہم شدت سے شروع کر دی گئی۔

جب کراچی میں تحریک کے لیڈر گرفتار کر لیے گئے ۔اور مولوی غلام اللہ خاں کو بھی ۲۷ فروری کو حکومت پنجاب نے گرفتار کر لیا۔تو دھڑا دھڑ جلوس اور جلسے منعقد ہونے لگے ۔ایک جلسہ عام جو لیاقت باغ میں پیر صاحب گولڑہ شریف کے زیر صدارت منعقد ہوا۔وہ سب سے بڑا جلسہ تھا جس کی نظیر ماضی میں نہ مل سکتی تھی ۔ جب ٦ مارچ کو سیالکوٹ اور لاہور کے واقعات کے متعلق مبالغہ آمیز افواہیں پھیلیں اور یہ اطلاع موصول ہوئی کہ حکومت پنجاب نے مطالبات منظور کر لیے ہیں۔اور کراچی کو اس کی منظوری کی اطلاع دے دی ہے تو صورتحال بے حد نازک ہو گئی۔فوری نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا کہ حکومت نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔چنانچہ جلوس زیادہ جارحانہ ہو گئے ۔ان کی تعداد بھی بڑھ گئی اور ان کو لاٹھی چارج سے منتشر کرنا پڑا۔

٦ مارچ کو لیاقت باغ میں ایک اور جلسہ منعقد ہوا۔ایک ہجوم نے جلسے کے بعد منتشر ہو کر مری روڈ کا رخ کیا اور احمدیوں کی ایک مسجد کو اور ایک چھوٹی موٹر کار کو آگ لگا دی ۔اسی شام کچھ دیر بعد

لیے پیش کیا۔ لیکن ڈپٹی کمشنر نے دانائی سے کام لے کر اس جلوس کا رخ بدل دیا بلکہ جیل تک خود اس کی رہنمائی کی۔ جہاں پہنچ کر جلوس کے لیڈر اور ۱۲۴ دوسرے اشخاص گرفتار کر لیے گئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی جلوس کے ساتھ تھے جب ڈپٹی کمشنر نے ہوم سیکرٹری سے فوج مہیا کرنے کی درخواست کی تو ۴ اور ۵ کی درمیانی رات ۹/۸ پنجاب رجمنٹ کی بٹالین یہاں پہنچ گئی۔

۵ مارچ کو پچاس رضا کار گرفتار کر لیے گئے اور بیس میل دور لے جا کر چھوڑ دیے گئے ان کے علاوہ ایک جلوس کے ۵۵ شرکا زیر دفعہ ۱۸۸۔ تعزیرات پاکستان گرفتار کر لیے گئے۔ جب لاہور فائرنگ کی خبر ۶ مارچ کو لائل پور میں پہنچی تو بطور احتجاج کئی جلوس نکل آئے اور کوئی ۱۲۵ اشخاص گرفتار کیے گئے۔ چک جھمرہ سے آنے والے رضا کاروں نے چناب ایکسپریس کو ریلوے سٹیشن لائل پور کے قریب روک لیا۔ یہ خبر بھی موصول ہوئی کہ لاہور میں مارشل لا کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ شام کو چیف منسٹر کا یہ اعلان پہنچا کہ حکومت پنجاب نے شورش پسندوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیا ہے۔ انکو حکومت پنجاب کی رائے کے ساتھ مرکز بھیج دیا ہے اور صوبے کا ایک وزیر ان مطالبات کو کابینہ کے سامنے بوجہ احسن پیش کرنے کی غرض سے کراچی جا رہا ہے۔ شورش پسندوں نے اس اعلان سے یہ سمجھ لیا کہ حکومت نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مہم تیز کر دی اور اس کے بعد بعض مسلم لیگی ایم ایل اے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے لگے۔

۷ مارچ غنڈے پن اور لاقانونی کا دن تھا۔ تین مختلف جلوس نکالے گئے اور ایک سو سات اشخاص گرفتار کر لیے گئے۔ جن میں شیخ بشیر احمد صدر سٹی مسلم لیگ بھی شامل تھے جنہوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا تھا۔ دس ہزار کے ایک ہجوم نے ضلع کی کچہریوں پر حملہ کر دیا۔ کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ مجسٹریٹوں کو عدالتیں بند کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اور پھر ڈپٹی کمشنر کے گھر میں گھس گئے۔ لائل پور کاٹن ملز کی خوردہ فروشی کی دوکان لوٹ لی گئی ریل کی پٹڑی توڑ دی گئی۔ اور تین ٹرینیں ریلوے سٹیشن کے قریب روک دی گئیں۔ ریلوے سٹیشن پر دوکانوں اور مسافروں کو لوٹا گیا۔ ٹرین میں بعض عورتیں بے آبرو ہو گئیں۔ اور ایک کیبن میں بری طرح زخمی ہو گئیں۔ ہجوم کو منتشر ہونے کے لیے کہا گیا اور جب اس نے تعمیل سے انکار کیا تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔

سینتالیس راؤنڈ چلائے گئے۔ چار آدمی ہلاک ہوئے اور چار زخمی ہوئے۔ اس کے بعد کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

اس دن بعض مسلم لیگی ایم ایل اے سمندری میں ایک جلوس لے کر نکلے۔

۸ مارچ کو دیروزہ ہلاک شدہ اشخاص کی نماز جنازہ ادا کرنے کے لیے بیس ہزار کا ہجوم جمع ہوا نماز کے بعد جلوس مرتب کیا گیا جس نے بازاروں میں گشت لگایا۔ ایک اور جلوس زراعتی کالج سے نکالا گیا۔ دن بھر کرفیو کی خلاف ورزی ہوتی رہی اور کوئی ایک سو دس آدمی گرفتار کیے گئے۔ جب ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس نے سنا کہ ایک ہجوم چنیوٹ بازار کی طرف جا رہا ہے تو وہ دونوں فوج کے ایک گشتی دستے کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے۔ ہجوم کا رویہ جارحانہ تھا، ہجوم کو مجمع خلاف قانون قرار دیا گیا اور منتشر ہونے کا حکم دیا گیا۔ لیکن اس حکم کی تعمیل نہ کی گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوج کو [illegible] چلانے کا حکم دیا تین آدمی مارے گئے اور ایک زخمی ہوا۔ کچھ احراری رضا کار گوجرانوالہ سے ایک ٹرک میں آئے جس میں مائیکروفون لگا ہوا تھا یہاں سے وہ گرفتاری سے بچ کر نکل گئے اور جھنگ کو چل دیے۔ چنانچہ وہ وہاں گرفتار کیے گئے۔ یہ اپنے ساتھ تین ریوالور، کافی گولیاں بارود اور تیس ہزار روپیہ نقد لیے جا رہے تھے۔

اسی دن شام کے وقت ہجوم نے شہر کے اندرونی ٹرانسمشن سسٹم کے تار کاٹ ڈالے۔

۹ مارچ کو ایک پورے دن کا کرفیو عائد کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد زراعتی کالج کے طلبا نے ایک لمبا جلوس نکال لیا۔ رضا کار برابر دیہات سے شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ ان میں ایک سو بیس جامع مسجد میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ وہ سب گرفتار کر لیے گئے۔ شام کے وقت ڈپٹی کمشنر نے معززین شہر کا ایک اجلاس طلب کیا جس میں ضلع مسلم لیگ کے صدر نے محض مجلس عمل کے نمائندے کا پارٹ ادا کیا۔

۱۰ مارچ کو چیف منسٹر کی دوسری اپیل آ گئی جس میں شورش پسندوں کے خلاف مضبوط کاروائی کی ہدایت دی گئی تھی۔ اس کا اثر اچھا ہوا۔ اس لیے حکام ضلع کو اس سے واضح ہدایت حاصل ہوئی۔ چنانچہ تحریک ٹھنڈی پڑنے لگی۔ ۱۷ مارچ کو جامع مسجد سے رضا کاروں کا ایک جلوس نکلا۔ ۱۹ مارچ کو

متولی کی مدد سے مسجد خالی کرالی گئی۔اور ۲۰ مارچ کو ضلع کی حالت پھر اپنے معمول پر آ گئی۔اس تمام دوران میں کسی احمدی کے جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔نہ شہر میں اور نہ صنعتی رقبے میں کسی جائداد کی توڑ پھوڑ کی گئی۔پرائیوٹ طور پر گولی چلانے کے صرف دو واقعات ہوئے دونوں میں احمدیوں نے غلط فہمی کے ماتحت گولی چلا دی تھی اور دونوں موقعوں پر بعض بچے زخمی ہوئے۔ضلع کے جن دوسرے قصبوں پر شورش کا اثر ہوا۔وہ یہ تھے: چک جھمرہ،جڑانوالہ،ڈجکوٹ،سمندری، تاندلیانوالہ،گوجرہ،ٹوبہ ٹیک سنگھ اور کمالیہ۔لیکن ان مقامات پر قوت کے استعمال کی ہرگز ضرورت نہیں پڑی اور احمدیوں کی جان و مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔شورش پسندوں سے جو سرمایہ چھینا گیا۔اس کی مقدار چار ہزار دو سوئیس روپے دو آنے تین پائی تھی۔

منٹگمری

منٹگمری بھی احراریوں کا اہم مرکز ہے۔کیونکہ (۱) بہت سے احراری یہاں آباد ہو گئے ہیں۔(۲) احمدیوں کے خلاف تحریک کے ذمہ داروں اور احراریوں کے خلاف بہت سے مقدمات اسی ضلع میں دائر ہوئے (۳) احراری یہاں ایک ادارہ چلا رہے ہیں جس کا نام جامع رشیدیہ ہے اور یہ ادارہ احراریوں کی مذہبی سیاسی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔اس ضلع کے پانچ بڑے بڑے احراری یہ ہیں۔مفتی ضیاالحسن (احراری لیڈر مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا بھتیجا) جو منٹگمری میں آباد ہو گیا ہے۔مولوی حبیب اللہ،مولوی لطف اللہ اور مولوی عبداللہ تینوں بھائی جو منٹگمری میں جامع رشیدیہ کے بانی ہیں اور مولوی بشیر احمد رضوانی جو اوکاڑے میں آباد ہو گیا ہے۔یہاں جو واقعات فسادات سے پہلے یا ان کے دوران رونما ہوئے۔ان کی کہانی اس جامع تحریری بیان میں درج ہے جو مسٹر حق نواز سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مرتب کیا ہے۔واقعات ویسے ہی ہیں جیسے دوسرے مقامات پر پیش آئے۔احراریوں اور احمدیوں کی ایک دوسرے کے خلاف تقریریں،جب آل پارٹیز مسلم کنونشن نے جولائی ۱۹۵۲ء میں مرتب کرلیے۔اس کے مسجدوں سے احمدیوں کے خلاف پرزور

پروپیگنڈا، سرمائے کی فراہمی اور ڈائریکٹ ایکشن کے لیے رضا کاروں کی بھرتی اور ۲۷ فروری کی گرفتاریوں کے بعد عام جلسے اور جلوس اور زیر دفعہ ۱۰۷ ضابطہ فوجداری یا زیر دفعہ ۳ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتاریاں۔ جماعت اسلامی کے مقامی ارکان اور دوسرے مولوی تحریک میں شامل ہو گئے اور مسجدیں رضا کاروں کا ہیڈ کوارٹر بنا دی گئیں۔ مختلف جماعتوں کے اشخاص نے جن میں مجلس احرار ، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ والے بھی شامل ہیں، مظاہروں میں سرگرم حصہ لیا۔ ان اشخاص کے نام سپرنٹنڈنٹ پولیس کے تحریری بیان کے ساتھ بطور ضمیمہ ا مندرج ہیں۔ بھرتی ہونے والے رضا کاروں کی تعداد منٹگمری میں دو ہزار، اوکاڑہ میں ڈیڑھ ہزار، عارف والا میں سات سو اور چیچہ وطنی میں دو سو تھی۔

مولوی لطف اللہ اور حبیب اللہ کی گرفتاری کے احکام صوبائی حکومت کی طرف سے ۲۷ فروری کو موصول ہوئے۔ آخر الذکر اس وقت بھی ہائیکورٹ کے ماتحت توہین عدالت کے جرم میں سزائے قید کاٹ رہا تھا۔ حکام ضلع مزید گرفتاریاں بھی کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے مفتی ضیا الحسن اور مولوی عبداللہ اول اور مولوی عبداللہ ثانی کو گرفتار کرنے کی اجازت حکومت سے حاصل کر لی تھی۔

۲ مارچ کو اے ڈی آئی جی کی طرف سے یہ ہدایت موصول ہوئی کہ کراچی جانے والے رضا کاروں کو گرفتار نہ کیا جائے۔

چیف منسٹر کی اپیل مورخہ ۶ مارچ کا اثر یہاں بھی وہی ہوا جو دوسرے مقامات پر ہوا تھا یعنی شورش کو مزید تقویت پہنچ گئی۔ اس ضلع میں کسی قدر اہمیت کے واقعات صرف وہ تھے جو اوکاڑہ میں پیش آئے۔

۶ مارچ کو تین ہزار کا ایک ہجوم ریلوے سٹیشن پر پہنچا اور اس نے ڈاؤن پاکستان میل کو تین گھنٹے تک روکے رکھا۔ ہجوم نے ڈبوں کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ ٹرین کو روکنے والی ویکیوم کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور مسافر عورتوں کو بے آبرو کیا۔ ۸ مارچ کو اوکاڑہ کے قریب ٹیلیگراف کے تار کاٹ دیے گئے۔ ۳۰ اپریل کو جامع مسجد میں چند آتش ریز تقریروں کے بعد عورتوں کا جلوس نکلا جو کچھ کتبے اور جھنڈے اٹھائے ہوئے تھیں۔ پولیس نے کتبے چھیننے کی کوشش کی جس پر پانچ سو آدمیوں کا

ایک پرغیظ ہجوم پولیس پر پل پڑا۔ پولیس اس ہجوم کو پیچھے ہٹا رہی تھی کہ ستر سال کا ایک بوڑھا آدمی زخمی ہوا اور پھر ہسپتال میں فوت ہوگیا۔

۸ مارچ کا ایک اور واقعہ بھی ہے اگرچہ اس کا ذکر کسی سرکاری بیان میں نہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کے باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ حافظ محمد بخش سیکرٹری جماعت احمدیہ چک نمبر ۲ (نزد اوکاڑہ) اور ان کے کنبے کے اشخاص کو جن میں ایک بی اے اور دوسرا بی اے ایل ایل بی ہے، مجبور کیا گیا کہ اپنے عقیدے سے توبہ کرلیں اور تحریک احمدیہ کے بانی کو گالیاں دیں۔ پھر چار پانچ ہزار کا ایک ہجوم ان کو جامع ملیہ اوکاڑہ میں لایا۔ جہاں وہ مولوی ضیاالدین اور مولوی معین الدین کے سامنے پیش کیے گئے اور ان سے کہا گیا کہ ان مولویوں کے سامنے اپنے عقائد سے منحرف ہونے کا اعلان کریں۔

سرغنوں کو آسانی سے گرفتار کرنے کے لیے ۱۴ مارچ کو اوکاڑہ میں چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۷ مارچ کو منٹگمری میں ڈھائی بجے دوپہر سے ۶ بجے صبح تک کرفیو عائد رکھا گیا۔ اس کے بعد ۱۳ مارچ کو منٹگمری اور اوکاڑہ میں ۱۷ دن کے لیے عام جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیے گئے۔

اوکاڑہ میں ۱۳ اپریل کا واقعہ پیش آنے کے بعد ضلع کے حالات پھر اپنے معمول پر آگئے۔

حصہ چہارم

وہ کوائف جن کا نتیجہ مارشل لاء کے اعلان کی صورت میں نکلا

یہ اس کیس کا کم وبیش تاریخ وار بیان ہے جس میں ہم نے متعلقہ واقعات وحقائق بیان کرنے کے علاوہ نکات پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جو بعض فریقوں کے درمیان مابہ النزاع تھے۔ اب ہم اپنے اخذ کردہ نتائج کو یکجا پیش کرینگے اور اپنے دائرہ تحقیقات کی شروط کی تکمیل کریں گے۔ ہم دفعہ ۴ پنجاب ایکٹ ۲، ۱۹۵۴ء اس کام پر مامور کیے گئے تھے کہ مندرجہ ذیل دوائر تحقیقات کے مطابق فسادات کے متعلقہ کوائف اور اس کی ذمہ داری کے تعین کی غرض سے تحقیقات کریں:۔

(الف) فسادات کی ذمہ داری

(ب) وہ کوائف جو ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لا کے اعلان کا موجب ہوئے۔

(ج) صوبائی سول حکام نے فسادات کی روک تھام اور اس کے بعد ان کے تدارک کے لیے جو تدابیر اختیار کیں وہ کافی تھیں یا ناکافی۔

فقرہ (ب) میں کوائف کے متعلق جو ہدایت ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم محض ان واقعات کے بیان پر اکتفا کر لیں جو فسادات سے پہلے یا ان کے دوران میں رونما ہوئے ہوں۔ ہم اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ فسادات سے اور لاہور میں مارشل لا کے اعلان سے پہلے اور ان کے دوران میں جو واقعات وحوادث پیش آئے، ان کے درمیان سببی تعلق کا پتہ چلانا ہمارا کام ہے۔ ایکٹ ہم سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ ہم اس امر کا پتہ چلائیں کہ فسادات کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا تحقیقات کی نوعیت کا تقاضا یہ ہے کہ فسادات کی ذمہ داری کے متعلق ان کوائف کی نسبت جو

مارشل لا کے اعلان کا باعث ہوئے اور ان تدبیروں کے متعلق جو فسادات کی روک تھام اور ان کے تدارک کے لیے اختیار کی گئیں، بحث ونظر، حوالہ جات اور اظہار رائے کے عملیات باہم گڈمڈ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ان موضوعات کو الگ الگ رکھیں۔ اور حتی الوسع اعادے سے بچیں لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ موضوعات آپس میں ایک دوسرے سے بے حد مربوط اور مخلوط ہیں۔ اگرچہ ذمہ داری کا ذکر فقرہ (الف) اور کوائف (ب) میں ہوا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک زیادہ آسان اور منطقیانہ بات یہی ہے کہ ہم پہلے آخر الذکر شق کو لیں۔

یہ امر تمام جماعتوں کے نزدیک مسلم ہے کہ ۶ مارچ کو جو کوائف موجود تھے۔ ان میں حالات کو فوج کے حوالے اور سول اقتدار کو فوج کے ماتحت کر دینا بالکل ناگزیر ہو چکا تھا۔ سول کے حکام جو عام حالات میں قانون وانتظام کے قیام کے ذمہ دار ہوتے ہیں کاملاً بے بس ہو چکے تھے اور ان مارچ کو پیدا ہونے والی صورت حالات کا مقابلہ کرنے کی کوئی خواہش اور اہلیت باقی نہ رہی تھی۔ نظم حکومت کی مشینری بالکل بگڑ چکی تھی اور کوئی شخص مجرموں کو گرفتار کر کے یا ارتکاب جرم کو روک کر قانون کو نافذ العمل کرنے کی ذمہ داری لینے پر آمادہ یا خواہاں نہ تھا۔ انسانوں کے بڑے بڑے مجمعوں نے جو معمولی حالات میں معقول اور سنجیدہ شہریوں پر مشتمل تھے۔ ایسے سرکش اور جنوں زدہ ہجوموں کی شکل اختیار کر لی تھی جن کا واحد جذبہ یہ تھا کہ قانون کی نافرمانی کریں اور حکومت وقت کو جھکنے پر مجبور کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی معاشرے کے ادنیٰ اور ذلیل عناصر موجود بدنظمی اور ابتری سے فائدہ اٹھا کر جنگل کے درندوں کی طرح لوگوں کو قتل کر رہے تھے۔ ان کی املاک کو لوٹ رہے تھے اور قیمتی جائداد کو نذر آتش کر رہے تھے۔ محض اس لیے کہ یہ ایک دلچسپ تماشا تھا یا کسی خیالی دشمن سے بدلہ لیا جارہا تھا پوری مشینری جو معاشرے کو زندہ رکھتی ہے، پرزہ پرزہ ہو چکی تھی اور مجنوں انسانوں کو دوبارہ ہوش میں لانے اور بے بس شہریوں کی حفاظت کرنے کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ سخت سے سخت تدابیر اختیار کی جائیں۔ گویا مارشل لا کے نفاذ کے براہ راست ذمہ دار فسادات تھے لیکن خود فسادات کیونکر وجود میں آئے؟ آیا کوئی فوری اور غیر متوقع واقعہ ان کا باعث ہوا تھا یا بعض افراد یا گروہ مدت سے دانستہ ان کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ یہاں پھر یہ امر مسلم ہے کہ فسادات ان

احتجاجوں اور مظاہروں کا نتیجہ تھے جو پنجاب کے مختلف قصبوں میں اس وقت شروع ہوئے جب کراچی میں ۲۷ فروری کی صبح کو اور پنجاب کے بعض قصبوں میں ۲۷ فروری کی شب کو یا اس کے بعد مجلس عمل کے بعض ممبر گرفتار کر لیے گئے۔ یہ گرفتاریاں اس لیے عمل لائی گئیں کہ ڈائریکٹ ایکشن کی وہ دھمکی جس کا نوٹس یہ لوگ یا ایک ماہ قبل وزیراعظم پاکستان کو دے چکے تھے، اب عمل میں آنے والی تھی۔ اور ۲۷ فروری کی صبح سے گورنر جنرل اور وزیراعظم کی کوٹھیوں پر رضا کاروں کے دستے بھیجے جانے والے تھے۔ ہم کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ اگر اجازت دی جاتی تو یہ دستے پورے نظم وضبط کے ساتھ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتے اور مطالبات کے متعلق حکومت کی بے پروائی کے خلاف عوام کی ناراضی کا کوئی اظہار نہ کیا جاتا اور یہ پانچ پانچ آدمیوں کے دستے محض ایک قسم کی ستیاگرہ پیش کرنے والے تھے۔ لیکن جس شخص کو یہ تجربہ ہے کہ ایسے موقع پر کیا ہوا کرتا ہے۔ وہ اس قسم کی توقع کو محض خوش خیالی اور کھلی دلیل سمجھ کر رد کر دے گا۔ اگر کراچی یا دوسرے مقامات پر کوئی گرفتاری نہ کی جاتی تو وہاں کیسے واقعات رونما ہوتے اور شورش کیا صورت اختیار کرتی، یہ محض قیاس وتخیل کا معاملہ نہیں بلکہ ایسے موقعوں پر نفسیات اجتماع اور انتظامی مشکلات کے تجربے کی روشنی میں ہر ذہین شخص صحیح حکم لگا سکتا ہے اور مستقبل کے واقعات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر ۲۷ فروری کی صبح کو گرفتاریاں نہ بھی کی جاتیں تو فسادات ضرور رونما ہوتے۔ صرف اتنا فرق ہوتا کہ تھوڑی دیر بعد کراچی میں اور پنجاب کے اہم قصبوں میں گرفتاریاں اشد ضروری ہو جاتیں۔ جہاں رضا کاروں کے جیش کی ترتیب، ڈائرکٹ ایکشن کی کمیٹیوں کے قیام اور ڈکٹیٹروں کے تقرر کے متعلق طویل تیاریاں کی جا چکی تھیں۔ جب ہم ذمہ داری کے مسئلے پر بحث کرینگے۔ اس وقت بتائیں گے کہ جن جماعتوں نے ڈائریکٹ ایکشن کا تصور قائم کیا اس کی بنیاد رکھی اور اس کا منصوبہ تیار کیا انہیں اس قسم کے اقدام کے قدرتی نتائج کا اندازہ تھا اور مجلس عمل کا ہر ممبر اگر وہ احمق نہیں تھا تو بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ جو راہ عمل مجلس نے اختیار کی ہے۔ اس میں شہریوں کے جان و مال اور حکومت کی مشینری کے وجود کے لیے شدید خطرات مضمر ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وزیراعظم کو جو نوٹس دیا گیا اس میں صاف لکھا تھا کہ اگر وہ مطالبات کو قبول کرنے آمادہ نہیں ہیں تو اپنے عہدے سے استعفاد دے دیں اور ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی صرف

اس صورت میں دی گئی کہ وہ اپنی ضد پر قائم رہیں اور مطالبات کو منظور نہ کریں اور اس دھمکی میں اس امر کا صاف اعتراف شامل ہے کہ اگر وزیر اعظم مستعفی نہ ہوں گے تو ان کی جگہ کوئی دوسرا آدمی رئیس حکومت مقرر کیا جائے گا جو مطالبات کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو۔ اس بحث کے رو سے بعد میں رونما ہونے والے فسادات کا براہ راست باعث مطالبات ہی کو قرار دیا جائے گا۔

مطالبات تین تھے پہلے مطالبہ میں حکومت سے کہا گیا تھا کہ احمدیوں کے قادیانی فرقے کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ دوسرے مطالبے کا منشا یہ تھا کہ چودھری ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔ اور تیسرا یہ تھا کہ دوسرے احمدی جو مملکت کے کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔ موقوف کر دیے جائیں ہمارے سامنے سب جماعتوں نے تسلیم کیا ہے کہ ان تینوں مطالبات کی نوعیت سیاسی نہیں بلکہ قطعی طور پر مذہبی ہے اس کلیے کا استثنا صرف حافظ کفایت حسین (شیعہ عالم) ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک مطالبہ جس میں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی خواہش کی گئی ہے، مذہبی نوعیت رکھتا ہے۔ باقی دو مطالبات کی نوعیت سیاسی ہے۔ ان مطالبات کی لازمی دینی نوعیت سے نہ جماعت اسلامی نے اور نہ اس کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے انکار کیا ہے۔ گو مولانا نے ان کے لیے چند مزید وجوہ بھی پیش کی ہیں۔ تمام دوسرے علما نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ تینوں کے تینوں مذہبی مطالبات ہیں اور ان میں ایک بھی سیاسی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کوئی شخص جو ڈائریکٹ ایکشن میں شامل تھا، ان مطالبات کی سیاسی نوعیت کو تسلیم ہی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا تو براہ راست فسادات کا ذمہ دار ٹھہرتا۔ ہر متعلقہ شخص نے ان مطالبات کی مذہبی نوعیت پر غالباً اس لیے زور دیا کہ اس پر کہیں ایک دنیاوی مقصد کی خاطر فسادات برپا کرنے کی ذمہ داری عائد نہ ہو جائے۔ کیس کے اس حصے پر بعض اہم گروہ مثلاً احرار اور جماعت اسلامی اور بعض علماء جو ایک زمانے میں احرار یا کانگرس سے وابستہ تھے اور تقسیم سے پہلے علی الاعلان قومیت پرستی اور غیر مذہبی مملکت کے حامی اور تقسیم اور مسلم لیگ کے مخالف تھے واضح طور پر پریشان اور بدحواس ہوئے اور اپنی سابقہ تقریروں کے پیش نظر انہیں اپنی عدم مطابقت اور تضاد کا احساس ہوا کیونکہ اگر مطالبات کی نوعیت مذہبی تھی اور مذہب ایک حقیقت قائمہ و ثابتہ ہے تو یہ سمجھنا بے انتہا مشکل ہو جاتا ہے کہ جو

نظریہ مذہب پر مبنی ہو وہ ایک وقت سے دوسرے وقت اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر تبدیل کیونکر ہوسکتا ہے۔ انہیں اس موقف کے عواقب کا پورا شعور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام کے سامنے اس پوزیشن پر قائم رہے کہ یہ مطالبات ان کے مذہبی عقائد پر مبنی ہیں۔

ہم مطالبات کے متعلق ایک اور نکتہ اس موقع پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ مطالبات صرف ان اشخاص کے نہیں بتائے جاتے جو آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور کی قراردادیں منظور کرنے میں شریک تھے۔ بلکہ ان کو اسلام کے تمام فرقوں کے متفقہ مطالبات سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے یہ دعویٰ کسی نے نہیں کیا کہ ہر مذہبی گروہ یا انجمن نے جن میں سے بعض کے اپنے آئین و دستور موجود ہیں، الگ الگ اس موضوع پر بحث کی ہے اور اس کے متعلق اپنے آئین کے ماتحت قراردادیں منظور کی ہیں۔ جو کچھ ہوا، وہ یہ ہے کہ ہر مذہبی گروہ کا کوئی رکن یا بعض ارکان (خواہ وہ عہدہ دار ہوں یا نہ ہوں) کنونشن میں اس گروہ کی نمائندگی کے لیے چن لیے گئے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مطالبات تمام مذہبی گروہوں کے متفقہ مطالبات ہیں تو یہ دعویٰ صرف اس حد تک صحیح ہے کہ ملک کے نہایت اہم مذہبی گروہوں میں کسی رکن یا چند ارکان نے مطالبات کے متعلق استحسان ظاہر کیا ہے لہٰذا صرف ان معنوں میں ان مطالبات کو تمام مسلم فرقوں کے مطالبات ہیں تو یہ دعویٰ صرف اس حد تک صحیح ہے کہ ملک کے نہایت اہم مذہبی گروہوں میں کسی رکن یا چند ارکان نے مطالبات کے متعلق استحسان ظاہر کیا ہے۔ لہٰذا صرف ان معنوں میں ان مطالبات کو تمام مسلم فرقوں کے مطالبات کہا جاسکتا ہے۔

جب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ مطالبات متفقہ ہیں اور ان کی نوعیت مذہبی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ مطالبات متفقہ ہیں اور ان کی نوعیت مذہبی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ مطالبات تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک بعض دینی مسلمات و عقائد کی بنا پر واضح طور پر ثابت ہیں جن علما سے ہم نے اس موضوع پر سوالات کیے قریب قریب ان سب نے بیان کیا کہ یہ مطالبات اس قرارداد مقاصد کا جو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ۱۲ اپریل مارچ ۱۹۴۹ء کو منظور کی تھی اور دین و سیاست کے اس مجموعے کا قدرتی نتیجہ ہیں جس کو اسلام کہتے ہیں، بہت زور شور سے بیان کیا گیا ہے

کہ پاکستان کا مطالبہ اور قیام محض اس غرض سے عمل میں آیا تھا کہ نئی مملکت کا آئندہ سیاسی نظام قرآن اور سنت پر مبنی ہوگا اور جب پاکستان کا مطالبہ حقیقتاً پورا ہوگیا اور قرارداد مقاصد نے اس مطالبہ کی بنیاد کو واضح طور پر تسلیم کرلیا تو علما اور پاکستانی شہریوں کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہوگیا کہ ہر مطالبہ جو مذہبی دلائل کی رو سے صحیح ثابت کر دیا جائے اس کو مملکت کے ارباب اختیار صرف قبول ہی نہ کرینگے بلکہ اس کا پرجوش خیر مقدم کرینگے کیونکہ وہ خود کئی سال سے پاکستان میں ایک ایسی اسلامی مملکت قائم کرنے کے لیے چیخ پکار کرتے رہے ہیں جس میں اسلامی نمونے کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی ادارات قائم کیے جاسکیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ بعض لیڈروں نے علی الاعلان اس نصیب العین کے حصول کو اپنی زندگی کا واحد مقصد قرار دیا ہے۔ لہٰذا ان مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے علما کو دینیاتی مسائل دلائل سے صرف یہ ثابت کر دینے کی ضرورت ہے کہ احمدی ایک علیحدہ قوم اور خارج از اسلام ہیں اور اس ملک کے امور عامہ میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں رکھتے جس کا نظم ونسق قطعی طور پر احکام اسلام کے مطابق چلایا جائے گا۔ مطالبات کی حقیقی نوعیت کا اندازہ لگانے کے لیے اس موقع پر یہ بیان کرنا ضروری ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام دین وسیاست کا مجموعہ ہے تو اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اسلام ایک ثقافتی مجموعہ ہے جو سیاسی ساخت اور قانونی ومعاشرتی روایات پر حاوی ہے اور جو اسلامی عقائد وعبادات اخلاقیات اور جو اسلامی عقائد وعبادات اخلاقیات اور ادارت عائلی سے الگ ممتاز ہے۔ اسلام کا یہ تصور جزوی طور پر یورپی اصطلاحات سے مستعار لیا گیا ہے۔ لیکن اس کی بنا ''دارالاسلام'' کے نظریے پر بھی ہے۔ یعنی وہ ملک جو زندگی کے متعلق ایک مخصوص اور علیحدہ زاویہء نگاہ رکھتا ہو اور اپنے تمام ادارات کی بنیاد اور اپنی تمام سرگرمیوں کی اساس، ان مقاصد کے حصول پر رکھتا ہو جنکی ہدایت الہام الٰہی سے ملی ہے۔ ہم اس موضوع پر دوبارہ توجہ کرینگے لیکن موجودہ مرحلے پر یہ سمجھ لینا بے حد اہم ہے کہ ان مطالبات کو اسلامی مملکت کے نظریہ پر مبنی ہونے کے معنی کیا ہیں۔ اس مقصد کے لیے نہ صرف یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائد میں کیا کیا فرق ہے بلکہ دین وسیاست کے اس متحدہ نظام کا جس کو اسلام کہتے ہیں۔ اور اسلامی مملکت کے اس نظریے کا جس کا لازمی نتیجہ ان مطالبات کو بتایا جاتا ہے صحیح اور واضح تصور کیا ہے۔

عذاب ہے۔ ان کے کفر کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی تو بہت کم ایمان لاتے ہیں، وہ جو رسول اللہ کو ایذا دیتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے، بیشک جو اللہ و رسول کو ایذا دیتے ہیں اللہ نے دنیا و آخرت میں ان پر لعنت فرمائی اور ان کے لئے تیار کر رکھا ذلت دینے والا عذاب۔ طوائف مذکورین وہابیہ و نیچریہ و قادیانیہ و غیر مقلدین و دیوبندیہ و چکڑالویہ خذلہم اللہ تعالیٰ اجمعین ان آیات کریمہ کے مصداق بالیقین اور قطعاً یقیناً کفار مرتدین ہیں، ان میں ایک آدھ اگرچہ کافر فقہی تھا اور صدہا کفر اس پر لازم تھے جیسے نمبر ۲ والا دہلوی مگر اب اتباع و اذناب میں اصلاً کوئی ایسا نہیں جو قطعاً یقیناً اجماعاً کافر کلامی نہ ہو ایسا کہ من شک فی کفرہ فقد کفر[1] جو ان کے اقوال ملعونہ پر مطلع ہو کر ان کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ اور احادیث کہ سوال میں ذکر کیں بلاشبہ ان کے اگلے پچھلے تابع متبوع سب ان کے مصداق ہیں، یقیناً وہ سب بدعتی اور استحقاق نار جہنمی اور جہنم کے کتے ہیں مگر انھیں خوارج و روافض کے مثل کہنا روافض و خوارج پر ظلم اور ان وہابیہ کی کسر شان خباثت ہے۔ رافضیوں خارجیوں کی قصدی گستاخیاں صحابہ کرام و اہلبیت عظام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر مقصور رہیں اور ان کی گستاخیوں کی اصل مطمح نظر حضرات انبیائے کرام اور خود حضور پر نور شافع یوم النشور ہیں صلے اللہ تعالیٰ علیہ وعلیہم وسلم ؏

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

(راستے کا تفاوت دیکھ کہاں سے کہاں تک ہے۔ ت)

ان تمام مقاصد اور ان سے بہت زائد کی تفصیل فقیر کے رسائل سل السیوف و کوکبۃ شھابیۃ و سبحان السبوح و فتاوی الحرمین و حسام الحرمین و تمہید ایمان و انباء المصطفٰی و خالص الاعتقاد و قصیدۃ الاستمداد اور اس کی شرح کشف ضلال دیوبندیہ وغیرہا کثیرہ ثبیرہ، حافلہ کافلہ، شافیہ وافیہ، قالعہ قامعہ میں ہے وللہ الحمد، ان کے پیچھے اقتداء باطل محض ہے کما حققناہ فی النہی الاکید (جیسا کہ ہم نے "النہی الاکید" میں اس پر تفصیلاً گفتگو کی ہے۔ ت) ان سب کی کتب کا مطالعہ حرام ہے مگر عالم کو بغرض رد۔ ان سے میل جول قطعی حرام، ان سے سلام و کلام حرام، انھیں پاس بٹھانا حرام، ان کے پاس بیٹھنا حرام، بیمار پڑیں تو ان کی عیادت حرام، مرجائیں تو مسلمانوں کا سا انھیں غسل و کفن دینا حرام، ان کا جنازہ اٹھانا حرام، ان پر نماز پڑھنا حرام، انھیں مقابر مسلمین میں دفن کرنا حرام، ان کی قبر پر جانا حرام، انھیں ایصال ثواب کرنا حرام، مثل نماز جنازہ کفر۔ قال اللہ تعالیٰ:

---

[1] درمختار باب المرتد مطبع مجتبائی دہلی ۱/۳۵۶

ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار۔[1] بیشک منافقین سب سے نیچے طبقۂ دوزخ میں ہیں۔

کافر مجاہر چار قسم ہے:

اول دہریہ کہ خدا ہی کا منکر ہے۔

دوم مشرک کہ اللہ عزوجل کے سوا اور کو بھی معبود یا واجب الوجود جانتا ہے، جیسے ہندو بت پرست کہ بتوں کو واجب الوجود تو نہیں مگر معبود مانتے ہیں اور آریہ کہ روح و مادہ کو معبود تو نہیں، مگر قدیم و غیر مخلوق جانتے ہیں دونوں مشرک ہیں اور آریوں کو موحد سمجھنا سخت باطل ہے۔

سوم مجوسی آتش پرست۔

چہارم کتابی یہود و نصارٰی کہ دہریہ نہ ہوں،

ان میں اول تین قسم کا ذبیحہ مردار اور ان کی عورتوں سے نکاح باطل ہے اور قسم چہارم کی عورت سے نکاح ہوجائے گا اگرچہ ممنوع و گناہ ہے۔

کافر مرتد وہ کہ کلمہ گو ہو کر کفر کرے اس کی بھی دو قسمیں ہیں: مجاہر و منافق۔

مرتد مجاہر وہ کہ پہلے مسلمان تھا پھر علانیہ اسلام سے پھر گیا کلمۂ اسلام کا منکر ہوگیا چاہے دہریہ ہوجائے یا مشرک یا مجوسی یا کتابی کچھ بھی ہو۔

مرتد منافق وہ کہ کلمۂ اسلام اب بھی پڑھتا ہے اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتا ہے اور پھر اللہ عزوجل یا رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم یا کسی نبی کی توہین کرتا یا ضروریات دین میں کسی شئے کا منکر ہے، جیسے آجکل کے وہابی، رافضی، قادیانی، نیچری، چکڑالوی، جھوٹے صوفی کہ شریعت پر ہنستے ہیں، حکم دنیا میں سب سے بدتر مرتد ہے اس سے جزیہ نہیں لیا جاسکتا، اس کا نکاح کسی مسلم کافر مرتد اس کے ہم مذہب یا مخالف مذہب غرض انسان حیوان کسی سے نہیں ہوسکتا، جس سے ہوگا محض زنا ہوگا، مرتد مرد ہو خواہ عورت، مرتدوں میں سب سے بدتر مرتد منافق ہے، یہی وہ ہے کہ اس کی صحبت ہزار کافر کی صحبت سے زیادہ مضر ہے کہ یہ مسلمان بن کر کفر سکھاتا ہے خصوصاً وہابیہ خصوصاً دیوبندیہ کہ اپنے آپ کو خاص اہلسنت کہتے، حنفی بنتے، چشتی نقشبندی بنتے، نماز روزہ ہمارا سا کرتے، ہماری کتابیں پڑھتے پڑھاتے

---

[1] القرآن الکریم ۴/۱۴۵

اور اللہ و رسول کو گالیاں دیتے ہیں، یہ سب سے بدتر زہر قاتل ہیں، ہوشیار خبردار! مسلمانو! اپنا دین بچائے ہوئے رہو فاللہ خیر حفظا وھو ارحم الراحمین[1] (تو اللہ سب سے بہتر نگہبان اور وہ ہر مہربان سے بڑھ کر مہربان۔ ت) واللہ تعالٰی اعلم۔

مسلمانوں اور احمدیوں کے درمیان عقائدی اختلافات

اس سے پیشتر رپورٹ کے حصہ اول میں ہم احمدی تحریک کے آغاز کا مختصر حال بیان کر چکے ہیں اور اس تحریک کے پیرووں کے مخصوص عقائد و مسلمات کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے اب ہم ان عقائد پر زیادہ جامعیت کے ساتھ نظر ڈالیں گے تا کہ مسلمانوں اور احمدیوں کے دینی اختلافات کو بہتر طور سے سمجھ سکیں۔

ختم نبوت

پہلا اختلاف احمدی جماعت کے بانی مرزا غلام احمد کے مقام سے تعلق رکھتا ہے۔ مرزا غلام [illegible] کا دعویٰ ہے کہ وہ نبی ہیں اور مسلمانوں کے نزدیک وہ اس دعوے کی وجہ سے بالکل خارج از اسلام ہو گئے ہیں۔ ایک متفق علیہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوع بشر کی ہدایت کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے ہیں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یہ انبیا کا سلسلہ جن میں سے بعض کا ذکر قرآن مجید اور بائبل میں خاص طور سے آیا ہے پیغمبر اسلام صلعم پر ختم ہو جاتا ہے۔ عقیدہ ختم نبوت ان معنوں میں کہ نبوت رسول پاک کے وصال پر ختم ہوگئی۔ اور اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے ماخوذ بتایا جاتا ہے۔

ماکان محمد ابآ احد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبین و کان اللہ بکل شی علیما (سورہ ۳۳۔ آیت نمبر ۴۰)

ترجمہ۔ محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

واذا اخذ اللہ میثاق النبین لمآ اتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جاء کم رسول مصدق لما معکم لتومنن بہ ولتنصرنا ط قال ء اقررتم واخذ تم علے ذلکم

MunirReport.pdf

اصری ط قالوآ اقررنا ط قالا فاشھدو وانا معکم من الشھدین.

(سورہ ۳۔آیت ۸۱:)

ترجمہ۔اور جب اللہ نے عہد لیا انبیا سے کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں اور پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو مصداق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس کی طرفداری بھی کرنا۔فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا۔وہ بولے ہم نے اقرار کیا فرمایا کہ تو گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشو ھم واخشون ط الیوم اکملت لکم دینکم و اتمت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا.

(سورہ ۵۔آیت ۴)

289

ترجمہ۔آج کے دن کافر لوگ تمہارے دین سے ناامید ہو گئے سو ان سے مت ڈرنا اور مجھ سے ڈرتے رہنا آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر انعام ختم کر دیا اور اسلام کو تمہارا دین بننے کے لیے پسند کر لیا۔

اس کے علاوہ متعدد احادیث سے اور آیات مندرجہ کی مستند تفاسیر سے جو متقدمین کے زمانے سے چلی آتی ہیں، یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے نبی کریم کے بعد کوئی نیا نبی مبعوث نہ ہوگا۔عربی فارسی اور اردو کے بعض مشہور شعرا کے اشعار اور اس موضوع پر بعض رسالوں اور کتابچوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

جماعت احمدیہ کے فاضل وکیل مسٹر عبدالرحمان خادم نے اس کے برعکس سورہ ۴ آیت ۶۹، سورہ ۵ آیت ۱۹، سورہ ۷ آیت ۳۵ اور سورہ ۲۳ آیت ۵۱ کے حوالے دیے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبین والصدیقین و الشھداء والصلحین و حسن اولئک رفیقا (سورہ ۴ آیت ۶۹)

ترجمہ۔اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے۔یعنی انبیا صدیقین، شہدا اور صلحا اور یہ حضرات بہت

اچھے رفیق ہیں۔

والذین آمنو باللہ ورسلہ اولٹک ھم الصدیقون والشھدآء عند ربھم لھم اجرھم ونورھم والذین کفروا وکذبوا بایاتنا اولٹک اصحاب الجحیم

(سورہ ۵۷ آیت ۱۹)

ترجمہ۔اور جولوگ اللہ اوراس کے رسولوں پرایمان رکھتے ہیں۔ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اورشہید ہیں ان کے لیے ان کا اجراوران کا نور ہوگا اور جولوگ کافر ہوئے اور ہماری آیتوں وجھٹلایا یہی لوگ جہنمی ہیں۔

یا یھا الرسل کلو من الطیبت واعملو صالحا انی بما تعملون علیم

(سورہ ۲۳ آیت ۵۱)

ترجمہ:۔اے پیغمبرو!نفیس چیزیں کھاؤاور نیک کام کرومیں تم سب کے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتاہوں۔

290

استدلال کا ایک خاص طریقہ ہے جس کی تصریح کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں کیونکہ ہمارا فرض یہ نہیں ہے کہ کسی خاص تاویل کی صحت کے مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کریں استدلال کے اس طریقے کے ماتحت قرآن مجید کی ان آیات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مستقبل میں یعنی ہمارے رسول پاک کے بعد ایسے اشخاص پیدا ہونگے جن پر نبی یا رسول کی اصطلاح کا اطلاق ہو سکے گا۔اس دلیل کوتقویت پہنچانے کے لیے بعض احادیث بھی نقل کی گئی ہیں اور بعض ایسے مفسرین اور دوسرے حضرات کی تصانیف کے حوالے بھی دیے گئے ہیں جن کی روحانی برتری عام طور مسلم ہے اگرچہ اس امر سے انکارنہیں کیا جاتا کہ مرزا غلام احمد نے نبی کا لفظ اپنے لیے استعمال کیا ہے لیکن یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ لفظ ایک خاص معنی میں استعمال کیا ہے اور وہ اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے نبی نہ تھے۔یعنی وہ اللہ کی طرف سے کوئی ایسا پیغام نہ لائے تھے جس سے سابقہ پیغام کی تنسیخ ترمیم یا ایزادی لازم آتی ہواوران کا دعویٰ تشریعی نبوت کا نہیں۔بلکہ ظلی یا بروزی نبوت کا ہے۔

فریق ثانی کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ ظل اور بروز کا تصور (جسے حلول یا ہندی میں اوتار کہنا

چاہیے) عقائد اسلامی کے منافی ہے اور ہر شخص جو وحی نبوت کا مورد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ ایک نئی امت کی بنیاد رکھتا ہے۔ لہٰذا ملت اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ مرزا غلام احمد، موجودہ امام جماعت احمدیہ اور اس جماعت کے ممتاز مصنفین کی تحریروں کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا غلام احمد نے ایسی وحی اور ایسے الہام کے مورد ہونے کا دعویٰ کیا جس سے اب تک اللہ تعالیٰ مخصوص طور پر صرف انبیا ہی کو نوازتا رہا ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ صرف اس ایک سوال پر محدود ہو جاتا ہے کہ آیا مرزا غلام احمد نے کبھی ایسی وحی کے مورد ہونے کا دعویٰ کیا ہے جو ''وحی نبوت'' کہلا سکتی ہو۔ زمانہ ماضی میں جب کبھی کوئی نبی آیا اس نے اپنی قوم کو یہ حکم دیا (ہمارے نبی کریم نے پوری نوع بشر کو مخاطب فرمایا تھا) کہ میرے دعوے پر غور کرو اور مجھ پر ایمان لاؤ اگر تم میری نبوت کے متعلق شک و شبے اور بے یقینی میں مبتلا ہو گئے تو عاقبت میں سزا کے مستوجب ہو گے۔ لہٰذا لوگ محسوس کرتے ہیں کہ یا اس دعوے کو ماننا ہو گا یا اس سے انکار کرنا ہو گا۔ پھر جو لوگ اس دعوے کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان کی ایک علیحدہ مذہبی جماعت بن جاتی ہے جس کو اصلی قوم اچھوت سمجھنے لگتی ہے اور نئی جماعت ان لوگوں کو جو نئے نبی کی تصدیق نہیں کرتے اپنے سے منقطع سمجھتی ہے۔ اگرچہ مرزا غلام احمد نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور لوگوں کو تلقین کی کہ وہ اس ہاتھ پر بیعت کر لیں لیکن یہ سوال بدستور قائم رہا کہ آیا انہوں اپنی وحی کو ''وحی نبوت'' کا مرتبہ دیا ہے جس پر ایمان نہ لانا آخرت میں عذاب و عتاب الٰہی کا موجب ہو گا۔ احمدیوں نے اور ان کے موجودہ امام نے بڑے غور و خوض کے بعد ہمارے سامنے یہی موقف اختیار کیا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنی وحی ''وحی نبوت'' کے برابر قرار نہیں دیا۔ لیکن فریقین ثانی کا پر زور دعویٰ ہے کہ انہوں نے یقیناً قرار دیا ہے۔ احمدی لٹریچر میں جس میں خود مرزا غلام احمد اور موجودہ امام جماعت احمدیہ کی تحریریں بھی شامل ہیں، ایسے قرائن موجود ہیں جن سے فریق ثانی کے دعوے کی تائید ہوتی ہے لیکن ہمارے سامنے جو موقف اختیار کیا گیا ہے وہ واضح طور پر یہ ہے کہ مرزا غلام احمد اپنے آپ کو محض اس لیے نبی کہتے تھے کہ ان کو ایک الہام میں اللہ تعالیٰ نے نبی کر کے مخاطب کیا تھا وہ کوئی نیا قانون یا ضابطہ نہیں لائے انہوں نے اصلی اور پرانی شریعت میں نہ کوئی تنسیخ کی ہے نہ اضافہ کیا ہے اور مرزا صاحب کی وحی پر ایمان نہ لانے سے کوئی شخص

خارج از اسلام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اس معاملے میں رائے دینا ہمارا کام نہیں کہ احمدی دائرہ اسلام سے خارج ہیں یا نہیں۔ ہم نے اس نقطہ کا ذکر محض اس لیے کیا ہے کہ احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان جو اختلافات بتائے جاتے ہیں، ان کی تصریح کر دیں۔ اب یہ قرار دینا غیر احمدیوں کا کام ہے کہ احمدیوں کو مسلمان سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے۔

مسیحیات

فریقین کے درمیان دوسرا اہم اختلاف یسوع مسیح کے صلیب دیے جانے اور یوم قیام سے پہلے ان کے ظہور ثانی کے متعلق ہے۔ مسیح کے مصلوب ہونے اور دوبارہ ظہور کرنے کے متعلق کم از کم [illegible] عقیدے موجود ہیں۔

(۱) ایک عقیدہ جس پر اکثر مسلمان فرقے متفق ہیں۔ یہ ہے کہ مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے بلکہ چوتھے آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ روز قیامت سے پہلے زمین پر اتریں گے اور ان کا ظہور قیامت کی نشانیوں میں سے ہوگا۔

(۲) ایک عقیدہ احمدیوں کا ہے کہ مسیح صلیب پر وفات پانے سے بچ گئے۔ شاگردوں نے ان کا علاج معالجہ کیا جب ان کے زخم اچھے ہو گئے تو وہ کشمیر چلے گئے جہاں طبعی موت مر گئے۔ روز قیامت سے پہلے جس شخص کے ظہور کا وعدہ کیا گیا ہے۔ وہ اپنے خصائل میں مسیح کا مثل ہوگا اور وہ شخص مرزا غلام احمد ہے۔

(۳) ایک عقیدہ یہ ہے کہ مسیح صلیب پر فوت ہو گئے تھے۔ لیکن روز قیامت سے پیشتر اپنی قبر میں جی اٹھیں گے اور

(۴) ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ مسیح صلیب پر فوت ہو گئے تھے اور اب نہ وہ خود ظاہر ہونگے نہ ان کا کوئی مثل آئیگا قرآن مجید کی جن آیات میں اس قصے کا ذکر ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

ولما ضرب ابن مریم مثلا اذا قومک منه یصد ون O وقالوا ء الھتنا خیر ام

هو ماضربوه لک الا جدلا بل هم قوم خصمون O ان هو الا عبد انعمنا علیه وجعلناه مثلا لبنی اسرائیل O ولو نشآء لجعلنا منکم ملائکة فی الارض یخلفون O وانه لعلم للساعة فلا تمترن بها واتبعون هذا صراط مستقیم (سورہ ۴۳۔ آیات ۵۷ تا ۶۱)

ترجمہ۔ اور جب ابن مریم کے متعلق ایک عجیب مضمون بیان کیا گیا تو یکا یک آپ کی قوم کے لوگ چلانے لگے (تحقیر سے) کہنے لگے ہمارے معبود بہتر ہیں یا عیسیٰ یہ جو کچھ ان لوگوں نے بیان کیا محض جھگڑے کے لیے اور یہ لوگ جھگڑالو ہیں۔ عیسیٰ تو محض ایک ایسے بندے ہیں جن پر ہم نے فضل کیا اور ان کو بنی اسرائیل کے لیے ایک نمونہ بنایا۔ اگر ہم چاہتے تو ہم تم سے فرشتوں کو پیدا کر دیتے کہ وہ زمین پر رہا کرتے۔ وہ قیامت کے یقین کا ذریعہ ہیں پست تم لوگ اس میں شک نہ کرو اور میری اتباع کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔

سورہ ۵۔ آیت ۱۱۷:

ما قلت لهم الا ما امرتنی بہٖ ان اعبدوا الله ربی و ربکم و کنت علیهم شهیدا ما دمت فیهم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیهم وانت علی کل شی شهید.

ترجمہ۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا سوائے اس کے جو آپ نے مجھ سے کہنے کو کہا تھا کہ تم اللہ کی بندگی اختیار کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے میں ان پر مطلع رہا جب تک ان میں رہا پھر جب آپ نے مجھے وفات دی تو آپ ان پر مطلع رہے اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

سورہ ۳۔ آیت ۵۵، ۱۴۴:

اذ قال الله یعسیی انی متوفیک ورافعک الی و مطهرک من الذین کفروا وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروآ الی یوم القیمة ثم الی مرجعکم فاحکم بینکم فیما کنتم فیه تختلفون (۵۵)

ترجمہ۔اور جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰ بیشک میں تجھ کو وفات دینے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تجھ کو ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جو منکر ہیں اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں۔ان کو غالب رکھنے والا ہوں ان لوگوں پر جو منکر ہیں روز قیامت تک پھر سب کی واپسی میری طرف ہوگی۔سو میں تمہارے درمیان ان امور میں فیصلہ کروں گا۔جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقا بکم ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیاً وسیجزی الله الشاکرین.(۱۴۴)

ترجمہ۔محمد صرف رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہو جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص پیٹھ دکھا جائے گا۔وہ خدا کا کوئی نقصان نہ کرے گا اور خدا حق شناس لوگوں کو جلد ہی جزا دے گا۔

سورہ۴۔آیت ۱۵۷تا۱۵۸:

(۱۵۷)وقولھم انا قتلنا المسیح عیسی ابن مریم رسول الله وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبه لھم وان الذین اختلفوا فیه لفی شک منه ط ما لھم به من علم الا اتباع الظن وما قتلوہ یقینا o بل رفعه الله الیه وکان الله عزیزاً حکیماo

ترجمہ۔اور ان کا قول ہے کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو جو خدا کے رسول ہیں قتل کر دیا۔حالانکہ نہ انہوں نے ان کو قتل کیا۔نہ سولی پر چڑھایا۔بلکہ ان کو اشتباہ ہو گیا اور جو لوگ ان کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں ہیں ان کے پاس سوائے ظنی باتوں کے کوئی دلیل نہیں انہوں نے یقیناً قتل نہیں۔بلکہ خدا نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ بڑا زبردست حکمت والا ہے۔

غیر احمدی مسلمان ان آیات کی تفسیر کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تھے بلکہ معجزانہ طور پر نظر کا ایک دھوکا واقع ہو گیا تھا۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے مسیح کو اپنی طرف اٹھا لیا تھا۔ وہ اب تک چوتھے آسمان پر موجود ہیں اور روز قیامت سے پہلے وہاں سے نازل ہوں گے ۔اس عقیدے کی تائید میں بے شمار حدیثیں پیش کی جاتی ہیں ۔لیکن احمدی انہی آیات کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ مسیح صلیب پر نہیں بلکہ عام حالات میں طبعی موت مرے تھے۔ان کے خصائل رکھنے والا ایک اور آدمی موعود تھا۔ چنانچہ وہ مرزا غلام احمد کی شخصیت میں ظہور کر چکا ہے۔ وہ نامور علماو وائمہ کی کئی تحریرات اپنے اس عقیدے کی تائید پیش کرتے ہیں کہ روز قیامت سے پیشتر جو مسیح موعود ظاہر ہونے والا تھا خود مسیح نہیں بلکہ مثیل مسیح ہوگا۔ مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش نے مجلس عمل کی جانب سے یہ دعویٰ کیا کہ ان آیات اور بعض دوسری آیات قرآنی کی احمدی تفسیر ''تاویل وتحریف'' ہے جو کفر وارتداد کی مترادف ہے اور جو شخص اس قسم کی غلط تاویل کا مرتکب ہو۔ وہ حلال الدم والمال ہو جاتا ہے (یعنی اس جان و مال کی حفاظت نہیں کی جاتی)اس بحث میں ایک متنازعہ فیہ معاملہ یہ ہے کہ سورہ ۴۳ کی آیت ۵۷ میں لفظ ''مثلاً'' کے کیا معنی ہیں ۔اور آیات محولہ بالا میں جو لفظ ''وفی'' آیا ہے اس کے مشتقات کیا کیا ہیں ۔اور سورہ ۴۳ کی آیت ۶۱ میں لفظ ''انہ'' کی ضمیر کس طرف راجع ہوتی ہے لیکن یہ ہمارا کام نہیں کہ اس بحث کے مالہ وماعلیہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔

جہاد

فریقین کے درمیان تیسرا اختلاف عقیدہ جہاد کے حدود کے متعلق ہے جن کا ذکر سورہ ۲۲ کی آیات ۳۹، ۴۰ سورہ ۲ کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۴ سورہ ۶۰ کی آیت ۸، سورہ ۴ کی آیات ۷۴، ۷۵ سورہ ۹ کی آیت ۵ اور سورہ ۲۵ کی آیت ۵۲ میں پایا جاتا ہے آیات درج ذیل ہیں۔

سورہ ۲۲ آیات ۳۹۔۴۰

اذن للذین یقتلون بانہم ظلموا وان اللہ علی نصرہم لقدیر. ۞ الذین

ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں۔اے خدا ہمارے لیے غیب سے کوئی دوست بھیج اور کوئی حامی بھیج۔

سورہ ۹۔آیت ۵:

فاذا انسلخ الا شھر الحرم فاقتلوا المشر کین حیث وجد تموھم وخذ و ھم واحصرو ھم واقعدوا لھم کل مرصد فان تابو و اقامو ا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فخلوا سبیلھم ط ان اللہ غفور رحیم۔

ترجمہ۔پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ مارو۔پکڑو۔باندھو اور ان کی گھات میں بیٹھو پھر اگر توبہ کر لیں۔نماز پڑھیں۔زکوۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔اور اللہ بیشک بہت بخشش کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔

سورۃ ۲۵ آیت ۵۲

فلا تطع الکفرین وجاھدھم بہ جھا دا کبیرا۔

ترجمہ۔پس کافروں کی خوشی کا کام نہ کرو اور قرآن سے ان کا زور وشور سے مقابلہ کرو۔

298

جہاں تک عقیدہ جہاد کا تعلق ہے۔احمدیوں کا خیال یہ ہے کہ جس جہاد کو ''جہاد بالسیف'' کہتے ہیں وہ صرف اپنے اپنے دفاع میں جائز ہے اور مرزا غلام احمد نے اس مسئلہ پر اپنا خیال پیش کرتے ہوئے محض ایک عقیدہ مرتب کر لیا ہے جو قرآن مجید ہی کی متعدد آیات پر مبنی اور براہ راست اسی سے ماخوذ ہے اور مرزا صاحب قرآن مجید کے کسی قاعدے یا کسی ہدایت کو منسوخ و موقوف کرنے کے مدعی نہیں ہیں۔دوسری جماعتوں کا جواب یہ ہے کہ اس معاملے کے متعلق مرزا صاحب نے جن کے الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔ان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کسی قرآنی عقیدے کو پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ قرآن کے موجودہ قانون کو منسوخ کر رہے ہیں اس سلسلے میں مندرجہ ذیل فقروں کو بطور ثبوت پیش کیا جا رہا ہے۔

''میں ایک حکم لے کر آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں وہ یہ ہے کہ اب سے تلوار کے جہاد کا

خاتمہ ہے''

''اب جہاد دین کے لیے حرام ہے''

''مسیح کے آنے کا یہ نشان ہے کہ وہ دین کی لڑائیاں کم کردے گا''

''میں نے جہاد کی ممانعت کے بارے میں نہایت مؤثر تقریریں کیں''

''میں نے جہاد کے خلاف صدہا کتابیں تحریر کر کے عرب اور مصر اور بلاد شام اور افغانستان میں گورنمنٹ کی تائید میں شائع کی''۔

''مسیح موعود کے وقت جہاد کا حکم قطعاً منسوخ کر دیا گیا''۔

''اب زمین کے فساد بند ہو گئے''

''اب جو دین کے لیے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی نام رکھ کر کافروں کو قتل کرتا ہے وہ خداوند اور اس کے رسول کا نافرمان ہے''۔

''میرے فرقے میں جس کا خدا نے مجھے امام اور رہبر مقرر فرمایا ہے تلوار کا جہاد بالکل نہیں یہ فرقہ اس بات کو قطعاً حرام جانتا ہے کہ دین کے لیے لڑائیاں کی جائیں''۔

299

''اسلام میں جو جہاد کا مسئلہ ہے میری نگاہ میں اس سے بدتر اسلام کو بدنام کرنے والا اور کوئی مسئلہ نہیں''۔

''مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے''۔

یہ فقرے مرزا صاحب ان کے جانشینوں اور پیروں کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ ان فقروں پر اور اس دعویٰ پر کہ ''میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی'' (اربعین نمبر ۴ صفحہ ۷) انحصار کر کے یہ پرزور طریق پر کہا گیا ہے کہ ان میں جو اعلانات کیے گئے ہیں۔ ان سے قرآن مجید کے موجودہ قانون کی ترمیم یا تنسیخ لازم آتی ہے۔ احمدیوں کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ الفاظ و تصریحات استعمال کی گئی ہیں۔ ان میں تنسیخ کا مفہوم نہیں بلکہ قرآن مجید کے ایک عقیدے کی تعبیر و توجیہ ہے جو صدیوں سے غلط فہمی کا شکار بنا رہا ہے اور بہرکیف ان الفاظ کی تعبیر دوسرے لوگ کچھ بھی کریں، احمدیوں نے اس کا مطلب ہمیشہ یہی سمجھا ہے کہ ان میں کوئی نیا عقیدہ رائج نہیں کیا گیا بلکہ

نظریے سے ہے) دوسری وجوہ کی بنا پر صراحت و وضاحت کی کوشش کی ہے:۔

سورہ ۲۔آیت ۱۰۶

ما ننسخ من آیة او ننسها نات بخیر منها او مثلها الم تعلم ان الله علی کل شی قدیر.

ترجمہ۔ہم کسی آیت کا حکم موقوف کر دیتے ہیں یا اس کو بھلا دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا ویسی ہی آیت بھیج دیتے ہیں کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

سورہ ۱۶۔آیت ۱۰۱

واذا بدلنا آیة مکان آیة والله اعلم بما ینزل قالو انما انت مفتر.

ترجمہ۔اور جب ہم کسی آیت کو دوسری آیت کے بجائے بدلتے ہیں تو گو اللہ تعالی جو حکم بھیجتا ہے اسے خوب جانتا ہے لیکن یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم جھوٹے اور جعلساز ہو۔

301

ہم نے اس بحث کے نکتے کی تصریح کر دی ہے اب ہم اس موضوع کو یہیں چھوڑتے ہیں لیکن بعد میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ قرآن مجید کی سیدھی سادی آیات کو اکثر کس طرح غلط سمجھا گیا ہے اور ان کو بعض نہایت چونکا دینے والی عمومی تاویلات کا آلہ بنایا گیا ہے جو تفسیر یا تاویل کے کسی مسلمہ قاعدے کے رو سے حق بجانب نہ تھیں۔

جس بحث کا سلسلہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کے بیج پچاس سال سے زیادہ عرصے پر بکھرے ہوئے ہیں۔عقیدہ ختم نبوت،عیسیٰ ابن مریم کا روز قیامت سے پہلے بجسد عنصری دوبارہ ظہور اور مسئلہ جہاد ان تینوں مسائل کے متعلق اختلافات ایسے تھے کہ علماء کی طرف سے احتجاج اور مرزا صاحب کے خلاف کفر کے فتوؤں کا اجرا بالکل طبعی تھا۔لہٰذا ۱۸۸۲ء میں جونہی مرزا صاحب نے مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ان کے خلاف کفر کے فتوے دیئے جانے لگے اس تحریک میں جہاں بعض ذی علم اور ذی اثر حضرات مثلاً مولانا محمد علی،خواجہ کمال الدین،ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اور ڈاکٹر محمد حسین کشاں کشاں شامل ہو گئے وہاں دوسرے لوگ غضبناک بھی ہوئے جو اس تحریک کو اصلاً سیاسی تحریک اور مسلمان ممالک و اقوام کے لیے باعث خطرہ سمجھتے تھے۔ڈاکٹر محمد اقبال نے اس کی شدید مذمت کی

اور پروفیسر الیاس برنی نے اس کو استہزا کا نشانہ بنایا۔ بے شمار دیگر حضرات نے اس کے خلاف لکھا اور اب تک مسلسل لکھ رہے ہیں۔ احمدی نشر و اشاعت کی وقعت کو خوب جانتے ہیں چنانچہ ان کی پروپیگنڈا کی مشینری بھی آغاز سے اب تک برابر سرگرم کار رہی۔ اس طرح دونوں طرف سے بے اندازہ لٹریچر فراہم ہو گیا۔

دیگر شکایات والزامات

اسلام کے تمام مذہبی مباحث میں ملحد، مرتد، کافر، زندیق، مشرک، منافق، فاسق، فاجر، مفتری، ملعون، کذاب، شیطان، ابلیس، مردود، شقی کے الفاظ نہایت عام ہیں۔ چنانچہ اس مباحثے کے متعلقہ لٹریچر میں یہ تمام الفاظ استعمال کیے جانے لگے۔ اس کے بعد فریقین نے ایسے الفاظ بھی استعمال کیے جو چنداں اصطلاحی نہ تھے مثلاً ولد الزنا، ولد الحرام خنزیر، طوائفیں، رنڈیاں، کتیاں، شرابی، زانی، بدکار، فریبی، غنڈا، خونی، بے حیا اور بے شمار دیگر الفاظ جن کا ذکر بے حد شرمناک ہے۔ تقسیم کے بعد سے اس نزاع نے محض دشنام طرازی کی ایک مسلسل مہم کی صورت اختیار کر لی ہے جس میں شخصی چال چلن پر نہایت فحش اور بازاری حملے کیے گئے ہیں۔ احرار اس معاملے میں اپنے مخالفین سے ہمیشہ بازی لے گئے ہیں۔

اس قسم کے اختلاف انگریزوں کے لیے نہایت مفید تھے کیونکہ ان کا منشا یہی تھا کہ ان کے محکوم لوگ مذہبی اختلافات میں الجھے رہیں۔ اور جب تک اس قسم کے نزاعات سے قانون وانتظام میں خلل اندازی کا کوئی خطرہ پیدا نہ ہوتا وہ ان کو غنیمت سمجھتے اگر لوگ محض اس جھگڑے میں مصروف رہتے کہ دوسروں کو جنت میں جانے کا حق ہے یا وہ ابدی جہنم کی آگ میں جلنے کے مستحق ہیں اور وہ نہ ایک دوسرے کا سر پھوڑتے نہ اپنے لیے دنیاوی فوائد کا مطالبہ کرتے تو انگریز ان نزاعات کو کامل بے پروائی بلکہ شاید اطمینان سے دیکھتا رہتا لیکن جونہی یہ نزاعات ایک دوسرے کا سر پھوڑنے میں منتج ہوتے وہ فسادیوں کی سرکوبی میں نہایت شدید اور بیدرد بن جاتا۔ مرزا صاحب انگریزی راج کی اس

302

برکت کی بے حد قدر کرتے تھے جو نہ صرف ان نزاعات کی اجازت دیتا تھا بلکہ ان کی ہمت افزائی کرتا تھا اور غیر احمدیوں کو تحریک احمدیہ کے بانی اور اس کے لیڈروں کے خلاف جو بڑی بڑی شکایات تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ انگریزوں کے ذلیل خوشامدی ہیں۔

’’جہاد‘‘ کے متعلق مرزا صاحب کی تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب ان واقعات کے پیش نظر لکھی تھی جو سرحد پر رونما ہو رہے تھے اور جن میں متعدد انگریز افسر قتل کر دیئے گئے تھے ہر انگریز افسر کو جو ہندوستان میں آتا تھا ہدایت کی جاتی تھی کہ ’غازی‘‘ کی طرف سے ہوشیار رہے یعنی اس مذہبی دیوانے افغان یا قبائلی سے جو کسی کافر کو قتل کرنا کار ثواب سمجھتا تھا۔ یہ فعل اس کے لیے مالی نفع کا موجب بھی ہوتا تھا اور خدا کے ہاں بھی اس کا اجر مسلم تھا۔ اگر اس قسم کے حملے مذہبی تعصب کا نتیجہ تھے تو ان کا ارتکاب یقیناً اسلام کے عقیدہ جہاد کے منافی تھا اور مرزا صاحب نے اس عقیدے کی تردید کی وہ مستحسن تھی لیکن جب انھوں نے عقیدہ جہاد کی تاویل میں ’’مہربانی انگریزی حکومت‘‘ اور اس کی مذہبی رواداری کی تعریف نہایت خوشامدانہ لہجے میں کرنی شروع کی تو اس تاویل پر چند در چند شبہات پیدا ہونے لگے۔ پھر جب مرزا صاحب نے ممالک اسلامی کی عدم رواداری اور انگریزوں کو فراخ دلانہ مذہبی پالیسی کا مقابلہ وموازنہ توہین آمیز انداز میں کیا تو مسلمانوں کا غیظ وغضب اور بھی زیادہ مشتعل ہو گیا۔ احمدی جانتے تھے کہ ان کے عقائد دوسرے مسلم ممالک میں اشاعت ارتداد پر محمول کیے جائیں گے اور ان کا یہ خیال اس وقت اور بھی پختہ ہو گیا ہو گا جب افغانستان میں عبداللطیف (احمدی) کو سنگسار کیا گیا۔ جب پہلی جنگ عظیم میں (جس میں ترکوں کو شکست ہو گئی تھی) بغداد پر ۱۹۱۸ء میں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور قادیان میں اس ’’فتح‘‘ پر جشن مسرت منایا گیا تو مسلمانوں میں شدید برہمی پیدا ہوئی اور احمدی انگریزوں کے پٹھو سمجھے جانے لگے۔

جب تقسیم ملک سے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا دھندلا سا امکان افق پر نظر آنے لگا تو احمدی آنے والے واقعات کے متعلق متفکر ہونے لگے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء کے آغاز تک ان کی بعض تحریروں سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ انہیں پہلے انگریزوں کا جانشین بننے کی توقع تھی لیکن جب پاکستان کا دھندلا سا خواب مستقبل کی ایک حقیقت کا روپ اختیار کرنے لگا تو ان کو یہ امر کسی قدر دشوار

معلوم ہوا کہ ایک نئی مملکت کے تصور کو مستقل طور پر گوارا کر لیں انہوں نے اس وقت اپنے آپ کو عجیب گومگو کی حالت میں پایا ہوگا کیونکہ نہ تو وہ بھارت کی غیر مذہبی ہندو مملکت کو اپنے لیے چن سکتے تھے نہ پاکستان کو پسند کر سکتے تھے جس میں فرقہ بازی کے روا رکھے جانے کی کوئی توقع نہ تھی۔ ان کی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تقسیم کے مخالف تھے کہتے کہ اگر ملک تقسیم بھی ہو گیا تو وہ اسے دوبارہ متحد کرنے کی کوشش کریں گے اس کی وجہ واضح طور پر یہ تھی کہ احمدیت کے مرکز قادیان کا مستقبل بالکل غیر یقینی نظر آ رہا تھا جس کے متعلق مرزا صاحب بہت سی پیشگوئیاں کر چکے تھے۔

مشروط تقسیم کے ماتحت قادیان پاکستان میں شامل کیا گیا تھا لیکن ضلع گورداسپور میں (جہاں قادیان واقع ہے) مسلمان صرف ایک فیصد کی اکثریت میں تھے اور اس ضلع کی مسلمان آبادی زیادہ تر تین شہروں میں جمع تھی جن میں ایک قادیان تھا۔ لہٰذا قادیان کے آخری شمول کے متعلق اندیشے محسوس کیے جانے لگے اور چونکہ احمدی اس کو ہندوستان میں شامل کرنے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا کہ اس کو پاکستان میں شامل کرانے کے لیے جدوجہد کریں۔ احمدیوں کے خلاف معاندانہ اور بے بنیاد الزامات لگائے گئے ہیں کہ باؤنڈری کمیشن کے فیصلے میں ضلع گورداسپور اس لیے ہندوستان میں شامل کر دیا گیا کہ احمدیوں نے ایک خاص رویہ اختیار کیا اور چودھری ظفر اللہ خان نے جنھیں قائداعظم نے اس کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس پیش کرنے پر مامور کیا تھا خاص قسم کے دلائل پیش کیے لیکن عدالت ہذا کا صدر جو اس کمیشن کا ممبر تھا اس بہادرانہ جدوجہد پر تشکر امتنان کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے جو چودھری ظفر اللہ خان نے گورداسپور کے معاملے میں کی تھی۔ یہ حقیقت باؤنڈری کمیشن کے حکام کاغذات میں ظاہر و باہر ہے اور جس شخص کو اس مسئلے سے دلچسپی ہو وہ شوق سے اس ریکارڈ کا معائنہ کر سکتا ہے چودھری ظفر اللہ خان نے مسلمانوں کے لیے نہایت بے غرضانہ خدمات انجام دیں۔ ان کے باوجود بعض جماعتوں نے عدالتی تحقیقات میں ان کا ذکر جس انداز میں کیا ہے وہ شرمناک ناشکرے پن کا ثبوت ہے۔

احمدیوں کے خلاف دوسری شکایت جو ہمارے سامنے تفصیل سے پیش کی گئی ہے یہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے دوسرے انبیا کے مقابلے میں جن میں ہمارے رسول پاک صلعم بھی شامل ہیں اپنا

304

معلوم ہوا کہ ایک نئی مملکت کے تصور کو مستقل طور پر گوارا کر لیں انہوں نے اس وقت اپنے آپ کو عجیب گومگو کی حالت میں پایا ہو گا کیونکہ نہ تو وہ بھارت کی غیر مذہبی ہندو مملکت کو اپنے لیے چن سکتے تھے نہ پاکستان کو پسند کر سکتے تھے جس میں فرقہ بازی کے روا رکھے جانے کی کوئی توقع نہ تھی۔ ان کی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تقسیم کے مخالف تھے کہتے کہ اگر ملک تقسیم بھی ہو گیا تو وہ اسے دوبارہ متحد کرنے کی کوشش کریں گے اس کی وجہ واضح طور پر یہ تھی کہ احمدیت کے مرکز قادیان کا مستقبل بالکل غیر یقینی نظر آ رہا تھا جس کے متعلق مرزا صاحب بہت سی پیشگوئیاں کر چکے تھے۔

مشروط تقسیم کے ماتحت قادیان پاکستان میں شامل کیا گیا تھا لیکن ضلع گورداسپور میں (جہاں قادیان واقع ہے) مسلمان صرف ایک فیصد کی اکثریت میں تھے اور اس ضلع کی مسلمان آبادی زیادہ تر تین شہروں میں جمع تھی جن میں ایک قادیان تھا۔ لہٰذا قادیان کے آخری شمول کے متعلق اندیشے محسوس کیے جانے لگے اور چونکہ احمدی اس کو ہندوستان میں شامل کرنے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا کہ اس کو پاکستان میں شامل کرانے کے لیے جدوجہد کریں۔ احمدیوں کے خلاف معاندانہ اور بے بنیاد الزامات لگائے گئے ہیں کہ باؤنڈری کمیشن کے فیصلے میں ضلع گورداسپور اس لیے ہندوستان میں شامل کر دیا گیا کہ احمدیوں نے ایک خاص رویہ اختیار کیا اور چودھری ظفر اللہ خان نے جنھیں قائداعظم نے اس کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس پیش کرنے پر مامور کیا تھا خاص قسم کے دلائل پیش کیے لیکن عدالت ہذا کا صدر جو اس کمیشن کا ممبر تھا اس بہادرانہ جدوجہد پر تشکر امتنان کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے جو چودھری ظفر اللہ خان نے گورداسپور کے معاملے میں کی تھی۔ یہ حقیقت باؤنڈری کمیشن کے حکام کا غذات میں ظاہر و باہر ہے اور جس شخص کو اس مسئلے سے دلچسپی ہو وہ شوق سے اس ریکارڈ کا معائنہ کر سکتا ہے چودھری ظفر اللہ خان نے مسلمانوں کے لیے نہایت بے غرضانہ خدمات انجام دیں۔ ان کے باوجود بعض جماعتوں نے عدالتی تحقیقات میں ان کا ذکر جس انداز میں کیا ہے وہ شرمناک ناشکرے پن کا ثبوت ہے۔

احمدیوں کے خلاف دوسری شکایت جو ہمارے سامنے تفصیل سے پیش کی گئی ہے یہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے دوسرے انبیا کے مقابلے میں جن میں ہمارے رسول پاک صلعم بھی شامل ہیں اپنا

304

ذکر مبالغہ آمیز انداز سے کیا ہے اور احمدی اپنے بعض اشخاص کے متعلق امیر المومنین ام المومنین سیدۃ النسا، رضی اللہ عنہ، صحابہ کرام جیسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جو نبی کریم کے اہل بیت یا ان کے حلقہ احباب سے مخصوص طور منسوب ہونے کی وجہ سے خاص تقدس واحترام کی سرمایہ دار بن چکی ہیں ۔ مسٹر عبدالرحمان خادم نے جنھوں نے کتب قدیمہ کی تلاش وتجسس میں بڑی محنت کی ہے اس کا جواب یہ دیا کہ ان القاب میں سے اکثر بعض اولیا کے خاندانوں میں بھی استعمال کیے جا چکے ہیں جن میں احراری لیڈر صاحبزادہ فیض الحسن کا خاندان بھی شامل ہے اور دوسرے فرقوں کے لیڈروں اور پیروں کے لیے بھی یہ القاب استعمال کیے گئے ہیں۔ جن میں ایک اور احراری لیڈر چودھری افضل حق بھی ہیں ۔ یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں کہ آیا القاب کا استعمال جائز تھا یا ناجائز لیکن اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے جذبات ان القاب کے استعمال سے ضرور متاثر ہوتے ہیں جو خاص اور محدود شخصیتوں کے لیے استعمال ہونے کی وجہ سے مقدس قرار پا چکے ہیں اور ان کے تاریخ اسلام کی بعض بلند شخصیتوں کی یاد وابستہ ہے۔ احمدی لٹریچر میں رسول پاک کے خاندان کی بعض خواتین کے متعلق جو حوالے پائے جاتے ہیں ان کے متعلق بھی ہمارا یہی خیال ہے گو اس شکایت کی ایک نظیر ’’قلائد الجواہر‘‘ میں بھی پائی جاتی ہے اور وہ شاید زیادہ متبذل ہے اس میں شک نہیں کہ رسول پاک صلعم اور کسی دوسرے زندہ یا مردہ شخص کے درمیان مقابلہ وموازنہ ہر مومن کے لیے دل آزاری کا موجب ہے۔ احمدی افسروں اور عہدہ داروں کے متعلق صدر مقام کو اس اطلاع کا موصول ہونا بھی ثابت ہو چکا ہے کہ انہوں نے بعض لوگوں کو احمدی فرقے میں داخل کیا لیکن مرکزی حکومت کے سرکاری اعلان مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۵۲ء کے امام جماعت احمدیہ نے ایک ہدایت نامہ جاری کرکے ان تبلیغی سرگرمیوں کو روک دیا تھا۔

یہاں اس مضمون کا ذکر ضروری ہے جو ’’الفضل‘‘ مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۵۲ء میں ’’خونی ملا کے آخری دن‘‘ کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس کی طرف جماعت اسلامی مجلس عمل اور مجلس احرار نے خاص طور پر توجہ دلائی ہے اور اس کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ احمدی لٹریچر اشتعال انگیز ہے اس مضمون سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ پروردگار عالم پاکستان کی نئی مملکت کو اس غرض سے وجود

میں لایا ہے کہ مُلا کو ختم کر دے اس تحریر میں مُلا کو نہایت سخت الفاظ میں برا بھلا کہا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ زمانہ ماضی کی بہت سی مسلمان مملکتوں کے زوال کی ذمہ داری مُلا پر عائد ہوتی ہے اس مضمون میں تین احمدیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو افغانستان میں مار ڈالے گئے تھے یعنی امیر عبدالرحمٰن خان کے زمانے میں ایک شخص عبدالرحمٰن خان ۔امیر حبیب اللہ خان کے عہد حکومت میں صاحبزادہ عبداللطیف (جو سنگسار کیا گیا تھا) اور امیر امان اللہ خان کے عہد میں نعمت اللہ اور اس کے ساتھ ہی بتایا گیا ہے کہ ان تینوں امیروں کا کیا حشر ہوا اور بیان کیا گیا ہے کہ مُلا زدہ افغانستان کے مقابلے میں مملکت پاکستان وجود میں آئی ہے جو زیادہ روادار ہے۔

قائداعظم کی اس پالیسی کا حوالہ دے کر کہ تمام مسلمانوں کو مل کر متحدہ محاذ پیش کرنا چاہیے۔ کہا گیا ہے کہ اس سے عطا اللہ شاہ بخاری ،مُلا بدایونی ، ملا احتشام الحق ،مُلا مودودی اور مُلا محمد شفیع جیسے ملاؤں کا انجام ظاہر ہے۔ یہ مضمون قطعی طور پر اشتعال انگیز ہے اس میں مولانا احتشام الحق اور مولانا محمد شفیع جیسے علما کا ذکر تحقیر آمیز پیرائے میں کیا گیا ہے۔ جو دستور ساز اسمبلی کے ملحقہ تعلیمات اسلامی بورڈ کے ممبر ہیں۔اور اسی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تضحیک کی گئی ہے جن کا دینیات میں تبحر سب کے نزدیک مسلم ہے۔اس مضمون سے نہ صرف ان علما کی جو اس میں مذکور ہیں بلکہ یقیناً علما کے پورے گروہ کی دل آزاری ہوئی ہوگی۔لیکن اس مضمون کے متعلق ایک بات قابل ذکر ہے کہ یہ اس وقت لکھا گیا ہے جب آل مسلم پارٹیز کنونشن (کراچی) اور آل مسلم پارٹیز کنونشن (لاہور) اپنی مجلس عمل مرتب کر چکی تھیں۔ان میں پانچ مذکورہ بالا علما شامل تھے اور احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دلانے کی مہم کا آغاز کر دیا گیا تھا۔لہٰذا یہ مضمون جذبہء انتقام کے ماتحت لکھا گیا تھا۔بہر کیف اس سے ظاہر ہے کہ کس طرح ایک جماعت کے حملے کا جواب دوسری جماعت کی طرف سے دیا جا رہا تھا اور صورت حال بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

احمدی ایک متحدہ منظّم جماعت ہیں ۔ان کا صدر مقام ایک خالص احمدی قصبے میں واقع ہے۔ جہاں ایک مرکزی تنظیم قائم ہے جس کے مختلف شعبے ہیں مثلاً شعبہ امور خارجہ،شعبہ امور داخلہ، شعبہ امور عامہ اور شعبہ نشر و اشاعت یعنی وہ شعبے جو ایک باقاعدہ سیکرٹریٹ کی تنظیم میں ہوتے ہیں وہ

سب یہاں موجود ہیں۔ ان کے پاس رضا کاروں کا ایک جیش بھی جس کو ''خدام دین'' کہتے ہیں ''فرقان بٹالین'' اسی جیش سے مرکب ہے اور یہ خالص احمدی بٹالین ہے جو کشمیر میں خدمت انجام دے چکی ہے۔ احمدی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ یا ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور اپنی لڑکیاں انکو نکاح میں نہیں دیتے۔ یہ تمام حقائق شہادت سے ثابت ہو چکے ہیں۔ اورانہی کی بنا پر غیر احمدی جماعتیں اپنے اس مطالبہ کو حق بجانب قرار دیتی ہیں کہ احمدیوں کو ایک علیحدہ قوم قرار دیا جائے۔ احمدی اس تنظیمی بندوبست کو اس بنا پر جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر جماعت کو جس کے سامنے ایک قطعی مقصد حکمت عملی اور لائحہ عمل موجود ہو، اس کا حق حاصل ہے کہ اپنے معاملات کو اپنے طریقے پر منظم کرے تاکہ بہترین نتائج پیدا ہوں۔ اس الزام کے جواب میں کہ وہ اپنی لڑکیاں غیر احمدیوں کو نہیں دیتے۔ احمدیوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ غیر احمدی کے ساتھ احمدی لڑکی کا نکاح ہمارے نزدیک کالعدم یا ناجائز نہیں ہے۔ لیکن لڑکی کے مفاد کے پیش نظر اس کے والدین کو یہی مشورہ دیا جاتا ہے کہ اس کے لیے اپنی جماعت ہی میں شوہر تلاش کریں۔ اس سلسلے میں دوسرے فرقوں اور جماعتوں کی مثالیں دی گئی ہیں جو اسی طریق پر عمل کرتی ہیں۔

307

مسلمانوں کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کے الزام کا جواب بھی یہی دیا جاتا ہے کہ دوسرے فرقے بھی اس امتیاز پر عامل ہیں یہ مثال نمایاں طور سے پیش کی گئی ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان قائد اعظم کے جنازہ میں شامل نہ ہوئے۔ لیکن چودھری ظفر اللہ خان کا جواب یہ ہے کہ نماز جنازہ کے امام مولانا شبیر احمد عثمانی احمدیوں کو کافر، مرتد اور واجب القتل قرار دے چکے تھے۔ اس لیے میں اس جنازہ میں شریک ہونے کا فیصلہ نہ کر سکا۔ جس کی امامت مولانا کر رہے تھے۔ نماز جنازہ کے متعلق احمدیوں نے ہمارے سامنے بالآخر یہ موقف اختیار کیا کہ مرزا غلام احمد کا ایک فتویٰ حال ہی میں دستیاب ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے احمدیوں کو اجازت دی ہے کہ وہ ان مسلمانوں کی نماز جنازہ میں شریک ہو سکتے ہیں جو مرزا صاحب کے مکذب اور مکفر نہ ہوں۔ لیکن اس کے بعد بھی معاملہ وہیں کا وہیں رہتا ہے کیونکہ اس فتویٰ کا ضروری مفہوم یہی ہے کہ اس مرحوم کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی جو مرزا صاحب کو نہ مانتا ہو لہٰذا اس اعتبار سے یہ فتویٰ موجودہ طرز عمل ہی کی تائید و تصدیق کرتا ہے۔

اس مسئلے پر کہ آیا احمدی دوسرے مسلمانوں کو ایسا کافر سمجھتے ہیں جو دائرہ اسلام سے خارج ہے۔احمدیوں نے ہمارے سامنے یہ موقف ظاہر کیا ہے کہ ایسے لوگ کافر نہیں ہیں اور لفظ ''کفر'' جو احمدی لٹریچر میں ایسے اشخاص کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔اس سے کفر خفی یا انکار مقصود ہے یہ ہرگز کبھی مقصود نہیں ہوا کہ ایسے اشخاص دائرہ اسلام سے خارج ہیں لیکن ہم نے اس موضوع پر احمدیوں کے بے شمار سابقہ اعلانات دیکھے ہیں اور ہمارے نزدیک ان کی کوئی تعبیر اس کے سوا ممکن نہیں کہ مرزا غلام احمد کے نہ ماننے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔اب یہ کہا جارہا ہے کہ مسلمان جو رسول پاک صلعم کے بعد کسی مامور من اللہ کے دعوے کو قبول نہیں کرتے چونکہ وہ اللہ اور رسول کے منکر نہیں ہیں لہٰذا ''امت'' میں شامل ہیں یہ قول کسی اعتبار سے بھی اس سابقہ اعلان سے غیر مطابق نہیں کہ دوسرے مسلمان کافر ہیں دراصل ان الفاظ سے اس سابقہ عقیدے کی بالواسطہ تصدیق ہوتی ہے کہ ایسے اشخاص صرف ان معنوں میں مسلمان ہیں کہ وہ رسول کی امت سے تعلق رکھتے ہیں اور اس حیثیت سے مسلم معاشرے کے ممبر کہلانے کے حقدار ہیں۔یہ موقف اس قول سے بالکل مختلف ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور کافر نہیں ہیں۔

308

آخری شکایت احمدیوں کے خلاف یہ ہے کہ وہ احمدیہ عقائد کی تبلیغ کے لیے جارحانہ پر پیگنڈا کرتے ہیں۔اس شکایت کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان نے ۱۸ مئی ۱۹۵۲ء کو جہانگیر پارک کراچی میں تقریر کی۔احمدی افسر عام جلسوں کی کھلم کھلا صدارت کرتے اور تحریک کی حمایت میں تقریر کرتے ہیں اور جن لوگوں کا ان سے سرکاری طور پر سابقہ پڑتا ہے ان کو احمدی بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اس امر پر شدید اعتراض کیا گیا ہے کہ سرکاری افسر اور اہلکار مقامی انجمنوں کے عہدہ دار بن جاتے ہیں۔اس سلسلے میں مرزا بشیر الدین محمود احمد کی کوئٹہ والی تقریر پیش کی گئی ہے جو ''الفضل'' مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی تھی اور جس میں انہوں نے اپنی جماعت سے اپیل کی تھی کہ بلوچستان میں اپنے پروپیگنڈا کو تیز کردیں تا کہ یہ صوبہ آئندہ سرگرمیوں کا مرکز بن جائے۔اس کے علاوہ ان کا وہ خطبہ پیش کیا گیا جو ۱۹۵۱ء کے کرسمس میں انہوں نے صدر انجمن احمدیہ ربوہ کے سالانہ اجلاس میں دیا تھا اور جو ''الفضل'' مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع کیا گیا تھا۔اس

مطالبات کی پشت پر نظریہ

مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائدی اختلافات اور احمدیوں کی سرگرمیوں کے متعلق اس بیان کی ترتیب کے بعد ہم ان وجوہ کے سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ جن کی بنا پر تین مطالبات پیش کیے گئے۔ ہم اس سے پیشتر لکھ چکے ہیں کہ قریب قریب تمام علماء اس امر پر متفق ہیں کہ تین مطالبات میں سے ہر مطالبہ اسلام کے اس تصور پر مبنی ہے جو ان کے نزدیک صحیح ہے۔ مولانا داؤد غزنوی، ماسٹر تاج الدین انصاری، سید مظفر علی شمسی اور بعض دوسرے اشخاص نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ یہ مطالبات اس قرارداد مقاصد کا قدرتی نتیجہ تھے جو ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں طویل اور پرجوش بحث کے بعد منظور ہوئی تھی۔ تحقیقات کے دوران میں شروع سے آخر تک ہر شخص کے نزدیک یہ بات مسلم تھی کہ یہ مطالبات اسی نظریے کی پیداوار ہیں جس کے بل پر پاکستان میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کا دعویٰ اور بعض حلقوں کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا۔ مطالبات کی معقولیت یا عدم معقولیت کا اندازہ کرنے کے لیے اس نکتے کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی مملکت میں (یا اسلام میں کیونکہ دونوں ایک ہی چیز ہیں) مسلم رعایا اور غیر مسلم رعایا کے حقوق کے درمیان بنیادی فرق و امتیاز ہے اور ایک فرق کا ذکر تو ابھی کیا جا سکتا ہے کہ غیر مسلموں کو نظم و نسق حکومت کے اونچے دائروں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا اگر احمدی مسلمان نہیں بلکہ کافر ہیں تو وہ مملکت کے کسی بڑے عہدے پر فائز نہیں ہو سکتے۔ اس لیے یہ لازم آتا ہے کہ دو مطالبوں کے مطابق چودھری ظفر اللہ خان اور دوسرے احمدیوں کو جو مملکت کے کلیدی عہدوں پر قابض ہیں موقوف کر دیا جائے اور تیسرے مطالبہ میں احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ آئندہ کسی احمدی کو مملکت میں کوئی ایسا مقام حاصل نہ ہو سکے چونکہ یہ مسئلہ جس کو مطالبات نے بلا واسطہ پیدا کیا ہے، بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور پاکستان کے مستقبل کے لیے انتہائی درجے کا اہم ہے اس لیے ہم نے علما کی امداد سے ''مملکت اسلامی'' کے تصور اور اس کے متعلقات پر گہری نظر ڈالی ہے۔ اور اب ہم اسی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

مملکت اسلامی

ہمارے سامنے یہ بار بار کہا گیا ہے کہ پاکستان کے مطالبے میں ''مملکت اسلامی'' کا مطالبہ قطعاً شامل تھا۔ پاکستان کے لیے جدوجہد کرنیوالے اہم لیڈروں کی بعض تقریروں سے بلاشبہ یہی مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ لیڈر جب مملکت اسلامی کا یا کسی ایسی مملکت کا نام لیتے تھے جس پر قوانین اسلامی کی حکومت ہوگی تو شاید ان کے ذہن میں کسی ایسے قانونی نظام کا تصور ہوگا جو اسلامی عقائد، اسلامی قانون شخصی، اسلامی اخلاقیات اور اسلامی ادارت پر مبنی ہو یا ان سے مخلوط ہو۔ جس شخص نے بھی پاکستان میں ایک مذہبی مملکت کے قیام پر سنجیدگی سے غور کیا ہے اسے ان عظیم مشکلات کا ضرور احساس ہوا ہے جو کسی ایسی سکیم میں لازماً پیش آئیں گی یہاں تک کہ ڈاکٹر محمد اقبال نے بھی جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت کا تصور قائم کرنے والے اولین مفکر سمجھے جاتے ہیں۔ اپنے خطبہ صدارت (مسلم لیگ ۱۹۳۰ء) میں فرمایا۔

''ہندوؤں کو کسی قسم کا اندیشہ نہ ہونا چاہیے کہ خود اختیار مسلم مملکتوں کی تخلیق کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسی مملکتوں میں کوئی مذہبی قسم کی حکومت قائم ہوگی یہ اصول کہ ہر گروہ کو اپنے خطوط پر آزادانہ ترقی کرنے کا حق ہونا چاہیے ہرگز کسی تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کی پیداوار نہیں ہوسکتا''۔

جب ہم ذمہ داری کے مسئلے پر توجہ کرینگے تو ہم یہ ضرور بتائیں گے کہ جو جماعتیں آج تینوں مطالبات کو مذہبی وجوہ کی بنا پر نافذ کرنے کے لیے تقاضا کر رہی ہیں۔ ان میں سے اکثر خود اسلامی مملکت کے تصور کی مخالف ہیں۔ حتیٰ کہ جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا خیال بھی یہی ہے کہ اگر کبھی نئی مسلم مملکت وجود میں آ گئی تو اس میں حکومت کی ہیت صرف (غیر مذہبی) ہی ہو سکتی ہے تقسیم سے پہلے قائداعظم نے پاکستان کی جو پہلی تصویر دنیا کے سامنے پیش کی وہ اس انٹرویو میں ظاہر ہوئی تھی جو انہوں نے رائٹر کے نامہ نگار مسٹر ڈون کیمبل کو دیا تھا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ نئی مملکت ایک عصری جمہوری مملکت (ماڈرن ڈیموکریٹک سٹیٹ) ہوگی جس میں حاکمیت کے حامل

جمہور ہوں گے اور اس نئی قوم کے تمام افراد کے حقوق شہریت بلا امتیاز مذہب ونسل وعقیدہ مساوی ہوں گے۔ جب پاکستان رسمی طور سے نقشہ عالم پر نمودار ہو گیا تو قائد اعظم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں ایک یادگار تقریر کی جس میں نئی مملکت کے بیانی اصولوں کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا۔

''اس کے باوجود اس تقسیم میں ان اقلیتوں کے مسئلے سے دامن بچانا ناممکن ہے جو ایک ڈومینن یا دوسری میں رہ جائیں گی۔ یہ بات بالکل ناگزیر تھی اس کے سوا کوئی دوسرا حل نہیں اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کہ ہم باشندوں کی خصوصاً عوام اور غربا کی فلاح و بہبود پر اپنی تمام کوششیں مرتکز کر دیں۔ اگر تم باہم تعاون سے کامیاب کرو گے ماضی کو بھول جاؤ گے اور مخالفتوں کو ترک کر دو گے تو تم لازماً کامیاب ہو جاؤ گے۔ اگر تم اپنے ماضی کو بدل دو گے۔ اور اس سپرٹ میں متحد ہو کر کام کرو گے کہ تم میں سے ہر ایک خواہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو خواہ ماضی میں اس کے تعلقات تمہارے ساتھ کیسے ہی رہے ہوں خواہ اس کا رنگ اس کی ذات اور اس کا عقیدہ کچھ بھی ہو اول، دوم اور آخر اس مملکت کا شہری ہے جس کے حقوق و فرائض بالکل مساوی ہیں تو تمہارے عروج وترقی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔

میں اس معاملے پر انتہائی زور دینا چاہتا ہوں ہمیں اس سپرٹ میں کام شروع کر دینا چاہیے کچھ مدت میں اکثریت اور اقلیت اور ہندو قوم اور مسلم قوم کی یہ تمام بدنمائیاں غائب ہو جائیں گی کیونکہ آخر مسلمان ہونے کی حیثیت میں بھی تمہارے ہاں پٹھان، پنجابی، شیعہ، سنی وغیرہ موجود ہیں اور ہندوؤں میں بھی برہمن، ویشنو، کھتری اور بنگالی، مدارسی وغیرہ ہیں۔ اگر مجھ سے پوچھو تو میں یہ کہوں گا کہ یہ چیز ہندوستان کی آزادی وخود مختاری کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم مدتوں پہلے آزاد ہو چکے ہوتے۔ دنیا کی کوئی طاقت کسی قوم کو خصوصاً چالیس کروڑ نفوس کی قوم کو اپنا محکوم نہیں رکھ سکتی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کوئی تم کو مفتوح نہ کر سکتا اور اگر کر بھی لیتا تو زیادہ مدت تک تم پر اپنا تسلط قائم نہ رکھ سکتا (چیرز) لہٰذا اس سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے تم آزاد ہو اس

مملکت پاکستان میں تم اپنے مندروں میں آزادانہ جا سکتے ہو اور مساجد اور دوسری عبادت گاہوں میں بھی جانے میں بھی آزاد ہو۔ تمہارا مذہب، تمہاری ذات تمہارا عقیدہ کچھ بھی ہو کاروبار مملکت کا اس سے کوئی تعلق نہیں (ہیئر ہیئر) تم جانتے ہو تاریخ شاہد ہے کہ کچھ مدت پیشتر انگلستان کے حالات آج کل کے ہندوستان کے حالات سے بدتر تھے، رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کو آزار پہنچانے میں مصروف تھے۔ آج بھی بعض ایسی مملکتیں موجود ہیں جن میں ایک خاص طبقے کے خلاف امتیازات اور قیود عائد کی جارہی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ایسے ایام میں اپنی مملکت کا آغاز نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارا آغاز ایسے ایام میں ہو رہا ہے جب ایک قوم اور دوسری قوم ایک ذات اور مسلک اور دوسری ذات اور مسلک کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں رہا۔ ہم اس بنیادی اصول کی بنا پر آغاز کار کر رہے ہیں کہ ہم تم شہری ہیں اور ایک مملکت کے مساوی شہری ہیں (پرزور اظہار مسرت) انگلستان کے لوگوں کو بھی ایک زمانے میں صورتحال کا حقائق کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ان ذمہ داریوں اور گرانباریوں سے بھگتنا پڑا تھا جو ان کی حکومت نے ان پر عائد کی تھیں اور وہ اس آگ میں قدم بقدم گزر چکے ہیں آج تم بجا طور سے کہہ سکتے ہو کہ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا کوئی وجود باقی نہیں۔

آج صرف یہ حقیقت موجود ہے کہ ہر شخص برطانیہ عظمیٰ کا شہری ہے ہر شہری کی حیثیت مساوی ہے اور تمام شہری ایک قوم کے افراد ہیں۔

میرے نزدیک اب ہمیں اسی نصب العین کو پیش نظر رکھنا چاہیے پھر تم دیکھو گے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد نہ ہندو ہندو رہیں گے نہ مسلمان مسلمان رہیں گے مذہبی معنوں میں نہیں کیونکہ وہ تو ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی معنوں میں سب ایک مملکت کے شہری ہوں گے۔

قائداعظم پاکستان کے بانی تھے اور جس موقع پر انہوں یہ تقریر کی تھی وہ تاریخ پاکستان کا پہلا سنگ میل تھا۔ اس تقریر کے مخاطب اپنی مملکت کے مسلم و غیر مسلم باشندے بھی تھے اور اہل عالم بھی

اوراس کا مقصد یہ تھا کہ جس نصب العین کے حصول کی خاطر نئی مملکت اپنی تمام طاقتوں کو وقف کرنے والی تھی اسی کو حتی الامکان نہایت واضح طور پر معین کر دیا جائے۔اس تقریر میں بار بار ماضی کی تلخیوں کا ذکر کر کے یہ اپیل کی گئی ہے کہ ماضی کو بدل دو اور جنگ و پیکار کو دفن کر دو۔قائداعظم کے نزدیک اس مملکت کے آئندہ شہری کو بلا امتیاز رنگ و نسل اور بلا لحاظ مذہب و ملت برابر کے حقوق و رعایات حاصل ہوں گے اور اس پر برابر کے فرائض عائد ہونگے۔اس تقریر میں لفظ ''قوم'' کو بار بار دہرایا گیا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ مذہب کو کاروبار مملکت سے کوئی تعلق نہیں اور صرف فرد کے ذاتی ایقان و ایمان کا معاملہ ہے۔

ہم نے علما سے سوال کیا کہ آیا مملکت کا یہ تصور ان کے نزدیک قابل قبول ہے ان میں سے ہر ایک نے بلا تامل اس کا جواب نفی میں دیا اور ان میں احراری اور وہ سابق کانگرسی بھی شامل تھے جو تقسیم سے پہلے اس تصور کو قریب قریب جزو ایمان سمجھتے تھے۔اگر مولانا امین احسن اصلاحی کی شہادت جماعت اسلامی کے نقطہ نگاہ کی صحیح مظہر ہے تو جو مملکت اس نصب العین پر مبنی ہو وہ ''ابلیس'' کی مخلوق ہے ان کے اس خیال کی تصدیق جماعت کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی بے شمار تحریروں سے بھی ہوتی ہے،علما میں سے کوئی بھی ایسی مملکت کو برداشت نہیں کر سکتا جس کی بنیاد قومیت پرستی اور اس کے متعلقات پر ہو۔ان کے نزدیک مملکت کی فعالیت کو متعین کرنے کی اہلیت صرف ''ملت'' اور اس کے متعلقات میں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قائداعظم نے ایک عصری قومی مملکت کا جو تصور پیش کیا تھا وہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرارداد مقاصد منظور ہو جانے کے بعد متروک ہو گیا لیکن یہ بھی کھلم کھلا تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ قرارداد اگرچہ الفاظ و فقروں کے اعتبار سے بہت بلند بانگ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں محض دھوکا ہے اور اس میں نہ صرف مملکت اسلامی کا ہیولیٰ تک شامل نہیں بلکہ اس کی دفعات خصوصاً جو بنیادی حقوق سے متعلق ہیں واضح طور پر مملکت اسلامی کے اصولوں کے منافی ہیں۔

314

مملکت اسلامی کی بنیاد

اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ ''مملکت اسلامی'' کیا چیز ہے جس کے متعلق باتیں تو سب کرتے ہیں اور سوچتا کوئی بھی نہیں پیشتر اس کے کہ ہم اس سوال کا جواب دریافت کرنے کی کوشش کریں ہمیں خود مملکت کے دائرہ و وظائف کا ایک واضح تصور قائم کرنا چاہیے۔

جب علما سے یہ کہا گیا کہ تاریخ اسلام میں سے کسی اسلامی مملکت کی نظیر پیش کریں تو ان کے خیالات و آراء میں باہم اختلاف تھا مثلاً اگرچہ حافظ کفایت حسین (شیعہ عالم) نے صرف اس نظام حکومت کو اپنا نصب العین قرار دیا جو رسول پاک صلعم کے زمانے میں قائم رکھا تھا لیکن مولانا داؤد غزنوی نے اپنے پیش کردہ نظائر میں جمہوریہ اسلامی کا زمانہ عمر بن عبدالعزیز کا عہد خلافت اور صلاح الدین ایوبی دمشقی، سلطان محمود غزنوی، محمد تغلق، اورنگزیب اور موجودہ حکومت عربیہ سعودیہ کی مثالیں بھی شامل کردیں تاہم اکثر علما نے جمہوریہ اسلامی کے نظام حکومت کو پیش کیا جس کی مدت ۶۳۲ء سے ۶۶۱ء تک یعنی تیس سال سے بھی کم تھی اور بعض نے عمر بن عبدالعزیز کے نہایت مختصر عہد کو بھی اس میں شامل کردیا۔ مولانا عبدالحامد بدایونی نے کہا کہ ایک مثالی مملکت کی تفصیلات علما خود بھی تجویز کریں گے۔ ماسٹر تاج الدین انصاری کے دماغ میں مملکت اسلامی کے متعلق جو ژولیدہ تصور تھا وہ ان کی شہادت کے مندرجہ ذیل حصے سے معلوم کیا جاسکتا ہے:۔

سوال۔ کیا آپ تحریک خلافت میں شامل تھے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ تحریک خلافت ہندوستان میں کب ختم ہوئی تھی؟

جواب۔ ۱۹۲۳ء میں جب ترکوں نے اپنے ملک کو سیکولر سٹیٹ (غیر مذہبی مملکت) قرار دیدیا

سوال۔ اگر آپ سے کہا جائے کہ جب ترکوں نے خلافت کو موقوف کردیا اس کے بعد

بھی تحریک خلافت طویل مدت تک قائم رہی تو کیا یہ صحیح ہوگا؟

جواب۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ترکوں کی طرف سے خلافت کے موقوف ہوتے ہی تحریک خلافت ختم ہوگئی تھی۔

سوال۔ آپ کے متعلق اطلاع یہ کہ آپ ۱۹۲۸ء تک تحریک خلافت کے ممبر رہے اور تقریریں بھی کرتے رہے کیا یہ صحیح ہے؟

جواب۔ یہ صحیح نہیں ہوسکتا۔

سوال۔ کیا کانگرس کو خلافت سے دلچسپی تھی؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ کیا خلافت آپ کے نزدیک دینی عقیدے پر مبنی تھی یا محض ایک سیاسی تحریک تھی؟

جواب۔ یہ ایک خالص دینی تحریک تھی۔

سوال۔ کیا مسٹر گاندھی تحریک خلافت کے حامی تھے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ تحریک خلافت کا مدعا کیا تھا؟

جواب۔ انگریز ترکی میں خلافت کے ادارے کو نقصان پہنچا رہا تھا اور مسلمان انگریز کے اس رویے سے رنجیدہ تھے۔

سوال۔ کیا اس تحریک کا مدعا یہ نہ تھا کہ مسلمانوں میں خلافت کا احیا کیا جائے؟

جواب۔ جی نہیں۔

سوال۔ کیا خلافت آپ کے نزدیک مسلم نظام حکومت کا ضروری جزو ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ لہٰذا کیا آپ پاکستان میں خلافت کے قیام کے حامی ہیں۔

جواب۔ جی ہاں۔

عیسائی ہو یا اسلامی، ہمیشہ اس امر کا مدعی رہا کہ حیات انسانی کا مقصد آئندہ زندگی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ لہٰذا عبادت الٰہی اور اعمال حسنہ ہی زندگی کے تنہا مقصد ہیں۔ فلاسفہ یونان جن کی ابتدا اسقراط سے ہوتی ہے مقصد زندگی اس امر کو سمجھتے تھے کہ فلسفیانہ غور وفکر میں مصروف رہیں تا کہ ان عظیم صداقتوں کا انکشاف کر سکیں جو فطرت میں پوشیدہ ہیں اور دوسرے لوگوں کا کام ہے کہ ان فلسفیوں کے خورد ونوش کا انتظام کریں جو اس کام میں مصروف ہیں۔ اسلام اس عقیدے پر زور دیتا ہے کہ انسان کو جو زندگی بخشی گئی ہے وہ صرف اس دنیا کی زندگی نہیں بلکہ ابدی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب موجودہ زندگی ختم ہو جاتی ہے اور اگلے جہان میں انسان کا درجہ اور مرتبہ اس کے ان عقائد واعمال پر منحصر ہے جن پر وہ اس دنیا میں عامل رہا ہے چونکہ موجودہ زندگی بجائے خود مقصود نہیں بلکہ حصول مقصود کا محض ایک ذریعہ ہے اس لیے نہ صرف فرد بلکہ مملکت کو بھی اس سیکولر نظریے کے خلاف رہنا چاہیے جو تمام سیاسی اور اقتصادی ادارات کو اس امر پر مبنی قرار دیتا ہے کہ آئندہ زندگی پر اس کے اثرات کی کچھ پروانہ کی جائے اور فرد اور مملکت کو ایسے انسانی کردار کے لیے کوشاں رہنا چاہیے جس سے آدمی کو آئندہ زندگی میں بہتر مقام حاصل ہو سکے۔

اس نظریے کے مطابق اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے لہٰذا یہ سوال فوراً پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کیا ہے اور مومن یا مسلم کس کو کہتے ہیں ہم نے علما سے یہ سوال کیا اور انہوں نے اس کے جو جوابات دیے ان کا ہم عنقریب تذکرہ کرینگے لیکن ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ ہمیں یہ دیکھ کر بے انتہا افسوس ہوا کہ علما جن کا پہلا فرض اس موضوع پر پختہ آرا کو قائم کرنا تھا مایوس کن حد تک باہم غیر متفق تھے۔ ان فاضل علماء نے اپنے خیالات کس اندازے سے ظاہر کیے اس کو چھوڑ دیجیے اور ہماری بات سنیے ہمارے نزدیک اسلام ایک ایسا نظام ہے جو (ہر منظم مذہب کی مانند) مندرجہ ذیل پانچ موضوعات پر حاوی ہے:۔

(۱) مسلمات یعنی بنیادی عقائد

(۲) عبادات یعنی وہ مذہبی رسوم وعوائد جو انسان کے بجالانے چاہئیں۔

(۳) اخلاقیات یعنی کردار اخلاقی کے ضوابط

(۴) ادارات۔ معاشرتی۔ اقتصادی اور سیاسی

(۵) خالص قانونی یعنی شریعت

ان تمام موضوعات کے متعلق قواعد وضوابط کی لازمی بنیاد الہام پر ہے نہ کہ عقل پر۔ گو یہ دونوں باہم مطابق بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ مطابقت اتفاقی ہو گی کیونکہ عقل انسانی ناقص ہو سکتی ہے اور عقل کا حقیقی قطعی تقاضا صرف اللہ کے علم میں ہے جو انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے اپنے برگزیدہ پیغمبروں کی وساطت سے عالم انسانی کو اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ اس لیے انسانوں کو چاہیے کہ عقائد کو تسلیم کریں۔ عبادات کی پابندی اختیار کریں۔ تعلیمات اخلاقی پر عمل کریں۔ قانون کی اطاعت کریں اور ان ادارات کو قائم کریں جو اللہ نے الہام فرمائے ہیں خواہ ان کی عقلی مصلحت ظاہر نہ ہو بلکہ خواہ وہ عقل انسانی کے خلاف ہی ہوں کیونکہ ذات باری تعالیٰ منزہ عن الخطا ہے۔ اس لیے الہام الٰہی کے ذریعے سے جو کچھ بھی معلوم ہو اس کو ایک قطعی صداقت کی حیثیت سے قبول کرنا ہو گا۔ خواہ اس کا موضوع روحانی اور ماورائے طبعی ہو یا تاریخ، قانون اور عبادات سے تعلق رکھتا ہے یا کسی ایسے موضوع سے ں ہو جس کو فکر انسانی تحقیق علمی سے وابستہ سمجھتا ہو۔ مثلاً انسان کی پیدائش ارتقا، علم کائنات یا علم ہیئت، عقل کا معیار قطعی معیار نہیں ہے اور اس حقیقت سے انکار گویا اللہ تعالیٰ کی عقل کل اور اس کے عزائم کا انکار ہے اور یہ کفر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً اپنے برگزیدہ بندوں کی معرفت جن میں ہمارے رسول پاکؐ آخری تھے اپنا الہام بھیجا ہے یہ الہام قرآن مجید میں موجود ہے اور مندرجہ بالا پانچ موضوعات پر حاوی ہے۔ لہٰذا اسلام کو ماننے والے شخص کا صحیح کام یہ ہے کہ وہ اس الہام الٰہی کو سمجھے۔ اس پر ایمان لائے اور اس پر عمل کرے۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغامات بھیجنے کے لیے واسطہ بناتا ہے وہ رسول یا نبی کہلاتے ہیں۔ چونکہ نبی کا ہر قول و فعل اللہ کے اشارے کے ماتحت ہوتا ہے اور ہمارے رسول پاکؐ کا ہر قول و فعل یقیناً اللہ کی طرف سے تھا لہٰذا وہ رسمی الہام ہی کی مانند خطا سے پاک ہوتا ہے کیونکہ انبیا معصوم ہیں۔ اور ایسے قول یا فعل کی اہلیت ہی نہیں رکھتے جو منشائے الٰہی کے خلاف ہو یہ افعال و

(۱) البخاری (وفات ۲۵۶ ہجری مطابق ۸۷۰ء)

(۲) مسلم (وفات ۲۶۱ ہجری مطابق ۸۷۵ء)

(۳) ابوداؤد (وفات ۲۷۵ ہجری مطابق ۸۸۸ء)

(۴) الترمذی (وفات ۲۷۹ ہجری مطابق ۹۱۵ء)

(۵) النسائی (وفات ۳۰۳ ہجری مطابق ۹۱۵ء)

(٦) ابن ماجہ (وفات ۲۷۳ ہجری مطابق ۸۸٦ء)

زمانہ حاضر کے قوانین شہادت کی رو سے (جن میں ہمارا قانون شہادت بھی شامل ہے) احادیث سنت کی قابل قبول شہادت نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک متعدد راویوں کے سلسلے سے ہم تک پہنچی ہے لیکن قانونی سند کے اعتبار سے قابل قبول ہیں۔ احادیث کے ان مجموعوں کی وقعت اس بات سے نہیں (جیسا کہ غلطی سے اکثر بیان کیا جاتا ہے) کہ ان کے مولف نے سب سے پہلے رائج حدیثوں کے متعلق صحیح یا موضوع ہونے کا فیصلہ کیا بلکہ ان کی اصلی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے تمام اقوال کو یکجا جمع کر دیا جو اس زمانے کے سلفی حلقوں میں صحیح سمجھے جاتے تھے۔

321

شیعہ حدیث کو اپنے نقطہ نگاہ سے پرکھتے ہیں اور صرف ایسی حدیثوں کو معتبر سمجھتے ہیں۔ جن کی روایت حضرت علی اور ان کے رفقا سے منسوب ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر ان کی اپنی کتابیں موجود ہیں۔ جن میں سے وہ مندرجہ ذیل پانچ کتابوں کو بالخصوص بہت معتبر خیال کرتے ہیں:۔

(۱) الکافی از محمد بن یعقوب الکلینی (وفات ۳۲۸ ہجری مطابق ۹۳۹ء)

(۲) من لا یستحضرہ الفقیہ از محمد بن علی بن بابویہ القمی (وفات ۳۸۱ھ مطابق ۹۹۱ء)

(۳) تہذیب الحکام

(۴) الاستبصار فی مختلف فیہ الاحبار (کتاب سابق کا خلاصہ) از محمد الطوسی (وفات ۴۵۹ھ مطابق ۱۰٦۷ء)

(۵) نہج البلاغہ (حضرت علی کے مبینہ اقوال) از علی بن طاہر الشریف المرتضیٰ (وفات ۴۳٦ ہجری مطابق ۱۰۴۴ء) (از برادرش رضی الدین البغدادی)

جب دوسری اور تیسری صدیوں میں عبادات و رسوم عقائد و مسلمات اور اہم ترین سیاسی و اجتماعی ادارات نے قطعی شکل اختیار کر لی تو بہت سے راویان حدیث کے استناد اور ان کی روایتوں کے اعتبار کے بارے میں ایک رائے عامہ پیدا ہو گئی۔ عقیدے کے اصول اساسی اس وقت تک مالک بن انس، الشافعی اور دیگر علما کی تصانیف میں قائم ہو چکے تھے جو مختلف حلقوں میں مستند و معتبر سمجھے جاتے تھے بلکہ وہ زیادہ تر رسول پاک صلعم کی احادیث کی سند پر ہی مبنی تھے۔ جتنا وقت گزرتا گیا کسی نے ان احادیث کی صحت پر شبہ کرنے کی جرات نہ کی اور آج تک صحاح ستہ احادیث کی صحت و صداقت پر تقریباً قطعی یقین برابر چلا آ رہا ہے۔

ہم اب تک اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کسی موضوع پر کوئی حکم بھی ہو اگر اس کا استخراج قرآن مجید اور سنت رسول پاکؐ سے کیا گیا ہے تو وہ ہر مسلمان کے لیے واجب التعمیل ہے لیکن چونکہ سنت کی شہادت صرف حدیث ہے۔ اس لیے سنت اور حدیث کے الفاظ ایک دوسرے سے اس قدر مخلوط ہو گئے ہیں کہ دونوں میں تمیز دشوار ہو گئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں مقصد ''قرآن اور سنت'' ہو وہاں عام طور پر ''قرآن و حدیث'' ہی کا جملہ استعمال کیا جاتا ہے۔

اس مرحلے پر ایک اور اصول سامنے آ جاتا ہے جو مساوی طور پر بنیادی ہے وہ اصول یہ ہے کہ اسلام آخری الہامی مذہب ہے جو ہر اعتبار سے مکمل اور جامع ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دین کے کسی حصے کی تنسیخ یا تخفیف یا اضافے کا امکان انتہائی بعید ہے۔ جتنا کسی نئے رسول کا مبعوث ہو جانا غیر ممکن ہے۔ دین مکمل کر دیا گیا ہے (اکملت لکم دینکم سورہ ۵ آیت ۳)

اس لیے اب کسی ایسے نئے ضابطے کی ضرورت نہیں رہی جو اصلی ضابطے کی تنسیخ، ترمیم یا تائید کرے اور نہ کسی نئے پیغمبر یا پیغام کی حاجت باقی ہے۔ لہٰذا ان معنوں میں نبوت رسول پاک صلعم پر ختم ہو گئی اور الہام کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ یہ ''ختم وحی نبوت'' کا عقیدہ ہے۔ اگر اس نظریے کو پوری طرح سمجھ لیا جائے کہ اسلام کے عقائد، اخلاق اور ادارات خطا سے پاک ہونے کے عقیدے پر مبنی ہیں خواہ وہ بے خطائی قرآن میں، سنت میں، اجماع میں یا اجتہاد مطلق میں مضمر ہو تو اس سے جو نتائج بھی مستنبط ہونگے وہ آسانی سے سمجھ میں آ جائیں گے۔ چونکہ ہر معاملے میں خواہ وہ

عبادات سے متعلق ہو یا اس کی نوعیت سیاسی یا اجتماعی یا اقتصادی ہو آخری معیار صداقت الہامی الٰہی ہے اور الہام قرآن مجید ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور سنت بھی الہام کی مانند بے خطا ہے اور سنت کی صحت کی تنہا شہادت حدیث ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت قائم کرنے کے خواہشمندوں کا پہلا فرض یہ معلوم کرنا ہے کہ جس حکم کا حالات حاضرہ پر اطلاق ہوتا ہے وہ آیا قرآن یا حدیث میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے موزوں ترین اشخاص وہی ہیں جنہوں نے زندگی بھر قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہے۔ یعنی سنیوں کے علما اور شیعوں کے مجتہد جو امام غائب (جو امر الٰہی کے ماتحت حاکم ہے) کے نائب ہیں۔ ان علمائے دین کا وظیفہ یہ ہوگا کہ ایسے احکام کا سراغ لگانے میں مصروف رہیں جن کا اطلاق مخصوص صورتوں میں ہو سکے۔ ان کی یہ مصروفیت اسی قسم کی ہوگی جس میں فلاسفہ یونان مشغول رہا کرتے تھے اور دونوں میں فرق صرف یہ ہوگا کہ فلاسفہ یونان کے نزدیک تو تمام صداقتیں فطرت میں مضمر تھیں جو انفرادی کوشش سے بے نقاب کی جا سکتی تھیں۔ لیکن علما و مجتہدین اس حق کا سراغ لگائیں گے جو کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ میں موجود ہے۔ مجلس اصول اساسی میں علما کے بورڈ کی جو سفارش کی گئی تھی وہ گویا اس اصول کا منطقی اعتراف تھا اور اس بورڈ کے خلاف صحیح اعتراض حقیقت میں یہی ہونا چاہیے تھا کہ جس اصول نے اس بورڈ کو جنم دیا تھا۔ اس کے عمل درآمد کے لیے وہ بورڈ نہایت ناکافی اور کمزور آلہ تھا۔

اجماع کے معنی ہیں مجتہدین ملت کا اتفاق رائے۔ مجتہدین وہ لوگ ہیں جو رسول پاک صلعم کے وصال کے بعد اپنے علم کی بنا پر خود حکم لگانے اور فیصلے کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اجماع کے اختیار کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ اللہ تعالیٰ امکان خطا سے حفاظت کرے گا کیونکہ ابن ماجہ میں رسول اللہ صلعم کی ایک حدیث درج ہے کہ ''میری امت گمراہی پر کبھی متفق نہ ہوگی'' اجماع سے متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق احکام معین کر دیے جاتے تھے اور جب وہ ایک دفعہ معین ہو جاتے تھے تو دین کا جزو لاینفک بن جاتے تھے اور ان سے انکار کرنا کفر قرار دیا جاتا تھا۔ اجماع کے متعلق یہ نکتہ یاد رکھنا لازمی ہے کہ اس سے مجتہدین کے اتفاق رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ عوام کے اتفاق کا معاملہ بالکل خارج از بحث ہے۔ اس طریق سے اجماع نے نہ صرف غیر منفصل معاملات کے متعلق احکام معین کر دیے

ہیں بلکہ بعض اہم ترین عقائد تک کو تبدیل کر دیا ہے۔

اجماع اور اجتہاد میں یہ فرق ہے کہ اجماع اجتماعی اور اجتہاد انفرادی ہوتا ہے۔ اجتہاد کے معنی ہیں کسی مقدمے یا قانون کے کسی حکم کے متعلق رائے قائم کرنے میں انتہائی محنت کرنا۔ اجتہاد قرآن اور سنت پر قیاس کے اطلاق سے کیا جاتا ہے۔ اجتہاد پہلے پہل خطا سے پاک نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کے نتائج ہمیشہ ظنی خیال کیے جاتے تھے یہ صرف اس حالت میں خطا سے پاک سمجھا جاتا تھا جب مختلف افراد کا اجتہاد مل کر اجماع بن جاتا تھا لیکن یہ وسیع اجتہاد بہت جلد ایسے لوگوں کے خاص اجتہاد کی شکل اختیار کر گیا جو رائے قائم کرنے کا خاص حق رکھتے تھے جب بعد کے علمانے چار شرعی مذاہب کی تاسیس کا مطالعہ کیا تو ان مذاہب کے بانیوں کو ''اجتہاد مطلق'' کا درجہ دے دیا۔ لیکن وقتاً فوقتاً ایسے افراد ظہور میں آتے رہے جنھوں نے اجتہاد کے اولین مفہوم کو اختیار کیا اور دعویٰ کیا کہ وہ بھی اصول اولیٰ کے ماتحت اپنی رائے قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک ابن تیمیہ حنبلی تھے (وفات ۱۳۲۸ء) دوسرے سیوطی تھے (وفات ۹۱۱ء) جنھوں نے اجتہاد کے دعوے کے علاوہ اپنی صدی کے مجدد ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جس طرح ہر صدی میں ایک مجدد آنا چاہیے۔ اسی طرح ہر زمانے میں کم سے کم ایک مجتہد ضرور ہونا چاہیے۔ شیعوں کے اسلام میں آج بھی مجتہدین مطلق موجود ہیں جو امام غائب کے نائب سمجھے جاتے ہیں۔ پس اجتماعی اجتہاد سے اجماع پیدا ہوتا ہے اجماع کی بنیاد یہ کہ اللہ تعالیٰ خطا سے محفوظ رکھتا ہے یعنی اجماع کا فیصلہ خطا سے پاک ہوتا ہے۔

مملکت اسلامی کے لوازم

چونکہ اسلامی شریعت کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ الہام الٰہی اور رسول پاک کے اقوال و افعال خطا سے پاک ہیں۔ لہٰذا قرآن اور سنت کے احکام وقوانین انسان کے وضع کردہ قوانین سے بالاتر ہیں اور ان دونوں کے تصادم کی صورت میں آخر الذکر کو (بلا لحاظ اپنی نوعیت کے) اول الذکر کے آگے سر جھکا دینا چاہیے۔ اس طرح اگر کسی مسئلے کے متعلق قرآن یا سنت میں کوئی ایسا حکم موجود ہو

جو ہمارے تصور کے مطابق قانون دستوری یا قانون بین الاقوامی کے دائرے میں آتا ہو تو اس صورت میں اس حکم کو نافذ کرنا چاہیے سوائے اس حالت کے کہ خود وہ حکم انحراف کی اجازت دیتا ہو۔ یعنی شریعت اسلامی میں قانون دستوری اور دوسرے قانون کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں بلکہ جتنے قوانین قرآن اور سنت میں پائے جاتے ہیں۔ وہ مملکت کی مسلمان رعایا کے لیے قانون ملکی ہی کا ایک حصہ ہیں۔ اس طرح اگر قرآن یا سنت میں کوئی ایسا حکم ہو جو دوسری مملکتوں کے ساتھ مملکت کے تعلقات یا مملکت کی مسلمان رعایا اور دوسری مملکتوں کے ساتھ مملکت کے تعلقات یا مملکت کی مسلمان رعایا اور دوسری مملکتوں یا ان مملکتوں کی رعایا کے درمیان روابط سے تعلق رکھتا ہو تو اس حکم کا نفاذ بھی اتنا ہی لازمی ہوگا۔ جتنا قرآن یا سنت کے دوسرے احکام کا نفاذ ضروری ہے۔ لہٰذا اگر پاکستان اسلامی مملکت ہے یا اس کو صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنانے کا ارادہ ہے تو اس کے دستور میں ذیل کی پانچ دفعات ضرور ہونی چاہئیں:۔

(۱) تمام قوانین جو قرآن و سنت میں موجود ہیں مسلمانوں کے لیے قانون ملکی کا ایک حصہ متصور ہونگے اور اسی حیثیت سے نافذ کیے جائیں گے۔

(۲) دستور کی کوئی دفعہ جو قرآن یا سنت کے منافی ہوگی وہ اپنے منافی ہونے کی حد تک کالعدم سمجھی جائے گی سوائے اس حالت کے کہ دستور خود اجماع امت کے ماتحت وضع کیا گیا ہو یعنی مسلمہ مرتبے کے علما اور مجتہدین کے اتفاق رائے سے تیار ہوا ہو۔

(۳) سوائے اس حالت کے کہ پاکستان کے موجودہ قوانین کو مذکورہ بالا قسم کے اجماع امت کی منظوری حاصل ہو جائے۔ موجودہ قانون کی کوئی دفعہ جو قرآن یا سنت کے منافی ہوگی وہ اپنے منافی ہونے کی حد تک کالعدم سمجھی جائے گی۔

(۴) کسی آئندہ قانون کی کوئی دفعہ جو قرآن و سنت کے منافی ہوگی کالعدم سمجھی جائے گی۔

(۵) بین الاقوامی قانون کا کوئی قاعدہ اور کسی ایسے میثاق یا معاہدے کی کوئی دفعہ (جس کے فریقوں میں پاکستان بھی شامل ہوگا) اگر قرآن یا سنت کے خلاف ہوگی تو پاکستان کے کسی مسلمان پر اس کی پابندی واجب نہ ہوگی۔

مملکت اسلامی میں حاکمیت اور جمہوریت

علما نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ اگر پاکستان میں اصول اسلامی کے مطابق حکومت قائم کی گئی تو اس کی شکل جمہوری نہیں ہوگی ہم ابھی قرآن وسنت کی حاکمیت کے عقیدے کی وضاحت کر چکے ہیں۔ قرارداد مقاصد میں جب یہ اظہار کر دیا گیا کہ تمام حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے تو گویا اس موقف کو صحیح طور سے تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن جب اس قرارداد کے واضعین نے یہ بیان کیا کہ ایک آزاد و خودمختار مملکت کے لیے دستور تیار کیا جائے گا جس میں اسلام کے سکھائے ہوئے اصول جمہوریت پوری طرح مدنظر رکھے جائیں گے تو انہوں نے خودمختار جمہوریت دونوں لفظوں کا غلط استعمال کیا۔ ہو سکتا ہے کہ جس سیاق وسباق میں انہوں نے یہ لفظ استعمال کیے، اس میں ان لوگوں نے اس کا مطلب غلط نہ سمجھا ہو جو اسلامی اصولوں کے ماہر ہیں۔ لیکن یہ دونوں لفظ مغربی فلسفہ سیاست سے مستعار لیے گئے تھے اور ان معنوں میں دونوں کا استعمال اس قرارداد میں غلط طور سے کیا گیا تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں ملک آزاد و خودمختار ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے باشندے یا اس کا کوئی دوسرا گروہ افراد حق رکھتا ہے کہ اپنے ملک کے نظم امور کو جس طریقے سے چاہے چلائے اور اس میں ضرورت اور پالیسی کے سوا دوسرے مصالح بالکل حائل نہ ہوں لیکن ایک اسلامی مملکت اس مفہوم میں آزاد و خودمختار نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کو قرآن یا سنت کے کسی قانون کو منسوخ یا ترمیم یا ترک کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔ کسی مملکت کے اختیار قانون سازی کو قطعاً محدود کر دینا اس مملکت کے لوگوں کی آزادی وخودمختاری کو محدود کرنا ہے اور اگر اس تحدید کا ماخذ ارادہ عوام کے سوا کوئی اور ہو تو جس حد تک یہ تحدید عائد کی جائے گی اس حد تک مملکت اور اس کے باشندوں کی حاکمیت لازماً کم ہو جائے گی۔ اسلامی مملکت میں حاکمیت اپنے قانونی مفہوم کے اعتبار سے صرف اللہ ہی کی ذات کو حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح جمہوریت کا مطلب ''جمہور کی حکومت'' ہے خواہ یہ حکومت براہ راست ان کے ہاتھ میں ہو جیسے یونان و روما میں تھی یا وہ اپنے منتخب نمائندوں کی وساطت سے حکومت کریں

جیسے زمانہ ءحاضر کی جمہورتیوں میں رواج ہے۔ اگر دستور کے وضع کرنے قوانین کے بنانے اور انتظامی کاروائی کے دائرے میں جمہور کا اختیار بعض نا قابل تبدیل احکام وقواعد کے ماتحت ہوتو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ جو قانون چاہیں منظور کر سکتے ہیں یا انتظامی وظائف کی بجا آوری میں اپنے منشا کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی اسلامی مملکت میں مقننہ ایک قسم کا اجماع بھی ہوتو عوام اس میں حصہ لینے سے قطعی طور پر محروم ہو نگے کیونکہ فقہ اسلامی میں اجماع امت صرف مسلمہ حیثیت کے علماو مجتہدین تک محدود ہے اور جمہوریت کی طرح یہ حق عوام تک ہرگز نہیں پہنچتا۔

علما کے نزدیک اسلامی مملکت کے دیگر خصائص

سابقہ صفحات میں ہم نے اپنی طاقت بھران اصولوں کی تصریح کی کوشش کی ہے جن پر ایک مذہبی مملکت تعمیر کی جاسکتی ہے اور اس کو اسلامی مملکت کہا جا سکتا ہے اب ہم ایسی مملکت کے بعض بیان کریں گے اور اس کے متعلق علما کے تصور کا خاص طور پر تذکرہ کریں گے۔

327

مجلس قانون ساز اور قانون سازی

نظام اسلامی میں قانون سازی کا موجودہ مفہوم بالکل ناپید ہے۔ دین وسیاست کا وہ مجموعی نظام جو دین اسلام کہلاتا ہے ایک مکمل نظام ہے اور اس میں ایسا انتظام موجود ہے کہ جو صورت حالات بھی پیدا ہو اس کے متعلق قانون کا انکشاف واطلاق کر دیا جائے۔ جمہوریہ ءاسلام کے دوران میں زمانہ ءحاضر کے انداز کی کوئی مقننہ موجود نہ تھی اور جو صورت حالات یا فوری ضرورت پیش آجاتی تھی۔ اس کے مطابق علما قانون انکشاف اور اطلاق کر سکتے تھے۔ قانون بن چکا تھا اور اس کے بنانے کی حاجت نہ تھی اور قانون کا نفاذ جن لوگوں کے سپرد تھا ان کا کام صرف یہ تھا کہ کسی خاص مقدمے کی اغراض کے لیے قانون کا انکشاف کریں۔ البتہ جب ایک دفعہ اس قانون کا آغاز اور اطلاق ہو جاتا تو وہ دوسروں کے لیے پیروی کی ایک نظیر بن جاتا۔ بعض حلقوں کا یہ قول بالکل غلط ہے

کہ پاکستان جیسے ملک میں جو مختلف قوموں پر مشتمل ہے جس میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی اور جس میں غیر مسلموں کو نمائندگی بھی دی گئی ہے اور یہ حق بھی عطا کر دیا گیا ہے کہ جو مسئلہ پیش ہو اس پر ووٹ دے سکیں۔ مقننہ ہی اجماع یا اجتہادی ہوتا ہے لیکن اس میں ان لوگوں کا کوئی مقام نہیں جو علم قانون کے ماہر نہیں ہیں۔ اس اصول کے ماتحت کفار خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے بالکل خارج از بحث ہو جاتے ہیں چونکہ اسلام ایک مکمل مذہب ہے اس میں واضح قوانین بھی ہیں اور اجماع یا اجتہاد سے مستنبط بھی کیے جا سکتے ہیں۔ اور وہ انسانی فعالیت کے پورے دائرے پر حاوی ہیں لہٰذا اس میں اس چیز کا کوئی جواز نہیں جس کو زمانہ حاضر کے مفہوم میں قانون سازی کہتے ہیں۔ اس نکتے پر جب مولانا ابوالحسنات صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے مندرجہ ذیل جوابات دیے۔

سوال۔ کیا قانون کی تعبیر جن افراد یا جماعتوں کے سپرد کی جاتی ہے ان سے علیحدہ وضع قوانین کا ادارہ بھی اسلامی مملکت کا ایک لازمی جزو ہے؟

جواب۔ جی نہیں ہمارا قانون مکمل ہے اور اس میں صرف ایسے اشخاص کی تعبیر اور توجیہ کی ضرورت ہے جو اس کے ماہر ہیں۔ میرے عقیدے کے مطابق کوئی ایسا مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا جس کے متعلق قرآن یا حدیث سے قانون کا استنباط نہ ہو سکے۔

سوال۔ صاحب الحل والعقد کن لوگوں کو کہتے ہیں؟

جواب۔ وہ اپنے وقت کے ممتاز علماء تھے ان لوگوں کو اپنے علم شریعت کی وجہ سے یہ رتبہ حاصل ہوا تھا یہ لوگ کسی اعتبار سے زمانہ حاضر کی جمہوریت کے مشابہ یا مترادف نہ تھے یہی خیال امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری نے اپنی ایک تقریر میں ظاہر کیا تھا جو ''آزاد'' مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۴۷ء میں درج ہوئی تھی۔ اس تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا کہ ہمارا دین کامل و مکمل ہے اور مزید قوانین وضع کرنا کفر کے برابر ہے لیکن ابوالاعلیٰ مودودی کی رائے یہ ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں ان معاملات کے متعلق صحیح معنوں میں قانون سازی ممکن ہے جن کے متعلق قرآن و سنت اور سابقہ اجماع میں کوئی ہدایت نہ مل سکے اور مولانا نے اپنے اس نکتے کی وضاحت کے لیے اس مجلس

افراد کا ذکر کیا ہے جس سے رسول پاکؐ اور ان کے بعد خلفا امور مملکت کے متعلق تمام معاملات پر مشورہ کیا کرتے تھے۔ یہ مسئلہ کسی قدر مشکل ہے اور اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ قانون سازی کے ادارے کو اس دعوے کے مطابق بنانا ہوگا جو مولانا ابوالحسنات اور بعض دوسرے علمائے دین نے کیا ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ ہے اور اس قدر وسیع ہے کہ ہر قسم کی انسانی فعالیت کے متعلق پیدا ہونے والے مسائل کا حل مہیا کرسکتا ہے اور کسی ایسے خلاف کا قائل نہیں جس کو تازہ قانون سازی سے پر کرنے کی ضرورت ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام مشورے کا حکم دیتا ہے اور نہ صرف رسول پاک صلعم بلکہ پہلے خلفائے اربعہ اور ان کے جانشین بھی اپنے وقت کے ممتاز اشخاص سے مشورہ کیا کرتے تھے جن پر ان کے علم شریعت اور ان کے تقویٰ کی وجہ سے پورا اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ اس تحقیقات کے دوران مجلس شوریٰ کے متعلق کچھ زیادہ معلوم نہ ہوسکا سوائے اس کے جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اس تحریری بیان میں موجود ہے جو مولانا نے اس عدالت کی درخواست پر مہیا کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مجلس افراد موجود تھی اور آیا ان لوگوں کا مشورہ کوئی قانونی حیثیت یا تنقیدی قوت رکھتا تھا اگرچہ ان اشخاص کی نمائندہ نوعیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کا انتخاب یقیناً زمانہ حاضر کے طریقوں کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔ ان سے عارضی طور پر مشورہ ضرور کیا جاتا تھا لیکن یہ قطعاً صحیح نہیں کہ وہ موجودہ مجالس قانون ساز کی طرح قوانین وضع کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ ان کے کیے ہوئے فیصلے یقیناً نظائر کا کام دیتے تھے اور ان کی نوعیت اجماع کی تھی جو قانون سازی نہیں بلکہ کسی خاص مقدمے پر کسی موجودہ قانون کے اطلاق کا نام ہے جب امور مملکت میں ان سے مشورہ کیا جاتا تھا تو ان کے وظائف یقیناً اس صلاح کی نوعیت رکھتے تھے جو زمانہ حاضر کی کابینہ دیتی ہے لیکن اس قسم کی صلاح قانون نہیں ہوتی بلکہ اس کو صرف فیصلہ کہا جاسکتا ہے۔

زمانہ حاضر کی قانون سازی کو اجماع سے مشابہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ جیسا ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔ مجلس قانون ساز قانون وضع کرتی ہے۔ لیکن مجلس شوریٰ کے علما کا کام یہ تھا کہ کسی خاص نقطے پر جس کا ذکر قرآن و سنت میں نہ پایا جاتا ہو۔ فیصلے کا تعین کریں۔ لہٰذا وہ صرف قانون کا انکشاف و اطلاق کرتے تھے قانون کو وضع نہ کرسکتے تھے البتہ جو فیصلہ وہ کردیتے تھے نہ صرف اس

خاص مقدمے پر بلکہ بعد کے موقع پر بھی واجب العمل نظیر بن جاتا تھا۔ اگر قانون دستور میں یہ دفعہ شامل ہو کہ اگر اس قانون کی کوئی دفعہ قرآن وسنت کے مخالف ہوگی تو کالعدم سمجھی جائے گی اور عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں مقنّنہ کے کسی بنائے ہوئے قانون کے خلاف اس بنا پر اعتراض اٹھایا جائے کہ خود مجلس قانون ساز ہی قرآن وسنت کے خلاف ہے تو تصور کیجیے کہ کس قدر عجیب اور پیچیدہ صورت حالات پیدا ہو جائے گی۔

غیر مسلموں کا موقف

جس وجہ کی بنا پر چودھری ظفر اللہ خان اور مملکت کی کلیدی اسامیوں کے احمدی عہدہ داروں کی برطرفی کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ احمدی غیر مسلم ہیں اس لیے ایک اسلامی مملکت کے ذمیوں کی طرح وہ مملکت کے بڑے عہدوں پر تقرر کا حق نہیں رکھتے۔ مطالبات کے اس پہلو سے براہ راست یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اسلامی دستور نافذ کریں گے تو پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت ذمیوں کی سی ہوگی اور وہ پاکستان کے پورے شہری نہ ہوں گے کیونکہ ان کو مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل نہیں ہونگے۔ وضع قوانین میں ان کی کوئی آواز نہ ہوگی قانون کے نفاذ میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا اور انہیں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اس موقف کا پورا اظہار مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری، مولانا احمد علی، میاں طفیل محمد اور مولانا عبد الحامد بدایونی کی شہادتوں میں کیا گیا ہے۔ جب اس موضوع پر مولانا ابو الحسنات سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا:۔

سوال۔ اگر ہم پاکستان میں اسلامی مملکت قائم کرینگے تو کفار (غیر مسلم) کا موقف کیا ہوگا۔ کیا انہیں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کا حق ہوگا؟

جواب۔ ان کا موقف ذمیوں کا سا ہوگا۔ ان کی وضع قوانین میں کوئی آواز نہ ہوگی۔ قانون کی تنفیذ میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا اور سرکاری عہدوں پر فائز ہونیکا حق نہ ہوگا۔

سوال ۔کیا ایک اسلامی مملکت میں رئیس مملکت اپنے اختیارات کا کوئی جزو کفار کو تفویض کر سکتا ہے؟

جواب ۔۔جی نہیں ۔مولانا نے استفسار کا یہ جواب دیا۔

سوال ۔اگر ہم پاکستان میں اسلامی مملکت قائم کرینگے تو کفار کا موقف کیا ہوگا کیا انہیں وضع قوانین میں کوئی آواز حاصل ہوگی ۔انہیں قانون کی تنفیذ کا موقع دیا جائیگا۔اور انہیں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کا حق ہوگا؟

جواب ۔ان کا موقف ذمیوں کا سا ہوگا، وضع قوانین میں ان کی کوئی آواز نہ ہوگی ۔نہ تنفیذ قانون کا حق ہوگا۔البتہ حکومت ان کو کسی سرکاری عہدے پر فائز ہونے کی اجازت دے سکتی ہے۔

میاں طفیل احمد نے حسب ذیل بیان دیا:۔

سوال ۔اقلیتوں کے حقوق کے متعلق جو مضمون 'سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔اس کو پڑھ کر بتایئے کہ آیا اس میں اسلامی مملکت کے متعلق آپ کے کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے (اس مضمون میں بیان کیا گیا تھا کہ اقلیتوں کے حقوق مسلمانوں کے برابر ہوں گے)

جواب ۔میں نے یہ مضمون پڑھ لیا ہے اگر پاکستان میں جماعت اسلامی کے نظریے پر مبنی مملکت قائم کی جائے تو میں پاکستان میں عیسائیوں یا دوسرے غیر مسلموں کے ان حقوق کو تسلیم نہیں کرونگا۔

اس نکتے پر مولانا عبدالحامد بدایونی کی ذہنی ژولیدگی مندرجہ ذیل بیان سے ظاہر ہوگی:۔

سوال ۔کیا آپ نے کبھی مذکورہ بالا تقریر کو پڑھا ہے؟ (قائداعظم کی وہ تقریر جو انہوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں کی تھی)

جواب ۔جی ہاں میں نے وہ تقریر پڑھی ہے۔

سوال ۔کیا آپ اب تک پاکستان کے اس تصور سے اتفاق کرتے ہیں جو قائداعظم نے دستور ساز اسمبلی کی تقریر میں پیش کیا تھا اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ آج کے بعد صرف ایک

پاکستانی قوم ہوگی جس میں مسلم اور غیر مسلم شامل ہوں گے۔ان سب کو مساوی شہری حقوق حاصل ہوں گے نسل مذہب اور مسلک کا کوئی امتیاز نہ ہوگا۔اور مذہب محض فرد کا نجی معاملہ سمجھا جائے گا؟

جواب۔میں اس اصول کو تسلیم کرتا ہوں کہ تمام قوموں کو خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم مملکت کے نظم ونسق اور قانون سازی میں ان کی آبادکاری کے مطابق نمائندگی حاصل ہونی چاہیے۔سوائے اس کے کہ غیر مسلم شعبہ فوج اور محکمہ عدالت میں نہ لیے جاسکیں گے نہ وزیر مقرر کیے جاسکیں گے اور نہ کسی اعتماد کے عہدے پر فائز ہوسکیں گے۔

سوال۔کیا آپ کا مقصد اس سے یہ ہے کہ غیر مسلموں کا موقف ذمیوں کا سا ہوگا یا اس سے بہتر ہوگا؟

جواب۔جی نہیں۔ذمیوں سے مراد ان ملکوں کی غیر مسلم آبادی سے ہے جن کو کسی اسلامی مملکت نے فتح کیا ہو۔اس لفظ کا اطلاق ان غیر مسلم اقلیتوں پر نہیں ہوسکتا جو کسی اسلامی مملکت میں پہلے سے آیا ہوا ایسی اقلیتیں معاہد کہلاتی ہیں (یعنی وہ لوگ جن سے کوئی معاہدہ کیا گیا ہو)

سوال۔اگر ان سے کوئی معاہدہ نہ ہو تو پھر ان کی حیثیت کیا ہوگی؟

جواب۔ایسی حالت میں ان قوموں کو شہریت کے کوئی حقوق حاصل نہ ہوں گے۔

سوال۔کیا پاکستان میں رہنے والی غیر مسلم اقلیتیں آپ کے نزدیک معاہد کہلا سکتی ہیں؟

جواب۔جی نہیں تاوقتیکہ ان سے کوئی معاہدہ نہ ہو میرے علم میں ایسی قوموں کے ساتھ پاکستان میں اب تک کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔

پس اس عالم دین کی شہادت کی رو سے پاکستان کے غیر مسلم نہ تو شہری ہوں گے نہ انہیں ذمیوں یا معاہدوں کی حیثیت حاصل ہوگی۔

جمہوریہ اسلامی کے دوران میں رئیس مملکت یعنی خلیفہ ایک ایسے نظام انتخاب کے ماتحت منتخب کیا جاتا تھا جو زمانہ حاضر کے انتخاب سے قطعاً مختلف تھا۔اور اس کی بنیاد نہ بالغوں کے حق رائے دہی پر اور نہ عمومی نمائندگی کی کسی اور ہیئت پر تھی اس کی جو بیعت کی جاتی تھی جسے حلف اطاعت کہنا چاہیے اسے ایک مقدس معاہدہ کی حیثیت حاصل تھی اور جب وہ اجماع الامت یعنی لوگوں کے اتفاق

آرا سے منتخب ہو جاتا تھا تو جائز حکومت کے تمام شعبوں کا سرچشمہ بن جاتا تھا۔ اس کے بعد اس کو اور صرف اس کو حکومت کرنے کا حق ہوتا تھا وہ اپنے بعض اختیارات اپنے نائبوں کو تفویض کر سکتا تھا اور اپنے گرد ایسے اشخاص کے ایک گروہ کو جمع کر لیتا تھا جو علم و تقویٰ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، اس گروہ کو مجلس شوریٰ یا اہل الحل والعقد کہتے تھے۔ اس نظام کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ کفار ان وجوہ کے ماتحت جو واضح تھے اور جن کے بیان کی حاجت نہیں اس مجلس میں دخل حاصل نہیں کر سکتے تھے اور خلیفہ اپنے اختیارات کفار کو بالکل تفویض نہ کر سکتا تھا۔ خلیفہ حقیقی رئیس مملکت اور تمام اختیارات کا حامل ہوتا تھا اور زمانہ حاضر کی کسی جمہوری مملکت کے صدر کی طرح ایک بے اختیار فرد نہ تھا جس کا فرض صرف اتنا ہوتا ہے کہ اپنے وزیر اعظم اور کابینہ کے فیصلوں پر دستخط کر دے وہ اور وضع قوانین کا کام ان کے سپرد کرنا تو قانونی اعتبار سے بالکل ہی ناممکن تھا۔

جب صورت حال یہ ہے تو مملکت کو لازماً کوئی ایسا انتظام کرنا ہوگا کہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق معین ہو سکے اور اس کے نتائج پر عمل درآمد کیا جا سکے۔ لہٰذا یہ مسئلہ بنیادی طور پر اہم ہے کہ کوئی شخص مسلم ہے یا غیر مسلم اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اکثر ممتاز علماء سے یہ سوال کیا ہے کہ وہ "مسلم" کی تعریف کریں۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اگر مختلف فرقوں کے علماء احمدیوں کو کافر سمجھتے ہیں تو ان کے ذہن میں نہ صرف اس فیصلے کی وجوہ بالکل روشن ہونگی بلکہ وہ "مسلم" کی تعریف بھی قطعی طور پر کر سکیں گے کیونکہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں شخص یا جماعت دائرہ اسلام سے خارج ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ دعویٰ کرنے والے کے ذہن میں اس امر کا واضح تصور موجود ہو کہ "مسلم" کس کو کہتے ہیں۔ تحقیقات کے اس حصے کا نتیجہ بالکل اطمینان بخش نہیں نکلا اور اگر ایسے سادہ معاملے کے متعلق بھی ہمارے علماء کے دماغوں میں اس قدر ژولیدگی موجود ہے تو آسانی سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ زیادہ پیچیدہ معاملات کے متعلق ان کے اختلافات کا کیا حال ہوگا۔ ذیل میں ہم "مسلم" کی تعریف ہر عالم کے اپنے الفاظ میں درج کرتے ہیں۔ اس تعریف کا مطالبہ کرنے سے پہلے ہر گواہ کو واضح طور پر سمجھا دیا گیا تھا کہ آپ وہ قلیل سے قلیل شرائط بیان کیجیے جن کی تکمیل سے کسی شخص کو مسلم کہلانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور یہ تعریف اس اصول پر مبنی ہونی چاہیے جس کے

مطابق گرائمر میں کسی اصطلاح کی تعریف کی جاتی ہے نتیجہ ملاحظہ ہو۔

مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان

سوال۔ مسلم کی تعریف کیا ہے؟

جواب۔ اول۔ وہ توحید الٰہی پر ایمان رکھتا ہو۔

دوم۔ وہ پیغمبر اسلام کو اور تمام انبیائے سابقین کو خدا کا سچا نبی مانتا ہو۔

سوم۔ اس کا ایمان ہو کہ پیغمبر اسلام صلعم انبیا میں آخری نبی ہیں (خاتم النبیین)

چہارم۔ اس کا ایمان ہو کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ الہام پیغمبر اسلام صلعم پر نازل کیا

پنجم۔ وہ پیغمبر اسلام صلعم کی ہدایات کے واجب الاطاعت ہونے پر ایمان رکھتا ہو

ششم۔ وہ قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔

سوال۔ کیا تارک صلوٰۃ مسلم ہوتا ہے؟

جواب۔ جی ہاں لیکن منکر صلوۃ مسلم نہیں ہوسکتا۔

مولانا احمد علی صدر جمعیت العلمائے اسلام مغربی پاکستان:۔

334

سوال۔ ازراہ کرم مسلم کی تعریف کیجیے۔

جواب۔ وہ شخص مسلم ہے جو (۱) قرآن پر ایمان رکھتا ہو اور (۲) رسول اللہ صلعم کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہو۔ ہر شخص جو ان دو شرطوں کو پورا کرتا ہے مسلم کہلانے کا حقدار ہے۔ اور اس کے لیے اس سے زیادہ عقیدے اور اس سے زیادہ عمل کی ضرورت نہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی

سوال۔ ازراہ کرم مسلم کی تعریف کیجیے۔

جواب۔ وہ شخص مسلم ہے جو (۱) توحید پر (۲) تمام انبیا پر (۳) تمام الہامی کتابوں پر (۴) ملائکہ پر (۵) یوم الآخرۃ پر ایمان رکھتا ہو۔

سوال۔ کیا ان باتوں کے محض زبانی اقرار سے کسی شخص کو مسلم کہلانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور آیا کہ ایک مسلم مملکت میں اس سے وہ سلوک کیا جائے گا جو مسلمان سے کیا جاتا ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہوں تو کیا کسی شخص کو اس کے عقیدے کے وجود پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے؟

جواب۔ جو پانچ شرائط میں نے بیان کی ہیں وہ بنیادی ہیں جو شخص ان شرائط میں سے کسی شرط میں کوئی تبدیلی کرے گا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

غازی سراج الدین منیر:

سوال۔ ازراہ کرم مسلم کی تعریف کیجیے۔

جواب۔ میں ہر اس شخص کو مسلمان سمجھتا ہوں جو کلمہ لا الہ الا اللہ پر ایمان کا اقرار کرتا ہے اور رسول پاک صلعم کے نقش قدم پر چل کر زندگی بسر کرتا ہے۔

مفتی محمد ادریس جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد۔ لاہور:۔

سوال۔ ازراہ کرم مسلم کی تعریف کیجئے؟

جواب: لفظ مسلمان فارسی کا لفظ ہے مسلم کے لیے فارسی میں جو لفظ مسلمان بولا جاتا ہے اس میں اور لفظ 'مومن' میں فرق ہے میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ میں لفظ مومن کی مکمل تعریف کروں کیونکہ اس امر کی وضاحت کے لیے بے شمار صفحات درکار ہیں کہ 'مومن' کیا ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اقرار کرتا ہے وہ مسلم ہے، اس کو توحید الٰہی رسالت انبیا اور یوم قیامت پر ایمان رکھنا چاہیے جو شخص اذان یا قربانی پر ایمان نہیں رکھتا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اس طرح بے شمار دیگر امور بھی ہیں جو ہمارے نبی کریم سے ہم کو تواتر کے ساتھ پہنچے ہیں۔ مسلم ہونے کے لیے ان سب امور پر ایمان لانا ضروری ہے میرے لیے یہ قریب قریب ناممکن ہے کہ ان تمام امور کی مکمل فہرست پیش کروں۔

حافظ کفایت حسین، ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ:۔

سوال۔ مسلمان کون ہے؟

جواب۔ جو شخص (۱) توحید (۲) نبوت (۳) قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ مسلمان کہلانے کا

حقدار ہے یہ تین بنیادی عقائد ہیں جن کا اقرار کرنے والا مسلمان کہلا سکتا ہے۔ان تین بنیادی عقائد کے معاملے میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ان تین عقیدوں پر ایمان رکھنے کے علاوہ بعض اور امور ہیں جن کو ضروریات دین کہتے ہیں، مسلمان کہلانے کا حقدار بننے کے لیے ان کی تکمیل ضروری ہے ان ضروریات کے تعین اور شمار کے لیے مجھے دو دن چاہئیں۔لیکن مثال کے طور پر میں یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ احترام کلام اللہ، وجوب نماز، وجوب روزہ، وجوب حج مع الشرائط اور دوسرے بے شمار امور ضروریات دین میں شامل ہیں۔

مولانا عبدالحامد بدایونی، صدر جمعیت العلمائے پاکستان۔

سوال۔آپ کے نزدیک مسلمان کون ہے؟

جواب۔جو شخص ضروریات دین پر ایمان رکھتا ہے وہ 'مومن' ہے اور ہر مومن مسلمان کہلانے کا حقدار ہے۔

سوال۔ضروریات دین کونسی ہیں؟

جواب۔جو شخص پنج ارکان اسلام پر اور ہمارے رسول پاک صلعم پر ایمان رکھتا ہے وہ ضروریات دین کو پورا کرتا ہے۔

سوال۔آیا ان پنج ارکان اسلام کے علاوہ دوسرے اعمال کا بھی اس امر سے کوئی تعلق ہے کہ کوئی شخص مسلمان ہے یا دائرہ اسلام سے خارج ہے؟

(نوٹ) گواہ کو سمجھا دیا گیا تھا کہ دوسرے اعمال سے وہ ضوابط اخلاقی مراد ہیں جو زمانہ حاضر کے معاشرے میں صحیح سمجھے جاتے ہیں)

جواب۔یقیناً تعلق ہے۔

سوال۔پھر آپ ایسے شخص کو مسلمان نہیں کہیں گے جو ارکان خمسہ اور رسالت پیغمبر اسلام پر تو ایمان رکھتا ہے لیکن دوسرے لوگوں کی چیزیں چرا لیتا ہے جو مال اس کے سپرد کیا جائے اس کو غبن کر لیتا ہے۔اپنے ہمسائے کی بیوی کے متعلق نیت بد رکھتا ہے اور اپنے محسن سے انتہائی ناشکری کا مرتکب ہوتا ہے؟

جواب۔ایسا شخص اگر ان عقیدوں پر ایمان رکھتا ہے جو بھی بیان کیے گئے ہیں تو ان تمام اعمال کے باوجود وہ مسلمان ہوگا۔

مولانا محمد علی کاندھلوی دارالشہابیہ۔سیالکوٹ :۔

سوال۔از راہ کرم مسلمان کی تعریف کیجیے؟

جواب۔جو شخص نبی کریم صلعم کے احکام کی تعمیل میں تمام ضروریات دین کو بجالاتا ہے وہ مسلمان ہے۔

سوال۔کیا آپ ضروریات دین کی تعریف کر سکتے ہیں؟

جواب۔ضروریات دین ہر مسلمان کو معلوم ہیں خواہ وہ دینی علم نہ رکھتا ہو۔

سوال۔کیا آپ ضروریات دین کو شمار کر سکتے ہیں؟

جواب۔وہ اتنی شمار میں ہیں کہ ان کا ذکر بے حد دشوار ہے میں ان ضروریات کو شمار نہیں کر سکتا بعض ضروریت دین کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔مثلاً صلوۃ،صوم وغیرہ۔

مولانا امین احسن اصلاحی :۔

سوال۔مسلمان کون ہے؟

جواب۔مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک سیاسی مسلمان دوسرے حقیقی مسلمان سیاسی مسلمان کہلانے کی غرض سے ایک شخص کے لیے ضروری ہے کہ

(۱) توحید الٰہی پر ایمان رکھتا ہو۔

(۲) ہمارے رسول پاک کو خاتم النبین مانتا ہو یعنی اپنی زندگی کے متعلق تمام معاملات میں ان کو آخری سند تسلیم کرتا ہو۔

(۳) ایمان رکھتا ہو کہ ہر خیر و شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

(۴) روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔

(۵) قرآن مجید کو آخری الہام الٰہی یقین کرتا ہو۔

(۶) مکہ معظمہ کا حج کرتا ہو

(۷) زکوۃ ادا کرتا ہو۔

(۸) مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتا ہو۔

(۹) اسلامی معاشرے کے ظاہر قواعد کی تعمیل کرتا ہو۔

(۱۰) روزہ رکھتا ہو۔

جو شخص ان تمام شرائط کو پورا کرتا ہو وہ ایک اسلامی مملکت کے پورے شہری کے حقوق کا مستحق ہے۔ اگر وہ ان میں سے کوئی ایسی شرط پوری نہ کرے گا تو وہ سیاسی مسلمان نہ ہوگا (پھر کہا) اگر کوئی شخص ان دس امور پر ایمان کا محض اقرار ہی کرتا ہو۔ گو ان پر عمل کرتا ہو یا نہ کرتا ہو تو یہ اس کے مسلمان ہونے کے لیے کافی ہے۔

حقیقی مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالی اور رسول اللہ کے تمام احکام پر عین اس طرح ایمان رکھتا ہو اور عمل کرتا ہو جس طرح وہ احکام وہدایت اس پر عائد کیے گئے ہیں۔

سوال۔ کیا آپ یہ کہیں گے کہ صرف حقیقی مسلمان ہی مرد صالح ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

338

سوال۔ اگر ہم آپ کے ارشاد سے یہ سمجھیں کہ آپ کے نزدیک سیاسی مسلمان کہلانے کے لیے صرف عقیدہ کافی ہے اور حقیقی مسلمان بننے کے لیے عقیدے کے علاوہ عمل بھی ضروری ہے تو کیا آپ کے نزدیک ہم نے آپ کا مفہوم صحیح طور پر سمجھا ہے؟

جواب۔ جی نہیں آپ میرا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھے سیاسی مسلمان کے معاملے میں بھی عمل ضروری ہے میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان عقائد کے مطابق عمل نہیں کرتا جو ایک سیاسی مسلمان کے لیے ضروری ہیں تو وہ سیاسی مسلمانوں کے دائرے سے خارج ہو جائے گا۔

سوال۔ اگر کوئی سیاسی مسلمان ان باتوں پر ایمان نہ رکھتا ہو جن کو آپ نے ضروری بتایا ہے تو کیا آپ اس شخص کو 'بے دین' کہیں گے؟

جواب۔ جی نہیں میں اس محض 'بے عمل' کہوں گا۔

صدر انجمن احمدیہ ربوہ کی طرف سے جو تحریری بیان پیش کیا گیا۔ اس میں مسلم کی تعریف یہ کی

گئی کہ مسلم وہ شخص ہے جو رسول پاک صلعم کی امت سے تعلق رکھتا ہے اور کلمہ طیبہ پر ایمان کا اقرار کرتا ہے۔

ان متعدد تعریفوں کو جو علماء نے پیش کی ہیں پیش نظر رکھ کر کیا ہماری طرف سے کسی تبصرے کی ضرورت ہے؟ بجز اس کے کہ دین کے کوئی دو عالم بھی اس بنیادی امر پر متفق نہیں ہیں اگر ہم اپنی طرف سے ''مسلم'' کی کوئی تعریف کر دیں جیسے ہر عالم دین نے کی ہے اور وہ تعریف ان تعریفوں سے مختلف ہو جو دوسروں نے پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائیگا۔ اور اگر ہم علما میں سے کسی ایک کی تعریف کو اختیار کر لیں تو ہم اس عالم کے نزدیک تو مسلمان رہیں گے لیکن دوسرے تمام علما کی تعریف کے رو سے کافر ہو جائیں گے۔

ارتداد

اسلامی مملکت میں ارتداد کی سزا موت ہے۔ اس پر علما عملاً متفق الرائے ہیں (ملاحظہ ہوں مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت العلمائے پاکستان پنجاب، مولانا احمد علی صدر جمعیت العلمائے مغربی پاکستان، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بانی و سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان، مفتی محمد ادریس جامعہ اشرفیہ لاہور ورکن جمعیۃ العلمائے پاکستان، مولانا داؤد غزنوی صدر جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان، مولانا عبدالحلیم قاسمی جمعیۃ العلمائے اسلام پنجاب اور مسٹر ابراہیم علی کی شہادتیں) اس عقیدے کے مطابق چوہدری ظفر اللہ خان نے اگر اپنے موجودہ مذہبی عقائد ورثے میں حاصل نہیں کیے بلکہ وہ خود اپنی رضامندی سے احمدی ہوئے تھے تو ان کو ہلاک کر دینا چاہیے اور اگر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری یا مرزا رضا احمد خان بریلوی یا ان بے شمار علماء میں سے کوئی صاحب (جو فتوے (EX.D.E 14) کے خوبصورت درخت کے ہر پتے پر مرقوم دکھائے گئے ہیں) ایسی اسلامی مملکت کے رئیس بن جائیں تو یہی انجام دیو بندیوں اور وہابیوں کا ہوگا۔ جن میں مولانا محمد شفیع دیو بندی ممبر بورڈ تعلیمات اسلامی ملحقہ دستور ساز اسمبلی پاکستان اور مولانا داؤد غزنوی

بھی شامل ہیں۔اور اگر مولانا محمد شفیع دیو بندی رئیس مملکت مقرر ہو جائیں تو وہ ان لوگوں کو جنہوں نے دیو بندیوں کو کافر قرار دیا ہے۔دائرہ اسلام سے خارج قرار دینگے اور اگر وہ لوگ مرتد کی تعریف میں آئیں گے یعنی انہوں نے اپنے مذہبی عقائد ورثے میں حاصل نہ کیے ہوں گے ۔ بلکہ خود اپنا عقیدہ بدل لیا ہوگا۔تو مفتی صاحب ان کو موت کی سزا دے دیں گے۔

جب دیو بندیوں کا ایک فتویٰ (Ex.D.E 13) جس میں اثنا عشری شیعوں کو کافر و مرتد قرار دیا گیا ہے،عدالت میں پیش ہوا تو کہا گیا کہ اصلی نہیں بلکہ مصنوعی ہے لیکن جب مفتی محمد شفیع نے اس امر کے متعلق دیو بند سے استفسار کیا تو اس درالعلوم کے دفتر سے اس فتوے کی ایک نقل موصول ہو گئی جس پر دارالعلوم کے تمام اساتذہ کے دستخط ثبت تھے۔اور ان میں مفتی محمد شفیع صاحب کے دستخط بھی شامل تھے۔اس فتوے میں لکھا ہے کہ جو لوگ حضرت صدیق اکبرؓ کی صحابیت پر ایمان نہیں رکھتے، جو لوگ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے قاذف ہیں اور جو لوگ قرآن میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں،وہ کافر ہیں۔مسٹر ابراہیم علی چشتی نے بھی جنہوں نے مطالعہ کیا ہے اور اپنے مضمون سے باخبر ہیں۔ اس رائے کی تائید کی ہے،ان کے نزدیک شیعہ اپنے اس عقیدے کی وجہ سے کافر ہیں کہ حضرت علیؓ نبوت میں ہمارے رسول پاکؐ کے شریک تھے۔مسٹر چشتی نے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کیا ہے کہ اگر کوئی سنی اپنا عقیدہ بدل کر شیعوں ہم خیال ہو جائے تو آیا وہ اس ارتداد کا مرتکب ہوگا جس کی سزا موت ہے۔

شیعوں کے نزدیک تمام سنی کافر ہیں اور اہل قرآن یعنی وہ لوگ جو حدیث کو غیر معتبر سمجھتے ہیں اور واجب التعمیل نہیں مانتے متفقہ طور پر کافر ہیں۔اور یہی حال آزاد مفکرین کا ہے۔اس تمام بحث کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ شیعہ،سنی،دیو بندی،اہل حدیث اور بریلوی لوگوں میں سے کوئی بھی مسلم نہیں اور اگر مملکت کی حکومت ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو دوسری جماعت کو کافر سمجھتی ہے تو جہاں کوئی شخص ایک عقیدے کو بدل کر دوسرا اختیار کرے گا۔اس کو اسلامی مملکت میں لازماً موت کی سزا دی جائے گی۔اور جب یہ حقیقت مد نظر رکھی جائے کہ ہمارے سامنے مسلم کی تعریف کے معاملے میں کوئی دو عالم بھی متفق الرائے نہیں ہو سکے تو اس عقیدے کے نتائج کا قیاس کرنے کے لیے کسی خاص قوت

متخیلہ کی ضرورت نہیں۔ اگر علماء کی پیش کی ہوئی تعریفوں میں سے ہر تعریف کو معتبر سمجھا جائے پھر انہیں تحلیل وتحویل کے عقائد کے ماتحت لایا جائے اور نمونے کے طور پر الزام کی وہ شکل اختیار کی جائے جو گلیلیو کے خلاف انکویزیشن کے فیصلے میں اختیار کی گئی تھی تو ان وجوہ کی تعداد بے شمار ہو جائے گی جن کی بنا پر کسی شخص کا ارتداد ثابت کیا جا سکے۔

اس رپورٹ کے کسی سابقہ حصے میں ''الشہاب'' کی ضبطی کا حوالہ دیا گیا تھا۔ یہ کتابچہ مولانا شبیر احمد عثمانی کا لکھا ہوا تھا جو بعد میں پاکستان کے شیخ الاسلام بن گئے تھے۔ اس کتابچے میں مولانا نے قرآن، سنت، اجماع اور قیاس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام میں ارتداد کی سزا موت ہے۔ اس دینیاتی عقیدے کو پیش کرنے کے بعد مولانا نے اس کتابچے میں بطور بیان واقعہ یہ لکھا تھا کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور بعد کے خلفا کے زمانوں میں عرب کے وسیع رقبے بارہا مرتد کے خون سے رنگین ہوئے۔

یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم اس عقیدے کی صحت یا عدم صحت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں لیکن یہ جانتے ہوئے کہ حکومت پنجاب کے پاس اس کتابچے کی ضبطی کی تجویز وزیر داخلہ نے بھیجی تھی۔ ہم اپنے آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر حکومت نے ایسا قدم کیوں اٹھایا جس سے ایک ایسے عقیدے کی مذمت لازم آئی جو مولانا کے دعوے کے مطابق قرآن اور سنت سے اخذ کیا گیا تھا۔ ارتداد کے لیے سزائے موت بہت دوررس متعلقات کی حامل ہے اور اس سے اسلام مذہبی جنونیوں کا دین ظاہر ہوتا ہے جس میں حریت فکر مستوجب سزا ہے۔ قرآن تو بار بار عقل وفکر پر زور دیتا ہے لیکن ارتداد کے متعلق جو عقیدہ اس کتابچے میں پیش کیا گیا ہے وہ آزادی فکر کی جڑ پر ضرب لگا رہا ہے۔ کیونکہ اس میں یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ جو شخص پیدائشی مسلمان ہو یا خود اسلام قبول کر چکا ہو وہ اگر اس خیال سے مذہب کے موضوع پر فکر کرے کہ جو مذہب اسے پسند آئے۔ اس کو اختیار کر لے وہ سزائے موت کا مستوجب ہوگا۔ اس اعتبار سے اسلام کامل ذہنی فالج کا پیکر بن جاتا ہے اور اگر اس کتابچہ کا یہ بیان صحیح ہے کہ عرب کے وسیع رقبے بارہا انسانی خون سے رنگین ہوئے تھے تو اس سے یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ عین اس زمانے میں بھی جب اسلام عظمت وشوکت کے نقطۂ عروج پر تھا اور پورا عرب

جہاد

اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ جن مسائل پر مسلمانوں اور احمدیوں کے درمیان اختلاف ہے ان میں ایک جہاد بھی ہے۔ اس عقیدے سے بے شمار دوسرے متعلقہ امور سامنے آتے ہیں مثلاً غازی شہید، جہاد بالسیف، جہاد فی سبیل اللہ، دارالاسلام، دارالحرب، ہجرت، غنیمت، خمس اور غلامی کے معنی کیا ہیں اور یہ تصورات زمانۂ حاضر کے بین الاقوامی مسائل مثلاً جارحیت، قطع نسل، بین الاقوامی فوجداری کا دائرہ اثر، بین الاقوامی معاہدے اور بین الاقوامی قانون عامہ کے قواعد سے کس حد تک متصادم ہوتے ہیں اور کس حد تک ان میں تطابق ہوسکتا ہے۔

اسلامی مملکت دارالاسلام ہے یعنی وہ ملک جس میں اسلام کے احکام نافذ ہوں اور جس کا حاکم مسلمان ہو۔ دارالاسلام کے باشندے مسلمان بھی ہوتے ہیں اور وہ غیر مسلم بھی جنھوں نے مسلم اقتدار کے سامنے گردن اطاعت جھکا دی ہو۔ اور جن کو مملکت اسلامی نے بعض قیود کے ماتحت اور شہریت کاملہ حاصل ہونے کے امکان کے بغیر ان کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے دی ہو۔ لیکن ان کا اہل کتاب ہونا ضروری ہے۔ وہ بت پرست ہرگز نہ ہوں۔ مملکت اسلامی نظریاتی اعتبار سے اپنے ہمسایہ غیر مسلم ملک سے دائمی برسر جنگ رہتی ہے۔ کیونکہ ممکن ہے وہ کسی وقت دارالحرب بن جائے۔ اگر ایسا ہو تو اس ملک کے مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ اسے چھوڑ کر اپنے برادران دینی کے ملک میں چلے آئیں۔ ہم نے یہ پہلو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے ذیل کے خیالات ظاہر کیے:۔

سوال۔ جو ملک دارالاسلام کی سرحد پر واقع ہو کیا وہ ایک اسلامی مملکت کے مقابلے میں ہمیشہ دارالحرب کی حیثیت رکھتا ہے؟

جواب۔ جی نہیں، اگر دونوں کے درمیان کوئی مصالحت کا معاہدہ موجود نہ ہو تو اسلامی مملکت بالقوۃ اپنے غیر مسلم ہمسایہ ملک سے برسر جنگ رہے گی کوئی غیر مسلم ملک صرف اس صورت میں دارالحرب کی حیثیت اختیار کرتا ہے جب اسلامی مملکت اس کے خلاف رسمی حیثیت سے

اعلان جنگ کردے۔

غیاث اللغات کی رو سے دارالحرب کافروں کا وہ ملک ہے جس کو اسلام نے مطیع نہ کیا ہو کسی ملک کے دارالحرب بننے کے نتائج مختصراُانسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں یوں بیان کیے گئے ہیں:۔

’’جب کوئی ملک دارالحرب بن جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس میں سے نکل جائیں اور جو بیوی اس وقت اپنے شوہر کا ساتھ دینے انکار کریگی اس پر خود بخود طلاق واقع ہو جائے گی‘‘۔

پس اگر ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ ہو جائے اور پاکستان اس وقت اسلامی مملکت ہو تو اسے سرحد پار سے چار کروڑ مسلمانوں کے استقبال کے لیے تیار رہنا چاہیے اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحامد بدایونی کے نزدیک بحالت موجودہ بھی مسلمانان ہند ہجرت کر سکتے ہیں۔اس معاملے میں ان کی رائے یہ ہے۔

’’سوال: کیا آپ پاکستان میں اپنے نقل مکانی کو مذہبی مفہوم کے اعتبار سے ہجرت کہیں گے؟

جواب: جی ہاں‘‘

اب ہم عنقریب یہ بتائیں گے کہ مرزا غلام احمد نے جہاد کی جو توجیہہ کی ہے وہ ان کے اور ان کی جماعت کے کفر کی وجہ کیوں بتائی جاتی ہے لیکن اس سے قبل ہم یہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمان اب تک جہاد کا کیا مطلب سمجھتے رہے ہیں اور آج کیا سمجھتے ہیں، جہاد کے متعلق مختلف نظریے رائج ہیں مثلاً ایک تو کسی مذہبی جنونی کا خام تصور ہے کہ وہ مذہبی جوش میں سرشار ہو کر تلوار ہاتھ میں لے۔ بلا امتیاز غیر مسلموں کا قتل عام کرتا پھرے۔اور یقین رکھے کہ اگر وہ اس جنگ میں مارا گیا تو شہید ہوگا اور اگر اس قتل وخون میں کامیاب ہوا تو غازی کا رتبہ حاصل کرے گا۔ایک انتہا تو یہ ہے اور دوسری طرف یہ تصور بھی موجود ہے کہ مسلمان کی پوری زندگی کفر کا مقابلہ کرنے کے لیے وقف ہے(یہاں کفر خطا و شر کے معنی میں استعمال ہوا ہے) لہٰذا مسلمان کی زندگی میں سب سے بڑی سرگرمی یہ ہے کہ وہ دلیل و برہان کی مدد سے اور جہاں ضروری ہو وہاں قوت سے کام لے کر اسلام کو پھیلائے۔ تا آنکہ وہ عالمگیر مذہب بن جائے۔ آخر الذکر (یعنی قوت کے استعمال میں) حالت میں

وہ کسی شخصی غرض سے جنگ نہیں کرتا بلکہ اس جدوجہد کو اپنا فرض سمجھتا ہے جو اللہ نے اس پر عائد کیا ہے اور جس کی بجا آوری کی واحد جزا ذات باری تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ مختصر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں ''جہاد'' کے متعلق مندرجہ ذیل مختصر مقالہ درج ہے:۔

''جہاد: (عربی) جنگ مقدس اسلحہ کے زور سے اسلام کی اشاعت مسلمانوں کا علی العموم مذہبی فریضہ ہے۔ یہ اسلام کا چھٹا رکن بنتے بنتے رہ گیا۔ لیکن خارجیوں کے اولاد واحفاد اسے حقیقتاً چھٹا رکن تسلیم کرتے ہیں۔ مسلمان اس موقف پر تدریجی طور پر لیکن سرعت کے ساتھ پہنچ گئے۔ قرآن کی مکی سورتوں میں حملے کے مقابلے میں صبر کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن مدینہ میں حملے کے دفاع کا حق قائم ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ اہل مکہ کے خلاف لڑنا اور ان کو مطیع کرنا فرض عین قرار پا گیا۔ ممکن ہے اس میں کوئی شبہ کی گنجائش ہو کہ آیا (حضرت) محمد (صلعم) خود اس امر کو تسلیم کرتے تھے کہ انہیں اپنے منصب کے اعتبار سے کافروں کی دنیا کے خلاف مستقل طور پر اور بلا وجہ اشتعال جنگ جاری رکھنی چاہیے۔ تا آنکہ وہ اسلام کی مطیع مغلوب ہو جائے۔ احادیث اس امر کے متعلق واضح ہیں۔ لیکن قرآن کی آیات میں ہمیشہ ان کفار کا ذکر آتا ہے جن کو اس لیے مطیع کرنا ضروری ہے کہ وہ خطرناک اور بے ایمان ہیں۔ لیکن حضرت نے آس پاس کی حکومتوں کو جو مکتوب لکھے۔ ان سے ظاہر ہے کہ آپ کے ذہن میں ایسے عالمگیر موقف کا تصور بالکل روشن تھا۔ اور آپ کے انتقال کے بعد یقیناً وہ تصور فی الفور عروج پا گیا اور مسلمان فوجیں عرب کی حدود سے پار پیش قدمی کرنے لگیں۔ لیکن اب جہاد فرض علے الکفایہ ہے جو ان تمام مسلمانوں پر علی العموم عائد ہوتا ہے۔ جو مرد ہوں آزاد ہوں بالغ ہوں جسمانی اور ذہنی اعتبار سے صحیح العقل ہوں اور مسلمان فوج تک پہنچنے کی ضروری استطاعت رکھتے ہوں۔ یہ فرض لازماً ہر فرد پر عائد نہیں ہوتا۔ لیکن جب ایک خاص تعداد اس فرض کو ادا کر دے تو اس کی بجا آوری کافی سمجھی جاتی ہے پس جہاد اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک پوری دنیا اسلام کے زیر نگیں نہ ہو جائے۔ جہاد کی نگرانی اور قیادت کسی مسلمان حکمران یا امام کے ہاتھ

346

کہ ہندوستان میں نام نہاد معتزلی اور ترکی میں نوجوان ترک اس کے منکر ہیں۔ اور اساس جہاد کی توضیح کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن مسلمان عوام اب تک ائمہ شریعت کی متفقہ آواز کی پیروی کرتے ہیں۔ اگر عقیدہ جہاد کو خارج کر دیا جائے تو اسلام میں کچھ باقی نہیں رہتا۔''

عام طور پر مسلمہ رائے یہ ہے کہ سورہ توبہ (سورہ ۹) کی پانچویں آیت نے ان مکی آیات کو منسوخ کر دیا جن میں صرف دفاع کے لیے کفار کے خلاف قتال کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کے برعکس احمدیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت کسی دوسری آیت کو منسوخ نہیں کرتی اور دونوں قسم کی آیات یعنی مکی آیات اور سورہ توبہ کی متعلقہ آیات کے دائرے مختلف ہیں۔ چنانچہ وہ پہلو بہ پہلو چل سکتی ہیں۔ اس سے ناسخ و منسوخ اور اس کے اثرات نتائج کی مشکل بحث شروع ہو جاتی ہے۔ احمدیوں کی طرف سے یہ استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ ناسخ و منسوخ کا عقیدہ اس عقیدے کے منافی ہے کہ قرآن مجید لوح محفوظ میں تمام و کمال موجود ہے۔ اس عقیدے (ناسخ و منسوخ) سے اس امر کا اعتراف لازم آتا ہے کہ منسوخ شدہ آیت کسی خاص موقع کے لیے اتری تھی اور اس موقع پر اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد بیکار ہوگئی۔ گویا اللہ تعالیٰ کو بعد میں پیش آنے والے واقعات کا علم نہیں تھا جس سے وہ آیت بیکار ہو جانے والی تھی یا اس کا کوئی ناپسندیدہ نتیجہ نکلنے والا تھا۔ اس عقیدے کا تیسرا نتیجہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے اس دعوے کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ اسلام کے قوانین ناقابل تغیر اور بے لچک ہیں۔ کیونکہ اگر بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے ایک نیا الہام ضروری ہو جاتا ہے۔ تو الہام کی تکمیل کے بعد حالات میں جو تغیرات ہونگے وہ زیادہ تر الہامات کو بیکار اور متروک بنا دینگے۔ ہم اس مباحثے کے مالہ و ماعلیہ پر اپنی رائے ظاہر نہیں کر سکتے لیکن یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مختصر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالے سے اور بعض دوسری پیش شدہ تحریرات سے جن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی کتابیں بھی شامل ہیں عقیدہ جہاد کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ اسلام اسلحہ اور فتوحات کے زور سے پھیلا ہے۔

اب جارحیت اور نسل کشی انسانیت کے خلاف جرائم قرار پا چکے ہیں اور انہی جرائم کی بنا پر نیورمبرگ اور ٹوکیو کی مختلف بین الاقوامی عدالتوں نے جرمنی اور جاپان کے ارباب جنگ کو موت کی

سزائیں دی ہیں۔ ایک طرف جارحیت اور نسل کشی کے جرائم ہیں اور دوسری طرف یہ عقیدہ کہ اسلام بزور شمشیر اور بزور فتوحات پھیلا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ نسل کشی کے متعلق عنقریب ایک بین الاقوامی میثاق مرتب ہونے والا ہے لیکن اگر جہاد کا وہ نظریہ درست ہے جو ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے تو پاکستان اس میثاق میں ہرگز حصہ نہیں لے سکتا۔ مکی سورتوں کی مندرجہ ذیل آیات میں وہ بلندترین اور پاکیزہ اصول پیش کیا گیا ہے جس کا دھندلا سا تصور اب کہیں جا کر بین الاقوامی قانون دانوں کو نظر آنے لگا ہے لیکن ہم برابر یہی تلقین کر رہے ہیں۔ کہ جارحیت اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

سورہ۲: آیات ۱۹۰و۱۹۳

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلو نکم ولا تعتد وا ان اللہ لا یحب المعتدین ٥وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ و یکون الدین للہ فان انتھوا فلا عد و ان الا علی الظالمین٥

ترجمہ۔ اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد سے نہ نکلو واقعی اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فساد باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے اور اگر وہ لوگ باز آجائیں تو سختی کسی پر نہیں ہوسکتی سوائے بے انصافی کرنے والوں کے۔

سورہ۲۲: ۳۹۔۴۰

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا ط و ا ن اللہ علیٰ نصر ھم لقدیر ٥ نِ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الآ ان یقولو ربنااللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بیع و صلوت و مساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ط ولینصرن اللہ من ینصرہ ط ان اللہ لقوی عزیز٥

ترجمہ۔ ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے جن سے لڑائی کی گئی۔ کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ اور یقیناً اللہ ان کو غالب کردینے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جو اپنے گھروں سے

بلا وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کا ایک کا دوسرے سے زور نہ گھٹا تا رہتا تو صومع خلوت خانے ، عبادت خانے اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہو گئے ہوتے ۔ بیشک اللہ اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرے گا۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ قوت والا اور غلبے والا ہے۔

شریعت اسلامی کی ایک اور شاخ ''قانون اسیران جنگ'' ہے۔ اس کا بھی بین الاقوامی قانون سے تصادم یقینی ہے مثلاً اسیران جنگ کے ساتھ سلوک کے بارے میں ہمیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ان خیالات کی پابندی کرنی ہوگی جو قرآن وسنت پر مبنی بتائے جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

''سوال:۔ کیا اسلام میں کوئی قانون جنگ بھی موجود ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال: کیا وہ قانون زمانہ حاضر کے بین الاقوامی جنگ سے بنیادی طور پر مختلف ہے؟

جواب۔ یہ دونوں نظام ایک بنیادی فرق پر مبنی ہیں۔

سوال: جو غیر مسلم کسی جہاد میں اسیران جنگ بن کر آئیں ان کے حقوق کیا ہیں؟

جواب۔ اس مسئلے میں اسلامی قانون یہ ہے کہ اگر وہ ملک جس کے یہ قیدی باشندے ہوں ان کا فدیہ (معاوضہ) ادا کر دے تو وہ رہا کر دیے جائیں۔ قیدیوں کے تبادلہ کی بھی اجازت ہے اگر ان دونوں متبادل صورتوں میں سے کوئی بھی ممکن نہ ہو تو قیدی ہمیشہ کے لیے غلام بنا لیے جائیں۔ اگر ایسا کوئی شخص اپنی کمائی میں سے اپنا فدیہ ادا کرنے کی پیشکش کرے تو اس کو فدیے کے لیے رقم فراہم کرنے کی اجازت دے دی جائے۔

سوال: آیا آپ کا خیال یہ ہے کہ جب تک حکومت ایک اسلامی حکومت کی شکل اختیار نہ کر لے اس وقت تک اس کی طرف سے اعلان کردہ جنگ 'جہاد' نہ سمجھی جائے؟

جواب: جی نہیں اگر مسلمانوں کی قومی حکومت مملکت کے جائز مفادات کے لیے جنگ کا اعلان کرے تو اس کو جہاد کہا جا سکتا ہے۔ جو رائے (Ex.D.D 12) میں مجھ سے منسوب کی گئی ہے۔ وہ میں نے کبھی ظاہر نہیں کی:۔

جواب۔ جی ہاں۔

سوال:۔ اگر وہ قانون بین الاقوامی قانون سے متصادم ہو۔ تو آپ کس قانون کی پیروی کریں گے؟

جواب۔ اسلامی قانون کی۔

سوال:۔ پھر آپ ازراہ کرم یہ بیان کیجیے کہ آپ کا لشکر جن اشخاص کو جنگی قیدیوں کی حیثیت سے گرفتار کرے گا۔ ان کی حیثیت کی ہوگی؟

جواب۔ میں اس کا فی البدیہ جواب نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے مجھے مسئلے کا مطالعہ کرنا ہوگا"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر غنیمت اور خمس کو جہاد کا لازمی جزو سمجھا جائے تو بین الاقوامی معاشرہ اس کو محض لوٹ اور رہزنی قرار دیگا۔

غیر مسلم مملکتوں کے مسلمانوں کا ردعمل

جس نظریہ کی بنا پر پاکستان میں اسلامی مملکت کی بنیاد رکھنے کی خواہش کی جاتی ہے۔ اس کے بعض نتائج ان مسلمانوں پر ضرور اثر انداز ہوں گے جو غیر مسلم حکمرانوں کے ماتحت ممالک میں آباد ہیں۔ ہم نے امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری سے سوال کیا کہ آیا ایک مسلمان ایک غیر مسلم مملکت کی وفادار رعایا ہو سکتا ہے۔ ان کا جواب ذیل میں درج ہے۔

سوال:۔ کیا آپکی رائے میں ایک مسلمان ایک کافر حکومت کے احکام کی تعمیل کا پابند ہو سکتا ہے؟

جواب۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم حکومت کا وفادار ہو۔

سوال: کیا چار کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنی مملکت کے وفادار شہری ہوں؟

جواب۔ جی نہیں۔

یہ جواب اس نظریے کے بالکل مطابق ہے جو ہمارے سامنے پرزور طریق پر پیش کیا گیا ہے لیکن اگر پاکستان کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے دستور کی بنیاد مذہب پر رکھے تو یہی حق ان ملکوں کو بھی دینا ہوگا جن میں مسلمان کافی بڑی اقلیتوں پر مشتمل ہیں یا جو کسی ایسے ملک میں غالب اکثریت رکھتے ہیں جن میں حاکمیت کسی غیر مسلم قوم کو حاصل ہے۔ لہٰذا ہم نے مختلف علماء سے یہ سوال کیا کہ اگر پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ شہریت کے معاملات میں مسلموں سے مختلف سلوک کیا جائے تو کیا علماء کو اس امر پر کوئی اعتراض ہوگا۔ کہ دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ روا رکھا جائے اس سوال کے جوابات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت العلما پاکستان

سوال: کیا آپ ہندوؤں کا جو ہندوستان میں اکثریت رکھتے ہیں۔ یہ حق تسلیم کرینگے کہ وہ اپنے ہاں ہندو دھرم کے ماتحت مملکت قائم کرلیں؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال: اگر اس نظام حکومت میں منو شاستر کے ماتحت مسلمانوں سے ملیچھوں یا شودروں کا سلوک کیا جائے تو کیا آپکو کوئی اعتراض ہوگا؟

جواب:۔ جی نہیں''

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

سوال۔ اگر ہم پاکستان میں اس شکل کی اسلامی حکومت قائم کرلیں تو کیا آپ ہندوؤں کو اجازت دینگے کہ وہ اپنے دستور کی بنیاد اپنے مذہب پر رکھیں؟

جواب۔ یقیناً مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ حکومت کے اس نظام میں مسلمانوں سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے۔ ان پر منو کے قوانین کا اطلاق کیا جائے۔ اور انہیں حکومت میں حصہ اور شہریت کے حقوق قطعاً نہ دیے جائیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی ہندوستان میں صورت حالات یہی ہے''۔

353

امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری

سوال۔ ہندوستان میں کتنے کروڑ مسلمان آباد ہیں؟

جواب۔ چار کروڑ

سوال۔ کیا آپ کو اس امر پر اعتراض ہوگا کہ ان پر منو کے قوانین عائد کیے جائیں جن کے ماتحت انہیں کوئی شہری حق حاصل نہ ہوگا۔ اور ان سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے گا؟

جواب۔ میں پاکستان میں ہوں اور ان کو مشورہ نہیں دے سکتا''

میاں طفیل محمد (جماعت اسلامی)

سوال۔ دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کس قدر ہے؟

جواب۔ پچاس کروڑ۔

سوال:۔ اگر آپ کے قول کے مطابق مسلمانان عالم کی کل آبادی پچاس کروڑ ہے اور پاکستان، سعودی عرب، یمن، انڈونیشیا، مصر، ایران، شام، لبنان، شرق اردن، ترکی اور عراق کے مسلمانوں کی تعداد بیس کروڑ سے زیادہ نہیں تو کیا آپ کے نظریے کا یہ نتیجہ نہ ہوگا کہ تیس کروڑ مسلمانان عالم محض لکڑی کاٹنے اور پانی بھرنے والے بن جائیں گے؟

جواب۔ میرے نظریے کا اثر ان کی حیثیت پر نہ ہونا چاہیے۔

سوال۔ کیا اس حالت میں بھی کہ ان سے مذہبی بنا پر غیر مساوی سلوک کیا جائے اور معمولی حقوق شہریت سے بھی محروم کر دیا جائے؟

جواب۔ جی ہاں۔

اس گواہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم حکومت اپنے ملک کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو اسامیاں پیش بھی کرے تو ان کا فرض ہوگا کہ انکو قبول کرنے سے انکار کر دیں۔

354

ماسٹر تاج الدین انصاری

سوال۔ کیا آپ چار کروڑ مسلمانان ہند کے لیے بھی وہی نظریہ پسند کرینگے جو آپ پاکستان کے مسلمانوں کے لیے پیش کر رہے ہیں؟

جواب۔ وہ نظریہ اختیار کرنے کے بعد تو وہ ایک منٹ کے لیے ہندوستان میں نہ رہ سکیں گے۔

سوال۔ کیا مسلمان کا نظریہ ہر مقام پر اور ہر وقت میں بدلتا رہتا ہے؟

جواب۔ جی نہیں۔

سوال۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانان ہند بھی وہی نظریہ اختیار نہ کریں جو آپ کا ہے؟

جواب۔ اس کا جواب انہی کو دینا چاہیے۔

ہمارے سامنے جس نظریے کی حمایت کی گئی ہے اس کو اگر ہندوستان کے مسلمان اختیار کر لیں تو وہ مملکت کے سرکاری عہدوں سے کاملاً محروم ہو جائیں گے اور صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی ان کا یہی حشر ہوگا جہاں غیر مسلم حکومتیں قائم ہیں۔ مسلمان ہر جگہ دائمی طور پر مشتبہ ہو جائیں گے اور فوج میں بھرتی نہ کیے جائیں گے کیونکہ اس نظریے کے مطابق کسی مسلم ملک اور کسی غیر مسلم ملک کے درمیان جنگ ہونے کی صورت میں غیر مسلم ملک کے مسلم سپاہیوں کے لیے کوئی چارہ نہیں کہ یا تو مسلم ملک کا ساتھ دیں یا اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں ہم نے اس مسئلے پر دو عالموں سے سوالات کیے۔ جن کے جوابات درج ذیل ہیں:-

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت العلمائے پاکستان

سوال:۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہونے کی صورت میں مسلمانان ہند کا فرض کیا ہوگا؟

جواب۔ ان کا فرض ظاہر ہے کہ انہیں ہمارا ساتھ دینا چاہیے۔ اور ہندوستان کی جانب سے ہمارے خلاف نہ لڑنا چاہیے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

سوال۔ ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ ہونے کی حالت میں مسلمانان ہند کا فرض کیا ہوگا؟

جواب۔ ان کا فرض ظاہر ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف نہ لڑیں اور نہ کوئی ایسا فعل کریں جو پاکستان کی سلامتی کے لیے مضر ہو۔

دوسرے اثرات

اسلامی مملکت کے دوسرے اثرات و نتائج یہ ہوں گے کہ ہر قسم کی سنگ تراشی، تاش بازی، تصویر کشی، انسانوں کی عکسی تصاویر، موسیقی، رقص، مخلوط اداکاری، سینما، تھیٹر سب کچھ بند کر دینا ہوگا۔ مولانا عبدالحلیم قاسمی نمائندہ جمعیت العلمائے پاکستان کا قول ملاحظہ ہو:۔

سوال: تشبیہ اور تمثیل کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ آپ مجھ سے کوئی معین سوال کیجیے۔

سوال۔ لہولعب کے متعلق آپ کا خیال کیا ہے؟

جواب۔ اس سوال کا جواب بھی وہی ہے جو دے چکا ہوں۔

سوال۔ انسانوں کی تصویر کھینچنے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اگر اس قسم کی تصویر کشی ضروری ہو جائے تو اس کے خلاف کچھ اعتراض نہیں۔

سوال۔ عکسی تصویر (فوٹوگرافی) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب میرا جواب وہی ہے جو تصویر کشی کے متعلق دے چکا ہوں۔

سوال۔ سنگتراشی بحیثیت فن کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب۔ یہ ہمارے مذہب میں ممنوع ہے۔

سوال۔ کیا آپ تاش بازی کو بھی لہولعب میں شمار کرتے ہیں؟

جواب۔ جی ہاں۔ یہ لہوولعب میں شامل ہے۔

سوال۔ رقص و موسیقی کے متعلق کیا خیال ہے؟

جواب۔ یہ ہمارے دین میں ممنوع ہیں۔

سوال۔ ڈراما اور اداکاری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ آپ کا مطلب کس قسم کی اداکاری سے ہے اگر

358

جواب۔ ایسی حالت میں فوجی سپاہی کو چاہیے کہ علما سے فتویٰ حاصل کرے۔

ہم نے اسلامی مملکت کے موضوع پر ذرا طویل بحث کی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم ایسی مملکت کی مخالفت یا حمایت میں کوئی مقالہ ضبط تحریر میں لانا چاہتے تھے۔ بلکہ ہمارا محض یہ مقصد تھا کہ اگر اس نظریاتی ابتری کے صحیح اسباب صریحاً معین نہ کیے گئے جس نے فسادات کی وسعت و شدت میں اضافہ کر دیا تھا تو ان بے شمار امکانات کی ایک واضح تصویر سامنے آ جائے، جو آئندہ واقع ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ابتری اور ژولیدگی موجود تھی۔ ورنہ مسلم لیگی جن کی اپنی حکومت برسر اقتدار تھی۔ اسکے خلاف کھڑے نہ ہو جاتے۔ سرکاری ملازموں کے دلوں سے وفاداری اور فرض عامہ کی بجا آوری کی حس رخصت نہ ہو گئی ہوتی۔ اور وہ اپنی ہی حکومت اور اپنے ہی افسروں کے خلاف دیوانوں کی طرح ہاؤ ہو نہ کرتے پھرتے۔ عام آدمیوں کے دل سے انسانی جان و مال کا احترام غائب نہ ہو گیا ہوتا اور وہ ضمیر کی کسی ملامت یا تامل کے بغیر آزادانہ لوٹ مار میں مصروف نہ ہو جاتے۔ ارباب سیاست ان لوگوں کا سامنا کرنے سے احتراز نہ کرتے جنھوں نے ان کو عہدوں پر فائز کیا تھا۔ اور نظم حکومت کے ذمہ دار واضح فرض کی بجا آوری میں تامل اور بے دلی محسوس نہ کرتے۔ ایک بات تو اس تحقیقات میں قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ اگر ایک دفعہ عوام کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ جو کچھ ان سے کہا جا رہا ہے وہ مذہبی اعتبار سے صحیح ہے یا مذہب نے اس کا حکم دیا ہے تو ان کو ہر عمل پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ جس میں وہ ضبط و نظم، وفاداری، شائستگی، اخلاق اور حس شہریت کے تمام مصالح کو آگ لگا دیں گے۔

عام آدمی پاکستان کو ایک اسلامی مملکت سمجھتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس عقیدے کو اس مسلسل چیخ پکار سے تقویت پہنچی ہے جو اسلام اور اسلامی مملکت کے متعلق قیام پاکستان کے وقت سے اب تک مختلف حلقوں کی طرف سے مچائی جا رہی ہے۔ اسلامی مملکت کے خواب نے ہر زمانے میں مسلمانوں کو پریشان کیا ہے اور یہ اس شاندار ماضی کی یاد کا نتیجہ ہے جب اسلام دنیا کے ایک دوردست گوشے یعنی عرب کے بیابانوں سے طوفان کی طرح اٹھا اور چشم زدن میں دنیا پر چھا گیا۔ اس نے ان دیوتاؤں کو جو ابتدائے آفرینش سے انسان پر حکومت کر رہے تھے۔ ان کی مسندوں سے اتار پھینکا، صدیوں کے قدیم ادارات اور اوہام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ ڈالا اور ان تمام تہذیبوں کا قلع قمع

کیے گئے۔ چونکہ خواجہ ناظم الدین نے علما کے ساتھ اکثر طویل گفتگوئیں کی ہیں۔ اس لیے سمجھ لینا چاہیے کہ دینی نقطہ نگاہ سے ان مطالبات کی صحت اور ان کے جواز کے مسئلے پر بھی ضرور بحث ہوئی ہوگی۔ خواجہ ناظم الدین ایک راسخ العقیدہ مذہبی آدمی ہیں۔ انہوں نے ان مطالبات کو بے تکلف مسترد نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی معقولیت سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں یہ بھی محسوس کرلیا ہوگا کہ مطالبات تو محض ''فانے کا پتلا سرا'' ہیں جو ٹھونکا جا رہا ہے اور اگر یہ اصول تسلیم کر لیا گیا کہ ایسے مذہبی مسائل کے متعلق بحث و فیصلہ مملکت کا کام ہے تو شاید انہیں اور بھی زیادہ دشوار مطالبات کا سامنا کرنا پڑے۔ انہوں نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ ان مطالبات کی تہہ میں ایک لازمی مفروضہ یہ تھا کہ ایک اسلامی مملکت میں مسلموں اور غیر مسلموں کے حقوق کے درمیان بنیادی فرق ہوگا اور اس قسم کی مملکت کے معمولی فرائض میں یہ فیصلہ کرنا بھی شامل ہوگا کہ فلاں فرد یا فلاں جماعت مسلمان ہے یا نہیں۔ چودھری ظفر اللہ خان اور دوسرے احمدیوں کو جو مملکت کے اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہیں، برطرف کرنے کا مطالبہ ایک اور پیچیدہ مسئلہ پیش کرتا تھا۔ چودھری ظفر اللہ خان بین الاقوامی دنیا میں نہایت مشہور و محترم شخصیت تھے۔ ان کی برطرفی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کی وسیع اشاعت ہوتی اور اس پر بین الاقوامی تبصرے کیے جاتے اور ایسی تصریح ح کرنا بے انتہا مشکل ہوجاتا جس سے بین الاقوامی شعور مطمئن ہوسکتا۔

قانون دستور کے ماتحت چودھری ظفر اللہ خان اور دوسرے احمدی عہدہ دار محض مذہبی عقائد کی بنا پر ملازمت سے علیحدہ نہیں کیے جاسکتے تھے کیونکہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۰ء ہی میں پاکستان کے شہریوں کے بنیادی حقوق کے متعلق ایک عبوری رپورٹ منظور کر چکی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر مستند شہری مذہب، نسل، ذات، جنس اور مقام ولادت کے امتیاز کے بغیر مملکت کی ملازمت میں تقرر کا حقدار ہے اور اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ آزاد ضمیر اور اپنے مذہب کے تسلیم تعمیل اور تبلیغ کا حق ہر شہری کے لیے محفوظ ہے۔ انجمن اقوام متحدہ (جس کا ممبر پاکستان بھی ہے) کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کے متعلق جو کمیشن مقرر کیا تھا اس نے انسانی حقوق کے بارے میں بین الاقوامی میثاق کا ایک مسودہ تیار کیا تھا۔ اس میثاق کی دفعہ ۱۳ کا منشا یہ ہے کہ ہر شخص کو فکر ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق ہوگا۔ جس میں اپنے مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اس مذہب یا عقیدے کو

تعلیم عمل عبادت اور ادائے رسوم میں ظاہر کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔ لہٰذا اگر یہ مطالبات منظور کر لیے جاتے تو بین الاقوامی حلقوں میں خاصا اضطراب پیدا ہو جاتا اور بین الاقوامی دنیا کی توجہ کسی نہ کسی طرح پاکستان کے واقعات کی طرف مبذول کرا دی جاتی۔ اور مطالبات کی منظوری گویا اس امر کا اعلان عام سمجھی جاتی کہ پاکستان اپنی شہریت کو ان وجوہ پر مبنی قرار دے رہا ہے جو دوسری قوموں کے مقابلے بنیادی طور پر مختلف ہیں اور غیر مسلم محض اپنے عقائد مذہبی کی بنا پر پاکستان میں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے سے محروم کیے جا رہے ہیں۔

ہندوستان پاکستان کو رسوا اور بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ لہٰذا وہ اس موقع سے بھی ضرور فائدہ اٹھاتا۔ ہندوستان میں بھی فرقہ وار مسئلہ موجود ہے وہ یقیناً پاکستان پر اس معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام عائد کرتا جو ۸ اپریل ۱۹۵۰ء کو حکومت ہند اور حکومت پاکستان کے درمیان قرار پایا تھا اور جس کے ماتحت دونوں حکومتوں نے اقلیتوں کے افراد کو اس امر کی ضمانت دی تھی کہ ان کو اپنے اپنے ملک کی پبلک زندگی میں حصہ لینے، سیاسی اور دوسرے عہدوں پر فائز ہونے اور سول محکموں مسلح فوجوں میں ملازمت کرنے کے حقوق اکثریتوں کے افراد کے بالکل مساوی اصل ہونگے اور یہ حقوق اس معاہدے میں بنیادی حقوق قرار دیے گئے تھے۔ اس معاہدے کی تکمیل کے وقت وزیر اعظم پاکستان نے اس قرارداد مقاصد کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی تھی اور کہا تھا کہ اس قرارداد کی رو سے اقلیتوں کو سول کے محکموں اور مسلح فوجوں میں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کی ضمانت حاصل ہے۔ لیکن اب اسی قرارداد مقاصد کو علما بطور دلیل قاطع اپنے اس دعوے کی تائید میں استعمال کر رہے تھے کہ ایک اسلامی مملکت میں مسلم اور غیر مسلم رعایا کے درمیان فرق و امتیاز قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق بنیادی ہے اور قرآن اور سنت کے مطابق احمدیوں کو جو غیر مسلم ہیں کسی اہم عہدے پر فائز ہونے کا حق نہیں۔

ہندوستان کو احمدی مذہب یا احمدیوں سے کوئی غرض نہ تھی نہ ایسے مذہبی جھگڑوں سے کوئی سروکار تھا جن سے وہ بعافیت گزر چکا ہے۔ لیکن وہ مطالبات کی منظوری کے نتائج کو ضرور فوراً محسوس کرتا اور صحیح طور یہ مقدمہ پیش کرتا کہ اگر احمدیوں کو مملکت میں سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کی

364

پولیس نے یہ سمجھا کہ گولی چلانا بالکل بند کر دیا جائے۔ لہٰذا بلوائی ہجوم نے کوتوالی کا محاصرہ کر رکھا اور ۶ مارچ کی صبح کو حکومت کی مشینری میں پورے سقوط کے آثار نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ حکومت نے طوائف الملوکی کے آگے کھلم کھلا ہتھیار ڈال دینے کا اعلان کر دیا۔ اس دن صبح کو چیف منسٹر کا بیان محض ''میکیاولیت'' کا ایک نمونہ تھا لیکن یہ چال کامیاب نہ ہو سکی۔ صورت حالات بالکل قابو سے باہر ہو گئی اور شہریوں نے محسوس کیا کہ ان کے جان و مال کو سخت خطرہ درپیش ہے۔ اب فوج زیادہ دیر تک انتظار نہ کر سکتی تھی چنانچہ اس نے شہر کا چارج لے لیا۔ خلاصہ یہ ہے۔ وہ کوائف جو مارشل لا کے اعلان کے باعث ہوئے حسب ذیل تھے۔

(۱) نظم حکومت کی مشینری کامل طور پر بے اثر ہو گئی۔ سول کی قوت بالکل ناکام ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت پنجاب نے ۶ مارچ کو مطالبات کی منظوری کا اعلان کر دیا۔

(۲) فساد و بدنظمی کی وسعت وشدت جس کی وجہ سے قوائے حکومت شل ہو گئے۔

(۳) بدنظمی کی وسعت وشدت براہ راست اس کیفیت کا نتیجہ تھی کہ حکومت کا احترام بالکل غائب ہو گیا تھا۔ مطالبات کو مذہبی شکل دے دی گئی تھی اور عوام میں یہ خیال وسیع پیمانے پر پھیلا دیا گیا تھا کہ احمدی رسول پاک صلعم کے مرتبہ عالی کو کم کر رہے ہیں اور اسلام کے ایک بنیادی عقیدے کو مضرت پہنچا رہے ہیں۔

(۴) کوئی شخص ان مطالبات کے نتائج وعواقب کا اندازہ نہ کرتا تھا اور اگر کسی کو ان کا اندازہ بھی تھا تو وہ ان کا اظہار عوام کے سامنے کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا کہ مبادا غیر ہر دلعزیز ہو جائے یا سیاسی حمایت کھو بیٹھے۔

(۵) یہ مطالبات بظاہر بہت معقول صورت میں پیش کیے گئے اور چونکہ ہر ایسی بات پر شدید زور دیا جاتا تھا جو کسی اعتبار سے اسلام یا اسلامی مملکت کے ساتھ بعید سے بعید تعلق بھی رکھتی ہو۔ لہٰذا کوئی شخص ان مطالبات کی مخالفت کا حوصلہ نہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ خود مرکزی حکومت نے بھی جس کے سامنے یہ تحریک کئی مہینے سے مع اپنے متعلقات ونتائج کے ظاہر تھی۔ اس موضوع پر ایک اعلان عام بھی جاری نہ کیا۔

حصہ پنجم

فسادات کی ذمہ داری

ذمہ داری

جو کوائف فسادات کا موجب ہوئے ان کو معلوم کرنے کے بعد اب ہم ان کی ذمہ داری عائد کرنے کے مسئلے پر گفتگو کریں گے۔ اس سلسلے میں پہلے ان جماعتوں کے خیالات و آراء کو بیان کرنا ضروری ہے جنہوں نے ہماری تحقیقاتی کاروائی میں حصہ لیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پنجاب اور مسلم لیگ نے اس موضوع پر اپنے کوئی خیالات قائم ہی نہیں کیے۔ اول الذکر نے صرف چند سطروں کا ایک تحریری بیان دینے پر اکتفا کیا جس کا منشا یہ تھا کہ اس معاملے کے متعلق چونکہ حکومت پنجاب نے کوئی تحقیقات نہیں کی۔ اور اب اس پورے معاملے کی تفتیش کی غرض سے ایک تحقیقاتی عدالت مقرر ہو گئی ہے۔ اس لیے حکومت اس تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنے کوئی خیالات پیش نہیں کرے گی۔ لیکن بحث کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ پیش کردہ شہادت کی بنا پر یہ امر ثابت شدہ قرار دینا چاہیے کہ فسادات کی ذمہ دار حکومت پنجاب اور مسلم لیگ پر عائد ہوتی ہے۔ مسلم لیگ نے یہی کافی سمجھا کہ اپنی بعض منظور کردہ قراردادوں کی نقول عدالت کی معلومات کے لیے بھیج دے اور اس امر کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہ کی کہ وہ کوائف کیا تھے جو فسادات کا موجب ہوئے اور کون کون سے افراد اور گروہ ان فسادات کے ذمہ دار ہیں۔

صدر انجمن احمدیہ ربوہ نے اپنے بیان میں فسادات کی ذمہ داری احرار، جماعت اسلامی، علما اور صوبائی و مرکزی حکومتوں پر عائد کی ہے۔ انجمن نے احرار کے خلاف یہ الزام عائد کیا ہے کہ انہوں

نے اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو عوام میں بحال کرنے کی غرض سے ایک مذہبی مسئلے کو استعمال کیا۔ اسی قسم کے مقاصد جماعت اسلامی سے وابستہ کیے گئے ہیں اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامی مملکت پر جو اصرار کیا ہے۔ اس سے ان کا مدعا یہ تھا کہ مملکت میں سب سے اونچا مقام حاصل کر لیں اور اسی غرض سے جماعت اسلامی نے احرار اور دوسرے علما کے ساتھ اشتراک عمل کیا تھا۔ اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آئندہ دستور پاکستان کے متعلق جماعت اسلامی کے آٹھ مطالبات میں اس نویں مطالبے کا اضافہ کہ احمدیوں کو دستور ہی میں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے کسی مذہبی ضرورت سے نہیں بلکہ محض سیاسی غرض سے کیا گیا تھا۔ یہی نیت علماء کی بتائی گئی ہے جنہوں نے احمدیوں کے خلاف مہم میں احراریوں کی ہم آہنگی اختیار کی۔ بیان کیا گیا ہے کہ علماء کا مقصد بھی جماعت اسلامی کی طرح بالکل یہی تھا کہ آئندہ دستور کے مذہبی پہلو پر اصرار کر کے سیاسی قوت و اقتدار حاصل کریں۔ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کے خلاف بھی یہی الزام عائد کیا گیا ہے کہ شدید پروپیگنڈا کی وجہ سے جو طوفان عرصہ دراز سے پرورش پا رہا تھا اس کی طرف سے ان حکومتوں نے بے پروائی اختیار کیے رکھی اور اس کو روکنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

بیان کیا گیا ہے کہ جب ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو چیف منسٹر نے یہ اعلان کیا کہ حکومت پنجاب مطالبات کو صحیح تسلیم کرتی ہے اور ایک صوبائی وزیر کو مرکزی حکومت کے سامنے پنجاب کا نقطہ نگاہ پیش کرنے کے لیے کراچی روانہ کر رہی ہے تو اس اعلان کی وجہ سے قانون و انتظام بالکل ختم ہو گئے اور احمدیوں کے خلاف انتہائی دہشت کا دور شروع ہو گیا۔ اس بیان کے ثبوت میں قتل لوٹ مار اور آتش زنی کے متعدد واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جو لاہور میں اس اعلان کے بعد پیش آئے۔ احراریوں کی رائے میں فسادات کی ذمہ داری اولاً تو بعض غیر ملکی طاقتوں پر عائد ہوتی ہے جو پاکستان کی حکمت عملی کو اپنے مفادات کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہیں۔ اس سلسلے میں برطانیہ عظمیٰ اور ریاستہائے متحدہ وامریکہ پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ زمانہ ماضی میں ان کی پالیسی مسلمانوں کے متعلق مخالفانہ رہی ہے اور انہوں نے چودھری ظفر اللہ خان کو اس مقصد کے لیے اپنا آلہ کار بنا رکھا ہے۔ دوسرا فریق جس کو احرار نے فسادات کا ذمہ دار قرار دیا ہے وہ قادیانی ہیں خصوصاً مرزا بشیر الدین محمود احمد امام

جماعت احمدیہ اور چودھری ظفر اللہ خاں تیسرا فریق جو مورد الزام ہے وہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان اور ان کے رفقا ہیں جن کی کمزوری اور قوت فیصلہ کے فقدان نے ایسی فضا پیدا کر دی جو فسادات کے لیے بہت موافق تھی اس الزام کا چوتھا نشانہ صوبائی حکومت اور اس کے حکام ہیں جنہوں نے قوت کے بیش از بیش استعمال سے عوام کو مشتعل کر دیا۔

مجلس عمل پنجاب کے تحریری بیانات کے مطابق فسادات کا تعلق ذیل کے وجوہ سے ہے۔

اول: احمدی تحریک اور احمدیوں کا اشتعال انگیز رویہ،

دوم: مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے احمدیوں کے ساتھ ترجیحی سلوک۔

سوم: احمدی مسئلے کا بروقت حل تلاش کرنے میں ان دونوں حکومتوں کی ناکامی۔

چہارم: عوام کے پرامن اور آئینی مظاہروں کو فرو کرنے کے لیے بہت زیادہ قوت کا استعمال اور افسروں کا اشتعال انگیز رویہ،

پنجم: بعض احمدی افراد اور احمدیوں کی منظم ٹولیاں جو جان بوجھ کر تشدد میں مصروف ہو گئیں تا کہ حکومت کو تحریک تحفظ ختم نبوت کے کچلنے کا بہانہ مل جائے۔

ششم: معاشرے کے وہ بدمعاش عناصر جنہوں نے اپنے مکروہ اغراض کی وجہ سے لاقانونی کی فضا پیدا کر دی۔

جماعت اسلامی نے اپنے تحریری بیان میں فسادات کی ذمہ داری اولاً خود احمدیوں پر اور ثانیاً مرکزی اور صوبائی دونوں حکومتوں پر عائد کی ہے۔ احمدیوں کے خلاف الزام ثابت کرنے کی کوشش میں جماعت نے مختصر لیکن مکمل طور پر ذیل کے امور کا حوالہ دیا ہے: احمدیوں کے مخصوص عقائد، جماعت احمدیہ کے بانی اور ان کے پیروؤں کی تحریریں اور تقریریں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ بے حد اشتعال انگیز اور مسلمانوں کے مذہبی حسیات کو مجروح کرنے والی ہیں۔ احمدیوں کی انقطاع پسندانہ اور غیر وفادارانہ سرگرمیاں اور اس امر کی مسلسل کوشش کہ عام ملت مسلمہ میں سے ایک علیحدہ اور منظم جماعت کو الگ کر لیا جائے جو ملت سے کوئی وجہ اشتراک نہ رکھتی ہو اور فی الحقیقت ملت کے اتحاد کے لیے خطرہ بن جائے۔ حکومت کے خلاف یہ الزام ہے کہ اس نے اس معاملے میں کمزور غیر دانشمندانہ

اور متزلزل سی پالیسی اختیار کیے رکھی جس سے نہ صرف عوام بلکہ حکام میں سخت پریشانی اور ابتری پیدا ہوئی۔ حکومت پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا ہے کہ اس نے کئی مہینے تک پریس اور پلیٹ فارم پر مطالبات کی حمایت میں ایک تیز و تند شورش کو روا رکھا۔ حالانکہ وہ مطالبات ایک طرف تمام مسلمانوں اور دوسری طرف احمدیوں کے درمیان ایک صاف اور واضح مناقشے کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ اگرچہ علمانے جن میں امیر جماعت اسلامی بھی شامل تھے۔ حکومت کو اس نازک صورت حالات کا احساس دلانے کی انتہائی کوشش کی جس کا لاوا بالکل پھٹنے کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن حکومت برابر تغافل اور عدم فیصلہ کی پالیسی پر قائم رہی اور یہ نہ محسوس کیا کہ یہ مطالبات تمام مسلمانوں کے متفقہ مطالبات ہیں اور جب حکومت نے دفعتۃً قلابازی لگائی اور ۲۷ فروری کو کراچی میں علماء کی گرفتاری کا حکم دے دیا پھر وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کی پالیسی اختیار کی اور دفعہ ۱۴۴ اور بیش از بیش قوت کا استعمال کیا تو یہ تو امور فسادات میں قطعاً اضافے کا باعث ہوئے۔ جماعت اپنے آپ کو ''ڈائریکٹ ایکشن'' سے بالکل بری اور بے تعلق ظاہر کرتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے کبھی اس طرز عمل کی تائید نہیں کی اور اس اصول پر مصر ہے کہ ایک جمہوری ملک میں جب کوئی عمومی مطالبہ اتنی اہمیت اختیار کر جائے جتنی حالت میں احمدیوں کے خلاف تحریک نے اختیار کر لی تھی تو اس کے مالہ و ماعلیہ پر غور کر کے اس کا سامنا کرنا اور کسی فیصلے پر پہنچنا اشد ضروری ہے۔

مسٹر دولتانہ نے معزول وزارت کی جانب سے مندرجہ ذیل وجوہ کو اس صورت حالات کا ذمہ قرار دیا۔

(۱) مسلمانوں میں احمدیوں کی مخالفت کا قدیم جذبہ

(۲) خود احمدیوں کا کوتاہ نظرانہ رویہ جنہوں نے دوسرے مسلمانوں سے اپنے اختلافات کو کم کرنے کے بجائے ان کا اعلان عام کیا اور ان پر مصر رہے۔

(۳) پاکستان کے قومی نظریے کی مبہم مذہبی اساس جس پر موقع بے موقع زور دینے کی وجہ سے ملائیت کو تقویت پہنچی اور سیاسی اصولوں کے متعلق ملا کے طرز عمل کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

(۴) احراریوں کی طرف سے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ایک خطرناک صورت

حالات کا استعمال۔

(۵) شورش میں علما کے عام گروہ کی شرکت۔

(۶) فسادات کے پھوٹ پڑنے کے بعد شوریدہ سروں، پیشہ ور بدمعاشوں اور اسی قسم کے دوسرے عناصر کی سرگرمیاں۔

(۷) مرکزی حکومت کی قیادت جو لوگوں کی رہنمائی کرنے میں ناکام رہی۔

مسٹر دولتانہ نے فسادات کے ضمنی وجوہ میں ان چیزوں کو بھی بیان کیا ہے معاشرے کے تمام حصوں گہری بے اطمینانی، معاشی حالات کی روز افزوں اور سریع خرابی، خوراک کی بہم رسانی میں خلل، قومی مسائل مثلاً کشمیر جوناگڑھ اور ہندوستان سے تعلقات کا مسئلہ، دستور مسائل کے متعلق رویہ حکومت کی آئندہ شکل کے معین کرنے میں تاخیر، حکومت کے نظم و نسق کے خلاف شکایات، لیڈروں پر اعتماد کا فقدان اور ہر حلقے میں عام دل شکستگی اور بے حوصلگی لاہور اور بیرونجات کے جن افسروں نے تحریری بیانات داخل کیے ہیں ان میں سے اکثر نے احرار کو اور ان ملاؤں کو مورد الزام قرار دیا ہے جو شورش کی آگ کو ہوا دینے کے لیے احراریوں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ بعض حکام نے مرکزی [illegible] کے تغافل پر بھی تبصرہ کیا ہے جس نے عوام کی بروقت اور صحیح رہنمائی نہ کی۔ چند افسروں نے احمدیوں کو بھی واقعات کے لیے ذمہ دار قرار دیا ہے۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی
اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور

فسادات کی ذمہ داری ابتداً آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور کے ممبروں پر اور ان بے شمار مذہبی انجمنوں پر عائد ہوتی ہے جن کے ممبر اپنی انجمنوں کے نمائندوں کی حیثیت سے ان کنونشنوں میں شامل ہوئے ''ڈائریکٹ ایکشن'' اختیار کرنے کی قرارداد پر عمل درآمد کرنے کے لیے ایک مرکزی مجلس عمل مرتب کرنے کا فیصلہ بھی اسی کنونشن میں کیا گیا۔ مجلس

عمل کا آئین اسی دن شام کو مکمل کر لیا گیا اور مجلس عمل کے مقرر کیے ہوئے ایک وفد کی وساطت سے ۲۲ جنوری کو خواجہ ناظم الدین کو یہ الٹی میٹم دے دیا گیا کہ مطالبات کو تسلیم کریں یا اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں اس وقت تک اس بات کا فیصلہ نہ ہوا تھا کہ مطالبات منظور نہ ہونے کی صورت میں ''ایکشن'' کی نوعیت کیا ہوگی اور نہ خواجہ ناظم الدین نے الٹی میٹم دینے والے ارکان وفد سے انٹرویو کے دوران میں اس کے متعلق کوئی سوال کیا۔

یہ الٹی میٹم ایک غیر فوجی بغاوت کے نوٹس سے کم نہ تھا اور فیصلہ یہ تھا کہ اگر اس الٹی میٹم کا جواب مجلس عمل کے نزدیک قابل اطمینان نہ ہو تو مجلس اس بغاوت کے آغاز، اس کی تنظیم اور اس کی ہدایت کاری کی ذمہ دار ہوگی۔ مجلس کا بیان یہ ہے کہ مطالبات کے مسترد ہونے کی صورت میں جس عمل کا فیصلہ کیا گیا تھا وہ نہ ''ڈائریکٹ ایکشن'' تھا نہ ''براہ راست اقدام'' تھا جس سے صرف یہ مقصود تھا کہ مطالبات رد ہونے پر عوامی بے اطمینانی کا کاملاً بے ضرر پرامن اور آئینی مظاہرہ کیا جائے اس بات کا قصد کبھی نہ تھا کہ یہ مظاہرہ سول بغاوت یا سول نافرمانی کی نوعیت اختیار کرے۔ اور اگر تحریک کے لیڈر جو اقدام کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے تھے گرفتار نہ کر لیے جاتے تو ''ڈائریکٹ ایکشن'' کا قدرتی نتیجہ فسادات کی صورت میں رونما نہ ہوتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ لیڈروں کی گرفتاری کا نتیجہ تھے اس لیے جو فسادات ان مظاہروں کے بعد ہوئے وہ انہی گرفتاریوں کی وجہ سے ہوئے اور ان کے لیے صوبائی حکومت اور مرکزی حکومت ذمہ دار ہیں لیکن یہ دعویٰ بالکل ناقابل قبول ہے اگر کسی حکومت کو یہ دھمکی دی جائے کہ اگر اس نے فلاں فلاں مطالبات فلاں تاریخ تک تسلیم نہ کر لیے تو مطالبات کرنے والی جماعت حکومت کے خلاف ''ڈائریکٹ ایکشن'' کرے گی۔ اور حکومت ان مطالبات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اس قسم کی دھمکی دینے والی جماعت کو گرفتار کر لے اور ان گرفتاریوں کی وجہ سے فسادات برپا ہو جائیں تو اس جماعت کو نہ یہ کہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے اور نہ اس کے لیے یہ کہنا زیبا ہے کہ اگر گرفتاریاں نہ ہوتیں تو فسادات نہ ہوتے ''ڈائریکٹ ایکشن'' کی دھمکی ایک قائم شدہ حکومت کو دھمکی دینا ہے اور کوئی حکومت جو صحیح معنوں میں حکومت ہو اس قسم کی دھمکی کی طرف سے بے پروا نہیں ہو سکتی۔ سوائے اس حالت کے کہ وہ اس دھمکی کا سامنا

کرنے کی جرات نہ رکھتی ہو اور ہتھیار ڈال دینے اور اقتدار سے دست بردار ہو جانے پر آمادہ ہو جائے۔ تاہم موجودہ معاملے میں خواجہ ناظم الدین نے جو احمدیوں کے خلاف جذبے کی قوت سے پوری طرح باخبر تھے ان وجوہ کی ظاہری معقولیت سے بھی واقف تھے جن کی بنا پر یہ مطالبات پیش کیے گئے تھے۔ علما سے بحث کرنے اور انہیں وہ مشکلات سمجھانے کی ہر امکانی کوشش کی جو مطالبات کی منظوری میں حائل تھے اور وہ نتائج بھی بتائے جو اس منظوری سے رونما ہونے والے تھے۔ اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین اور بعض علماء کے درمیان بڑی حد تک باہمی مفاہمت اور شاید اشتراک جذبات بھی موجود تھے لیکن نہ خواجہ ناظم الدین اور نہ علما کی مہارت اس عقدے کا کوئی حل تلاش کر سکی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۶ فروری کو مجلس عمل نے گورنر جنرل اور وزیر اعظم کی کوٹھیوں پر رضا کاروں کے دستے بھیجنے کا فیصلہ کر دیا۔ اگرچہ ایک مضبوط اور صاحب عزم حکومت علماء کے فیصلہ کردہ طرز عمل کی حماقت و شرارت کو محسوس کرنے کے بعد اس سے پہلے بھی گرفتاریاں کرنے میں حق بجانب ہوتی لیکن اب تو علما کو گرفتار کرنا بالکل ہی ناگزیر ہو گیا۔ اور ان گرفتاریوں کے ساتھ ہی احتجاجی مظاہرے اور فسادات شروع ہو گئے۔

اگر گرفتاریاں نہ کی جاتیں تو بھی بد نظمی اور لاقانونی ضرور برپا ہوتی۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے صرف اس تحریک کے علمبردار ہی انکار کر سکتے ہیں۔ وہ تمام لوگ جو اس تحریک سے متعلق یا اس کے ذمہ دار تھے، خوب جانتے تھے کہ ایسے نتائج ضرور رونما ہوں گے۔ پنجاب میں جو اس تحریک کا مرکز تھا ہزار ہا رضا کار بھرتی ہو چکے تھے اور انکی تعداد پچاس ہزار کی اس مقررہ تعداد سے بڑھ چکی تھی جس کے بھرتی کرنے کا ذمہ صاحبزادہ فیض الحسن نے لے رکھا تھا۔ ان رضا کاروں سے حلف ناموں پر دستخط کرائے جا چکے تھے۔ بے اندازہ سرمایہ فراہم کیا جا چکا تھا اور اضلاع کی مجالس عمل اور ان کے ڈکٹیٹروں کی فہرستیں تیار ہو چکی تھیں تا کہ یکے بعد دیگرے گرفتار ہوتے چلے جائیں۔ تحریک کو منظّم کرنے والوں کے سامنے ملتان اور کراچی کی نظیریں موجود تھیں۔ اور ان میں سے اکثر خود اس کا تجربہ رکھتے تھے کہ ایسے موقعوں پر کیا ہوا کرتا ہے۔ لیڈروں کی عام تقریروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر حکومت ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی کے آگے سر نہ جھکائے گی تو اس سے کس قدرتی نتیجے کی توقع

ہے اور الٹی میٹم دینے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی عوام سے جو اپیلیں کی جاتی تھیں ان میں گولیوں کا اور خون کا، رسول پاکؐ کی ناموس پر جانیں قربان کرنے کا، کفن کا، آگ کا، شعلہ ریزی کا اور تقسیم سے پیشتر ہندو مسلم فسادات کے ایام کا نہایت پر معنی ذکر موجود تھا جن لوگوں نے ان جذبات و حسیات کا اظہار کیا تھا وہ ہم سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ ہم ان کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیں گے کہ انہیں ان واقعات کی توقع نہ تھی جو بعد میں پیش آئے نہ انہیں کبھی ایسے نتائج کا اندیشہ ہوا تھا حالانکہ یہ نتائج ان کے اپنے افعال سے پیدا ہوئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ رضا کاروں کے دستے چوری چھپے جانے والے تھے تاکہ کوئی ہجوم ان کے ساتھ نہ ہو جائے یہ ایک ایسی صورت ہے جو وہ لوگ ہرگز پیش نہیں کر سکتے جن کی سرگرمیوں کی بنیاد ہی عوامی شورش اور پروپیگنڈا پر تھی۔ اس کی شہادت اس امر سے ملتی ہے کہ نہ صرف ۱۶ سے ۱۸ جنوری تک کراچی میں کنونشن کے جلسے کے وقت بلکہ ڈائریکٹ ایکشن سے پہلے دن کی شام کو بھی لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا اسی شام کو یہ اعلان کیا گیا کہ اگلے دن صبح کو ایک جلسہ عام ہوگا جس میں حکومت کے ساتھ ہونے والے مذکرات کا نتیجہ سنایا جائے گا۔ اور اگر وہ مذاکرات ناکام ہوئے تو [illegible] کے لیے اصلی پروگرام کا اعلان کیا جائے گا۔

ہمارے سامنے جو شہادت پیش ہوئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ جب مجلس عمل کے ممبروں نے خواجہ ناظم الدین کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت ان کو خوب معلوم تھا کہ اگر مطالبات رد کر دیے گئے اور ''ڈائریکٹ ایکشن'' پر عمل درآمد شروع ہو گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بڑے پیمانے پر فسادات برپا ہو جائیں گے۔ جن میں آتش زنی، خونریزی اور شدید قسم کی عام بدنظمی شامل ہوگی۔ چونکہ واقعات نے بالکل وہی صورت اختیار کی جو متوقع تھی۔ لہٰذا ان فسادات کی ذمہ داری براہ راست اس مجلس کے ممبروں پر عائد ہوتی ہے اور چونکہ مجلس عمل بہت سی مذہبی انجمنوں اور مذہبی رہنماؤں کے کارندے کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ اس لیے جو اشخاص یا گروہ اس کراچی کنونشن کے ممبر تھے۔ جس نے ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد منظور کی تھی۔ وہ سب کے سب فسادات اور اس کے نتائج ذمہ دار ہیں۔

آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور کے ممبر اس لیے ذمہ دار ہیں کہ انہوں نے ''ڈائریکٹ ایکشن'' کی

قرارداد منظور کی ۔ وزیراعظم کو الٹی میٹم دینے کی تائید کی اور ڈائریکٹ ایکشن کے پروگرام کا سارا سازوسامان فراہم کیا۔

بے شمار مذہبی انجمنوں اور واعظوں کی ذمہ داری کا تعین کرنے میں ہم نے نیابتی مسئولیت کے مسلمہ اصول اور کارفرما اور کارندے کے تعلقات کے متعلقہ قانون پر عمل کیا ہے۔ جو مجالس عمل آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی اور آل مسلم پارٹیز کنونشن لاہور نے مقرر کی تھیں ۔ وہ اپنی اپنی کنونشن کی نمائندہ اور کارندہ تھیں ۔ اور جو فعل کسی مجلس نے کیا بشرطیکہ وہ فعل مجلس کے دائرہ اختیار میں تھا اس کی ذمہ داری اس کے کارفرما پر عائد ہوتی ہے۔ کنونشن کے ممبروں نے ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کی منظوری اور اس قرارداد پر عمل درآمد کے لیے مجلس عمل کا تقرر کر کے مجلس کو پورا اختیار دے دیا کہ وہ اس قرارداد کو عمل میں لانے کے ذرائع طے کرے۔ اس اعتبار سے مجلس کے تمام اعمال اس کنونشن کے اعمال تھے جس نے اس کو مقرر کیا تھا۔ لہٰذا جب تک کنونشن کا کوئی ممبر ڈائریکٹ ایکشن سے اپنی بے تعلقی کا علے اعلان اظہار نہ کرے وہ ڈائریکٹ ایکشن کے طبعی نتائج کا بالکل مجلس ہی کی طرح ذمہ دار ہے۔

پارلیمنٹ میں بجٹ پر عام مباحثے کے دوران میں خواجہ ناظم الدین نے بظاہر امر واقعہ کی حیثیت سے یہ بیان کیا کہ مختلف مذہبی انجمنوں کے بعض ممتاز علما نے باوجود اس کے کہ وہ مجلس عمل کے ممبر تھے اور انہوں نے احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے مطالبے کی تائید کی تھی ڈائرکٹ ایکشن کے پروگرام سے بے تعلقی اختیار کر لی ہے اور اگر اس حقیقت کی کافی وسیع اشاعت کی جاتی تو بعض علما اور مسجد کے بعض امام ہرگز تحریک میں حصہ نہ لیتے۔ لیکن ہمارے روبرو اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ کسی انجمن یا کسی شخص نے جو کراچی یا لاہور کی کنونشن کا ممبر تھا ڈائریکٹ ایکشن کی تحریک سے علے الاعلان بے تعلقی کا اظہار کیا ہو۔ اور اس قسم کے اظہار بے تعلقی کی عدم موجودگی میں سمجھنا ہرگز موزوں نہیں کہ دونوں کنونشوں میں سے کسی کے ممبر علماء میں سے کسی نے (اور کس نے) اس لائحہ عمل سے اختلاف کیا تھا جس کا فیصلہ مجلس عمل نے کیا تھا۔ اس مجلس عمل نے جو خود انہوں نے اس مقصد سے مقرر کی تھی ۔ اور جس کے افعال کی ذمہ داری نہ صرف قانون کے رو سے بلکہ کردار انسانی کے عام اصولوں کے رو سے بھی انہی پر عائد ہوتی ہے۔

تعلیمات اسلامی بورڈ کے ممبر

یہ امر بے حد تعجب انگیز ہے کہ تعلیمات اسلامی کا بورڈ بھی جو ایک حکومت ادارہ ہے۔ اس ڈائریکٹ ایکشن کے کاروبار میں از سرتاپا کود پڑا۔ مولانا سلیمان ندوی (صدر) مولانا ظفر احمد انصاری (سیکرٹری) اور مولانا محمد شفیع ممبر بورڈ ان قراردادوں میں شامل تھے جو ڈائریکٹ ایکشن اور مجلس عمل کے قیام کے متعلق منظور کی گئی تھیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ تمام حضرات حکومت کے ملازم ہیں اور معقول مشاہرے وصول کرتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ علما اپنی ہی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوں اور سب امور کو اپنے ہی معیاروں پر جانچتے ہوں لیکن کوئی ایسا اصول ہم کو کسی نے اب تک نہیں سمجھایا جس کے ماتحت کوئی شخص دیانت داری سے حکومت کا ملازم بھی رہے، سرکاری خزانے سے معقول تنخواہ بھی وصول کرے اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسی تحریک میں بھی شامل ہو جو اسی حکومت کے خلاف بغاوت سے کم نہ ہو۔ اگر یہ حضرات قادیانی مسئلے پر اتنے ہی مضطرب تھے تو انہیں اپنی ہی حکومت کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد میں شریک ہونے سے پہلے دیانت دار آدمیوں کی طرح حکومت سے تعلق منقطع کر لینا چاہیے تھا۔ ان میں سے کسی نے علے الاعلان یہ کہنے کی جرأت نہ کی کہ وہ ڈائریکٹ ایکشن کے خلاف ہے نہ اس ہنگامے کی مذمت کی۔ جو اس اقدام کے نام پر برپا کیا جارہا تھا جس حالت میں ایسا کوئی اعلان موجود نہیں وہ بھی کنونشن کے دوسرے ممبروں ہی کی طرح فسادات کے ذمہ دار ہیں۔

376

جماعت اسلامی

جماعت اسلامی کی ذمہ داری کے مسئلے پر بحث کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے اغراض و مقاصد اور اس کی سرگرمیوں کے دائرے کا مختصر حال بیان کر دیا جائے۔

جماعت اسلامی تقسیم سے پہلے موجود تھی۔ اس کا صدر مقام پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور میں تھا اور

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اس کے بانی تھے، تقسیم کے بعد مولانا پاکستان چلے آئے اور انہوں نے ۱۹۵۲ء میں جماعت اسلامی پاکستان کے لیے ایک نیا آئین وضع کیا۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی اب تک کام کر رہی ہے اور اس کا اپنا علیحدہ آئین ہے۔

جماعت اسلامی کا نظریہ نہایت سادہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا بھر میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کی جائے جس کا دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ ایک ''دینی سیاسی'' نظام قائم کیا جائے جس کو جماعت ''اسلام'' کہتی ہے۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے وہ نہ صرف پروپیگنڈا کو ضروری سمجھتی ہے بلکہ آئینی ذرائع سے اور (جہاں ممکن ہو وہاں قوت سے) سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہاں ہے جو حکومت جماعت کے تصور پر مبنی نہ ہو مثلاً جہاں اس کی بنیاد قومیت پر ہو، مولانا امین احسن اصلاحی کے نزدیک ''شیطانی حکومت'' اور خود مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے نزدیک کفر ہے اور تمام لوگ جو ایسی حکومت میں ملازمت یا کسی دوسری حیثیت سے حصہ لے رہے ہیں یا رضا مندی سے اس نظام کی اطاعت کرتے ہیں وہ گنہگار ہیں۔ لہٰذا جماعت مسلم لیگ کے تصور پاکستان کی علی الاعلان مخالف تھی اور جب سے پاکستان قائم ہوا ہے۔ جس کو ''ناپاکستان'' کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جماعت موجودہ نظام حکومت اور اس کے چلانے والوں کی مخالفت کر رہی ہے۔ ہمارے سامنے جماعت کی جو تحریریں پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک بھی نہیں۔ جس میں مطالبہ پاکستان کی حمایت کا بعید سا اشارہ بھی موجود ہو۔ اس کے برعکس یہ تحریریں جن میں کئی ممکن مفروضے بھی شامل ہیں۔ تمام مخالف ہیں جس میں پاکستان وجود میں آیا اور جس میں اب تک موجود ہے۔ ایک فوجی عدالت میں اس جماعت کے بانی نے یہ بیان کیا کہ مسلح بغاوت کے سوا جماعت کا عقیدہ اور مقصد یہ ہے کہ موجودہ نظام حکومت کو توڑ کر جماعت اسلامی کے تصور کے مطابق حکومت قائم کی جائے۔ جماعت کے رئیس کو امیر کہتے ہیں اور اگرچہ اسکی رکنیت محدود ہے جس میں آج کل صرف ۹۹۹ ممبر شامل ہیں لیکن جماعت کی نشر و اشاعت کی مشینری خاصی وسیع ہے۔

ہم کسی موقع پر یہ بیان کر چکے ہیں کہ تین مطالبات مذہب پر مبنی بتائے جاتے ہیں۔ جماعت نے اور مولانا ابو علیٰ مودودی نے اس سے انکار نہیں کیا لیکن دونوں نے احمدیوں کو اقلیت قرار

دینے اور ان کو کلیدی اسامیوں سے برطرف کرنے کی بہت سے دوسرے وجوہ پر بھی زور دیا ہے۔ان وجوہ کے اظہار میں گویا یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ ان مطالبات کا ایک سیاسی و مجلسی پہلو بھی ہے۔اب اگر یہ خیال درست ہو اور مطالبات کے مذہبی پہلو کو فی الحال نظر انداز کر دیا جائے۔اور یہ معلوم ہو کہ جماعت ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے میں شریک تھی تو جماعت کا موقف یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر حکومت کسی عوامی مطالبہ کو منظور نہ کرے یا اس پر غور کرنے کو تیار نہ ہو تو تمام آئینی ذرائع کو بالائے طاق رکھ کر حکومت کو سول بغاوت کا الٹی میٹم دے دینا چاہیے۔ہمارے نزدیک اس موقف کو کوئی شائستہ حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔جسکو یقین ہو کہ وہ محض قوت کے بل پر نہیں بلکہ جمہور کی مرضی سے برسر اقتدار ہے اور جب کبھی ایسی حکومت کو ایسی صورت کا سامنا ہو۔اس کا یہ واضح فرض ہے کہ الٹی میٹم کو رد کر دے۔اور اس کی دھمکی کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے تمام امکانی وسائل کام میں لائے اگر جماعت اسلامی کے نزدیک ان مطالبات کے وجوہ مجلسی اور سیاسی نوعیت رکھتے تھے تو اس کے لیے واضح راہ عمل یہی تھی کہ وہ آئینی تحریک شروع کرتی۔دستور ساز اسمبلی کے خیالات تبدیل کرنے کی کوشش کرتی یا آئندہ انتخابات تک انتظار کرتی اور اسی مسئلے پر الیکشن کی جنگ لڑتی موجودہ حالت کہ سارے تمام معاملات غیر حل شدہ حالت میں ہیں اس حالت میں حکومت کے سینے پر پستول رکھ کر اسے کسی مطالبے کو پورا کرنے یا کوئی خاص طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کرنا نہ صرف غیر آئینی بلکہ صاف طور پر وطن دشمنی کا فعل ہے۔اور یہ طریقہ صرف وہی جماعت اختیار کر سکتی ہے جو حکومت کی مشکلات میں اضافہ کرنے کی خواہاں ہو۔اگر یہ مطالبات مذہبی وجوہ پر مبنی قرار دے کر پیش نہ کیے جاتے تو ظاہر ہے کہ کوئی بحران پیدا نہ ہوتا کیونکہ اس حالت میں حکومت ان مطالبات کو پیش کرنے والے فریق سے یہ خواہش ظاہر کرتی کہ وہ اپنے دعوے کو دلائل سے ثابت کرے تا کہ ان لوگوں کے خلاف مناسب اقدام کیا جا سکے جو مملکت کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔لیکن ان میں سے ایک مطالبہ یہ کہ احمدیوں کو کلیدی عہدوں سے برطرف کیا جائے اور اس کی بنیاد صرف مذہب پر تھی کیونکہ چونکہ چودھری ظفر اللہ خان کے سوا کوئی احمدی کسی کلیدی عہدے پر فائز نہیں ہے اور خود جماعت اسلامی کلیدی عہدے کی یہ تعریف کر چکی ہے کہ وہ عہدہ جس کا کام پالیسی وضع کرنا ہو۔

مولانا امین احسن اصلاحی سے سوال کیا گیا کہ جب احمدیوں کو کلیدی عہدوں برطرف کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ان سے کون سے دوسرے عہدے مراد ہیں تو وہ کسی ایسے عہدے کا نام نہ لے سکے جس پر کوئی احمدی فائز ہو۔ اسی طرح اگر چودھری ظفر اللہ خان کی موقوفی کا مطالبہ اس بنا پر کیا جاتا کہ ان کی سرگرمیاں مملکت کے مفاد کے لیے مضر ہیں تو حکومت ان کے احمدی ہونے کے علاوہ اس امر کا قطعی ثبوت طلب کرتی کہ وہ بعض ایسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں جن کا علم وزیراعظم کو نہیں ہے۔ اور جن سے مملکت کو ایسا نقصان پہنچ رہا ہے کہ ان کی برطرفی ضروری ہو گئی ہے۔ لہٰذا فسادات کے لیے جماعت کی ذمہ داری کے متعلق واحد سوال یہ ہے کہ آیا دوسری جماعتوں کی طرح جماعت اسلامی بھی اس فیصلے کی حامی تھی کہ اگر حکومت نے ان مطالبات کو جو بعض مذہبی عقائد پر مبنی بتائے جاتے تھے تسلیم نہ کیا تو اس کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن شروع کر دیا جائے گا؟

جماعت اسلامی فسادات کی ذمہ داری قبول کرنے سے اس بنا پر انکار کرتی ہے کہ اس نے ڈائریکٹ ایکشن کی یا ایسے اقدام کے فیصلے کی تعمیل کے لیے کسی پروگرام کی کبھی حمایت نہیں کی۔ مجلس عمل، احرار اور احمدی جماعت اسلامی کے اس بیان کی تردید کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ معین کرنا ضروری ہے کہ آیا فسادات کی کوئی ذمہ داری جماعت پر بھی عائد کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ ایک طرف جماعت اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بیان اور دوسری طرف مجلس احرار اور مجلس عمل کے اظہار کے درمیان جو فرق ہے وہ اس رپورٹ کے ایک سابقہ حصے میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس امر سے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی نے انکار نہیں کیا کہ ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کراچی میں ۱۸ جنوری کو کنونشن کے ایک جلسے میں منظور کی گئی تھی جس میں مولانا خود موجود تھے۔ اس مجلس میں ایک اور قرارداد بھی منظور کی گئی جس کے ماتحت پندرہ ممبروں کی ایک مجلس عمل مرتب کی گئی جن میں سے آٹھ اسی وقت اتفاق رائے سے نامزد کر دیے گئے۔ اس مرحلے تک تو جماعت اسلامی اور مجلس عمل اور احرار کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف اس مرحلے سے شروع ہوتا ہے جب اسی دن شام کو مجلس عمل کے ان آٹھ ممبروں کا اجلاس ہوا جو کنونشن میں چنے گئے تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور انکی جماعت کا بیان ہے کہ اس اجلاس کی کوئی اطلاع مولانا مودودی کو نہیں دی گئی حالانکہ وہ کراچی

379

MunirReport.pdf

کے وقت مجلس عمل کے ممبروں کا اجلاس ہوا۔ تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ پیغام بھیجا کہ وہ چونکہ ایک اور کام کی وجہ سے مصروف ہیں اس لیے انہوں نے مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی کراچی کی ہدایت ہے کہ اجلاس میں شریک ہوں۔ چنانچہ جس وقت سات مزید ممبر شامل کیے گئے اور وہ اشخاص بھی منتخب کیے گئے جو خواجہ صاحب کو الٹی میٹم دینے والے تھے۔ اس وقت امیر موصوف اجلاس میں موجود تھے۔ مولانا کا یہ بھی بیان ہے کہ جماعت اسلامی کے اس نمائندے نے نہ تو مجلس عمل کے اجلاس پر آئین کے خلاف ہونے کا کوئی اعتراض کیا نہ اس کے فیصلے کے خلاف کوئی آواز اٹھائی۔ مولانا سلطان طلب نہیں کیے گئے۔ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مولانا سلطان احمد کو مجلس عمل کے اجلاس میں بھیجا تھا۔ مولانا مودودی نے اس بیان کی بھی تردید کی ہے کہ کسی دعوت طعام کے موقع پر انہوں آٹھ ممبروں کے اجلاس میں شامل ہونے سے معذوری ظاہر کی تھی اور اپنی جگہ مولانا سلطان احمد کو اس اجلاس میں شریک ہونے کی ہدایت کی تھی۔

اب ایک طرف مولانا مودودی کا بیان ہے اور دوسری طرف مولانا ابوالحسنات محمد احمد اور سید مظفر علی شمسی کی شہادت ہے۔ ان دونوں میں جو اختلاف ہے اس کے پیش نظر یہ فیصلہ کرنا قطعی طور پر ناگوار اور کسی قدر مشکل ہے کہ کس بیان کو سچ سمجھا جائے۔ لیکن چونکہ جماعت اسلامی کی ذمہ داری [illegible] اسی واقعہ پر منحصر نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس پر اپنی کوئی رائے دینے سے احتراز کرتے ہیں۔

381

ایک طرف جماعت اسلامی اور دوسرے طرف احرار اور مجلس عمل کے درمیان دوسرا اختلاف مولانا سلطان احمد کے اس رویے سے متعلق ہے جو انہوں نے دفتر تحریک ختم نبوت کراچی میں ۲۶ فروری کو مجلس عمل کے ایک اجلاس میں اختیار کیا۔ مولانا مودودی کا بیان ہے کہ اگرچہ انہیں اس اجلاس کی اطلاع موصول ہوگئی تھی لیکن چونکہ وہ بیمار تھے اس لیے انہوں نے ٹیلیفون پر مولانا سلطان احمد کو بعض ہدایات دے دیں اور اس کے ساتھ ہی ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء کو ایک مفصل خط لکھ دیا۔ اس ٹیلیفونی پیغام اور خط کا خلاصہ یہ تھا کہ اس اجلاس میں جماعت اسلامی کی طرف سے اس رائے پر زور دیا جائے کہ ڈائریکٹ ایکشن نہ کیا جائے۔ نہ کوئی غیر آئینی قدم اٹھایا جائے اور اگر یہ تجویز قبول نہ کی جائے تو مولانا سلطان احمد اعلان کر دیں کہ جماعت اسلامی مجلس عمل کی ممبری سے مستعفی ہوتی ہے چونکہ مولانا

سلطان احمد طلب نہیں کیے گئے۔ اس لیے ہم نہیں جانتے کہ ان کو یہ خط کب ملا اور انہوں نے مجلس عمل میں کیا خیالات ظاہر کیے۔

مولانا مودودی نے مولانا سلطان احمد کے نام اپنے خط میں یہ لکھا تھا کہ مجھے ۱۸ جنوری کے اجلاس کنونشن کے بعد مجلس عمل کے کسی اجلاس کا علم نہیں۔ مجھے ان عام مظاہروں سے اختلاف ہے جو لاہور میں کیے جا رہے ہیں اور جن سے لوگوں کے دلوں میں یہ توقع پیدا کرنا مقصود ہے کہ ۲۲ فروری کو ایک جنگ عظیم شروع ہونے والی ہے۔ اگر اس توقع کے پیدا ہونے کے بعد کسی جنگ کا اعلان نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مشترکہ مقصد ناکام ہو جائے گا۔ جماعت اسلامی اس مفاہمت کی بنا پر مجلس عمل میں شامل ہوئی تھی کہ ہر جماعت حصول مقصد کے لیے اپنا لائحہ عمل الگ تیار کریگی اور مجلس عمل کے حکم کے ماتحت یا اس کے بنائے ہوئے کسی پروگرام کی تعمیل میں کام نہ کرے گی جس سے اس کی اپنی حیثیت مدغم ہو جائے۔ مجلس عمل کا یہ رویہ غلط ہے کہ اس نے بطور خاص خواجہ ناظم الدین کے خلاف مظاہروں کا انتظام کیا ہے کیونکہ ایسے طرز عمل سے تحریک کے ساتھ بنگالیوں کی ہمدردی ختم ہو جائے گی اور چودھری ظفر اللہ خان کی برطرفی کے مطالبے پر اصرار کرنا بھی غلط ہے۔ بڑے پیمانے پر کسی شورش کے برپا کرنے کے لیے فضا سازگار نہیں ہے۔ کیونکہ اول: ابھی تعلیم یافتہ طبقے مطالبات کے قائل نہیں کیے جا سکے۔ دوم: پنجاب اور بہاولپور کے سوا دوسرے صوبوں کو ابھی تک تحریک سے دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ مجلس عمل نے اپنے لیے جو راہ عمل تجویز کی ہے اگر اس پر اصرار کیا گیا تو نتیجہ ناکامی ہوگا۔ مولانا سلطان احمد کو چاہیے کہ مجلس عمل کے ممبروں کے سامنے ان نکات پر زور دیں۔ اور اگر مجلس ان کے خیالات سے متفق نہ ہو تو وہ جماعت کو مجلس عمل سے منقطع کر لیں۔ اگرچہ اس خط میں مولانا سلطان احمد کو جو ہدایات دی گئی تھیں وہ واضح اور قطعی تھیں۔ لیکن ہمارے سامنے اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ مولانا مودودی کا نقطہ نگاہ مجلس عمل کے سامنے بیان کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس ہمارے سامنے مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد اور سید مظفر علی شمسی کی یہ شہادت موجود ہے کہ مولانا سلطان احمد نے مجلس کے فیصلے کے خلاف کوئی اختلاف یا نامنظوری کا اظہار نہیں کیا۔ مقدمے کے اس حصے پر مولانا ابوالحسنات کی شہادت درج ذیل ہے۔

سوال۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ مولانا سلطان احمد نے مجلس عمل کی کارروائی میں حصہ لیا تھا؟

جواب۔ جی ہاں

سوال۔ کیا انہوں نے اس قرارداد سے جو کارروائی میں مندرج ہے کسی اختلاف کا اظہار کیا تھا؟

جواب۔ جی نہیں۔ وہاں ہر شخص متفق تھا۔

(عدالت سے) مجھے قطعی یقین ہے کہ مولانا سلطان احمد نے مجلس کے فیصلے کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

سوال۔ کیا مولانا سلطان احمد نے یہ کہا تھا کہ وہ مولانا مودودی کی ٹیلیفونی ہدایات کے ماتحت اجلاس میں حاضر ہوئے ہیں اور جس خط کا مولانا مودودی نے ذکر کیا ہے وہ انہیں اب تک نہیں ملا؟

جواب۔ جی ہاں یہ صحیح ہے۔

سوال۔ کیا مولانا سلطان احمد نے یہ کہا تھا کہ مولانا مودودی کی طرف سے کوئی ہدایات نہ ملنے کی صورت میں وہ مجلس کے فیصلوں کے متعلق کوئی قطعی رویہ اختیار نہیں کر سکتے؟

383

جواب۔ جی نہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا۔

اس سے قبل مولانا مودودی نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے لیے ذاتی طور پر مجلس عمل میں شریک ہونا ضروری نہیں اور وہ کسی دوسرے شخص کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیج سکتے ہیں۔ مولانا سلطان احمد نے یہ نہیں کہا کہ جب تک انہیں مولانا مودودی کا وہ خط نہ مل جائے جو آنے والا ہے وہ قرارداد پر کسی قسم کی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ مجھے قطعی طور پر یاد ہے کہ جب میں نے مولانا سلطان احمد سے پوچھا کہ آیا انہیں مجلس کے اجلاس مورخہ ۲۶ میں جماعت اسلامی کی نمائندگی کا پورا اختیار حاصل ہے تو انہوں نے صاف صاف اثبات میں جواب دیا تھا۔

سوال۔ آپ سے مولانا مودودی نے کب کہا تھا کہ وہ جماعت کی جانب سے اپنا (ایک نمائندہ پورے اختیار کے ساتھ بھیجیں گے؟

۵ مارچ کی اشاعت میں تسنیم نے اپنے سٹاف رپورٹر کی ایک رپورٹ شائع کی کہ میں نے جماعت کے موقف کی وضاحت کے لیے جماعت اسلامی کے ذمہ دار اشخاص سے ملاقات کی ہے اور ایک شخصیت نے جو جماعت کی جانب سے ترجمانی کا حق رکھتی ہے یہ بیان کیا ہے کہ جماعت کا موقف ۴ مارچ کے تسنیم میں واضح کر دیا گیا ہے اور ایک شخص مولانا محمد یوسف جو گزشتہ روز مولانا اختر علی خان کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا اور بعد میں رہا کر دیا گیا ایسی حرکات کر رہا ہے جو مشترک مقصد کے لیے نقصان رساں ہیں عوام کو غیر ذمہ دار اشخاص کی پھیلائی ہوئی افواہوں پر یقین نہ کرنا چاہیے اور جماعت کو وہ کام کرنے کا موقعہ دینا چاہیے جو اس نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

چالیس صفحوں کا ایک کتابچہ ''قادیانی مسئلہ'' ۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو شائع کیا گیا جس میں مولانا مودودی کی اس رائے کی تائید میں کہ احمدی دائرہ اسلام سے خارج ہیں تفصیلی دلائل پیش کیے گئے تھے۔اس کتابچے میں احمدی لٹریچر سے بے شمار اقتباسات نقل کیے گئے تھے اور کہا گیا تھا کہ پاکستان کی تمام مذہبی انجمنوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مسلم معاشرے سے اس سرطان (احمدیت) کو کاٹ کر پھینک دیا جائے اور ظفر اللہ خان کو اس عہدے سے موقوف کرایا جائے کیونکہ اس کی سرگرمیاں اس سرطان کی جڑوں کو بیرونی دنیا اور مسلمان ملکوں میں پھیل رہی ہیں کتابچے کے آخر میں محض برسبیل یہ اشارہ بھی کیا گیا تھا کہ مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے عام لوگ جس قسم کے مظاہرے تجویز کر رہے ہیں وہ مناسب نہیں ہیں اور سنجیدہ اور تعلیم یافتہ لوگ ان کو پسند نہیں کرتے۔لیکن اس اشارے کے ساتھ ہی یہ بھی بیان کر دیا تھا کہ لوگوں نے یہ مظاہرے مسلم لیگ کی شورش سے سیکھے ہیں جو اس نے ملک خضر حیات خان ٹوانہ کی وزارت کو توڑنے کے لیے برپا کی تھی اور یہ مظاہرے مُلا نے ایجاد نہیں کیے۔

اسی دن جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ اعلان کیا کہ مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کو منوانے کے لیے موثر تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔اور تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے اس کو صحیح خطوط پر چلانا چاہیے۔اس قرارداد میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ جمہور کے مطالبات حق بجانب ہیں۔اگر ان مطالبات کے تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا تو عوام میں لازماً

بے اطمینانی اور غیظ وغضب پیدا ہوگا۔ اور ایسے معاملات میں تغافل کی پالیسی سے عوام غیر آئینی ذرائع کو کام میں لانے پر آمادہ ہو جایا کرتے ہیں۔ حکومت کا یہ رویہ غلط ہوگا کہ وہ مطالبات کو قوت سے دبائے اور جب قوت کے استعمال کی وجہ سے لوگ مشتعل ہو جائیں تو انکے خلاف پولیس اور فوج استعمال کی جائے۔ یہ طرز عمل ملک کو لازماً خانہ جنگی کی طرف لے جائے گا۔ اس قرارداد میں مولانا مودودی کی اس تقریر کا مفاد بھی درج کیا گیا تھا جو انہوں نے اس دن گورنمنٹ ہاؤس میں کی تھی۔ اس قرارداد میں مولانا مودودی کی تقریر کا حوالہ دے کر یہ کہا گیا تھا کہ مولانا نے اس تقریر میں جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ عوامی مطالبات کو رد کر دینے کے بعد حکومت کی طرف سے امن وامان کی اپیل بالکل بے کار ہے اور اگر حکومت عوام کے مطالبات کو قوت سے دبانے پر تلی ہوئی ہے تو اس اپیل سے کوئی مفید مقصد حاصل نہ ہوگا۔ اور اگر حکومت چاہتی ہے کہ صورت حالات میں مزید خرابی پیدا نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ مطالبات کو قوت سے دبانے کی کوشش کو ترک کر کے عوام کے جذبات کو ٹھنڈا کرے اور عوام کے نمائندوں سے گفت وشنید شروع کر دے۔ جب تک دلیل کا مقابلہ دلیل سے کرنے کا اصول اختیار نہ کیا جائے گا بدنظمی اور خونریزی کے واقعات برابر جاری رہیں گے۔ اور اگر حکومت کو اس امر میں کوئی شبہ ہو کہ یہ مطالبات عوام کے متفقہ مطالبات ہیں تو یہ حکومت کا کام ہے کہ اس حقیقت کو معلوم کرنے کا کوئی اور طریقہ تجویز کرے اور اگر تمام معیاروں پر جانچنے کے بعد یہ مطالبات متفقہ ثابت ہوں اور حکومت پھر بھی انہیں تسلیم نہ کرے تو لوگوں کے لیے اور کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔

اس قرارداد میں واقعات وحوادث کے متعلق جماعت اسلامی کی رائے بھی ظاہر کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ امیر جماعت اسلامی نے ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کے بعد بار بار تحریک کے علم برداروں کی توجہ ان دو پہلوؤں کی طرف مبذول کرائی ہے کہ (۱) یہ مناقشہ صرف پنجاب تک محدود ہے اور (۲) پنجاب میں بھی تعلیم یافتہ طبقے اس مسئلے کے مذہبی، مجلسی اور سیاسی متعلقات ونتائج کا احساس نہیں رکھتے۔ لیکن مجلس عمل کے ممبروں نے ان دو پہلوؤں کا مناسب لحاظ رکھے بغیر ڈائریکٹ ایکشن شروع کر دیا اور جب ڈائریکٹ ایکشن کا آغاز ہوا تو وہ ایسے واقعات فسادات سے داغدار ہو گیا جو اسلامی اخلاق کے لیے باعث توہین تھے اور جن سے ایک مقدس مقصد کی تذلیل ہوئی۔

388

کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھ لی جائے کہ جماعت اسلامی کا مقصد اقتدار حاصل کرنا ہے کیونکہ اس کے خیال کے مطابق اللہ کی حاکمیت کے ماتحت مذہبی ادارات کے قیام کا مقصد حاصل کرنے کا موثر ترین ذریعہ یہی ہے تو اس امر میں ذرا بھی شبہ باقی نہیں رہتا کہ جو کچھ ہو رہا تھا اسے جماعت اسلامی کی پوری تائید وحمایت حاصل تھی۔

لہٰذا ڈائریکٹ ایکشن کی منظوری سے اور اس پروگرام سے جو مجلس عمل نے کراچی میں ۲۶ فروری کو طے کیا تھا کہ گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کی کوٹھیوں پر رضا کاروں کے دستے بھیجے جائیں اور مولانا ابوالحسنات کو تحریک کا پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا جائے جو طبعی نتائج پیدا ہوئے ان کی ذمہ داری جماعت پر بھی عائد ہوتی ہے۔ تحریک کے لیڈروں کی گرفتاریاں ناگزیر ہو چکی تھیں اور مجلس عمل مورخہ ۲۶ فروری کی کاروائی میں پہلے ڈکٹیٹر کی امکانی گرفتاری کا جو ذکر موجود ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ لیڈروں کو بھی اس معاملے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا جو واقعات گرفتاریوں کے بعد رونما ہوئے وہ چونکہ متوقع تھے اور یہ بھی معلوم تھا کہ عام احتجاجوں اور مظاہروں سے جو صورت حالت پیدا ہوگی اس کی درستی کے لیے حکام کیا تدابیر اختیار کریں گے۔ اس لیے جماعت کی طرف سے یہ دعویٰ بالکل ناز یبا ہے کہ سارا الزام حکومت پر عائد ہوتا ہے کیونکہ اس نے ان فسادات کو فرو کرنے کے لیے جو نہایت سرعت سے نہایت تشویش انگیز صورت اختیار کر رہے تھے قوت کا استعمال کیا۔ سید فردوس شاہ کو ۴ مارچ کی شام کو ایک غضبناک ہجوم نے مسجد وزیر خاں کے اندر یا باہر قتل کر دیا۔ یہ بعد میں ہونے والے واقعات کا محض ایک پیش خیمہ تھا۔ لیکن اس حادثے کے بعد بھی جماعت اسلامی نے نہ اظہار تاسف کیا نہ اس وحشیانہ قتل کی مذمت میں ایک لفظ کہا بلکہ اس کے برعکس اس جماعت کے بانی نے آگ اور خون کے اس ہولناک ہنگامے کے درمیان ''قادیانی مسئلہ'' کا بم پھینک دیا۔ ہمارے نزدیک جماعت کے ذہن کی کیفیت صحیح صحیح یہ تھی کہ اگرچہ وہ اس پروگرام کو جائز نہ سمجھتی تھی جو ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کی تعمیل کے لیے طے ہوا تھا۔ لیکن وہ شروع سے آخر تک لوگوں کے سامنے اپنے حقیقی خیالات کا دلیرانہ اور دیانت دارانہ اعلان اس خوف کی وجہ سے نہ کر سکی کہ مبادا وہ عوام میں غیر ہر دلعزیز ہو جائے۔ لہٰذا وہ اپنی ذہنیت اور اپنے رویے کے اعتبار سے کسی دوسری سیاسی

392

احرار

احراریوں کی ابتدا اور ان کی سرگرمیوں کی پوری کیفیت اس رپورٹ کے کسی سابقہ حصے میں دی جا چکی ہے۔ احراریوں کی پالیسی کا غالب اور بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ کسی کے ماتحت رہ کر کام نہیں کریں گے۔ اسی اصول کے مطابق وہ کانگرس سے علیحدہ ہوئے۔ گو اس کے بعد بھی انہوں نے کانگرس سے ملنے جلنے اور اس کے آگے دم ہلانے کا رویہ جاری رکھا۔ ان کے اور مسلم لیگ کے درمیان کامل مغائرت تھی اور مسلم لیگ کے پاکستان کو انھوں نے کبھی قبول نہیں کیا تھا جس زمانے میں مسلم لیگ قائداعظم کے زیر قیادت پاکستان کے لیے جدوجہد کر رہی تھی احرار برابر مسلم لیگ کی ممتاز شخصیتوں کو مغلظات سنا رہے تھے۔ اور ان پر غیر اسلامی زندگی بسر کرنے کے الزام عائد کر رہے تھے۔ اسلام ان کے لیے ایک حربے کی حیثیت رکھتا تھا جسے وہ کسی سیاسی مخالف کو پریشان کرنے کے لیے جب چاہتے بالائے طاق رکھ دیتے اور جب چاہتے اٹھا لیتے۔ کانگرس کے ساتھ سابقہ پڑنے کی صورت میں ان کے نزدیک مذہب ایک نجی معاملہ تھا اور وہ نظریہ قومیت کے پابند تھے لیکن جب لیگ کے خلاف صف آرا ہوئے تو ان کی واحد مصلحت اسلامی تھی۔ جس کا اجارہ انہیں خدا کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ ان کے نزدیک لیگ اسلام کی طرف سے محض بے پرواہ ہی نہ تھی بلکہ دشمن اسلام تھی۔ ان کے نزدیک قائداعظم ''کافر اعظم'' تھے اسلامی طرز زندگی صرف انہی کو معلوم تھا اور مسلم لیگ کا ہر شخص مذہب سے سخت بیگانہ ہو کر زندگی بسر کر رہا تھا۔ انہوں نے اسلام کو حربہ بنا کر مسلم لیگ کو شکست دینے کی جو کوشش کی وہ احراری لیڈر مولانا مظہر علی کے بعض اقوال سے واضح ہوتی ہے۔ انہی مولانا سے وہ شعر منسوب کیا جاتا ہے۔ جس میں قائداعظم کو ''کافر اعظم'' کہا گیا تھا۔ یہ صاحب شیعہ ہیں لیکن انہیں ''مدح صحابہ'' جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اور لکھنؤ کے شیعہ سنی فسادات کے ایام میں انہوں نے اور ان کے بیٹے یہی نعرہ اختیار کیا تھا جس سے ہر شیعہ غضبناک ہو جاتا تھا۔ اور یہ دونوں شیعہ سنی فسادات کی آگ کو بھڑکانے کے لیے لاہور سے لکھنؤ گے تھے۔ بھاٹی دروازے کے بار احراریوں

کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مظہر علی اظہر نے کہا کہ میں گزشتہ دو تین مہینوں سے مسلم لیگ سے سوال کر رہا ہوں کہ آیا پاکستان میں صحابہ کرام کے ناموں کی عزت کی جائے گی۔ لیکن مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کانگرسی وزارتوں کے صوبوں میں جہاں اب تک انگریز کا راج ہے اور مسلم لیگ کو اقتدار حاصل نہیں۔ لیگ والے صحابہ کا نام احترام کے ساتھ لینے کی اجازت نہیں دیتے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر لیگ برسر اقتدار آ گئی تو کیا پھر بھی صورت حالت یہی رہے گی جو آج لکھنو میں اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں رونما ہے اور آیا ''مدح صحابہ'' جرم قرار پائے گی؟ آگے چل کر انہوں نے پوچھا کہ اگر لکھنو اور محمود آباد میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے لیے مدح الفاظ زبان پر نہیں لائے جا سکتے تو لیگ کے پاکستان میں کیا حالت ہو گی اور مسلمانوں کو ایسے پاکستان سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے (حوالہ شہباز مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۴۵ء)

نوائے وقت نے اپنی اشاعت مورخہ ۲ نومبر ۱۹۴۵ء میں ایک مکتوب شائع کیا جو انہی صاحب نے ایک اور احراری لیڈر کو لکھا تھا۔ چونکہ اس مکتوب کے اصلی ہونے پر سوال اٹھایا گیا تھا اس لیے ہم نے اس کے متعلق مولانا مظہر علی اظہر کا بیان لیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے قطعی طور پر یاد نہیں ہے کہ میں نے یہ مکتوب لکھا ہو لیکن چونکہ یہ مکتوب لاہور کے ایک ممتاز اخبار میں شائع ہوا اور مولانا نے کوئی تردید نہیں کی اس لیے اس کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ اصل مکتوب نوائے وقت کے قبضے میں موجود تھا اور اگر ضرورت پیش آتی تو اس مکتوب کے لکھنے والے کی شخصیت قطعی طور پر ثابت کر دی جاتی۔ اس مکتوب کا موضوع بھی ''مدح صحابہ'' ہی ہے اور یہ یاد رہے کہ مولانا خود شیعہ ہیں۔ اس چٹھی میں مولانا نے لکھا کہ مدح صحابہ کا حربہ مسلم لیگ کے خلاف موثر طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور الیکشنوں کے نتائج خواہ کچھ بھی ہوں اس مسئلے پر مسلم لیگ اور حکومت دونوں کو ہتھیار ڈال دینا پڑیں گے۔ مولانا کے اس طرز عمل سے بالکل واضح ہے کہ احرار اور دوسری جماعتیں اپنے سیاسی مقاصد کے لیے کس قدر آسانی سے مذہب کو استعمال کر لیتی ہیں۔

اس سلسلے میں ہم اسی قسم کی ایک اور کوشش کا ذکر بھی کریں گے جو خود مسلم لیگ نے ۱۹۴۶ء میں قیام پاکستان کی جدوجہد میں بڑے بڑے پیروں اور مشائخوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے کی

تھی۔ مسلم لیگ نے عوام کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے بارہ ممبروں کی ایک مشائخ کمیٹی مقرر کی جن میں سے بعض نہایت علی مرتبت مذہبی پیشوا تھے۔ مثلاً پیر صاحب مانکی شریف، پیر جماعت علی شاہ، خواجہ نظام الدین (تونسہ شریف) مخدوم رضا شاہ ملتانی وغیرہم۔ لیکن اس معاملے کا ایک نہایت دلچسپ پہلو یہ ہے کہ خان افتخار حسین خان ممدوٹ، سردار شوکت حیات خان، ملک فیروز خان نون اور نواب محمد حیات قریشی بھی جو اپنی مذہبیت کے اعتبار سے چنداں مشہور نہ تھے اس کمیٹی میں شامل کر لیے گئے تھے اور انہیں بھی مذہبی القاب دے گئے تھے۔ یعنی خان افتخار حسین خان ممدوٹ کو ''پیر ممدوٹ شریف'' سردار شوکت حیات خان کو ''سجادہ نشین واہ شریف'' ملک فیروز خان نون کو ''دربار سرگودہا شریف'' اور نواب محمد حیات قریشی کو ''سجادہ نشین سرگودہا شریف'' ظاہر کیا گیا۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کمیٹی کے سیکرٹری مسٹر ابراہیم علی چشتی کو ''فاضل ہند سجادہ نشین پیسہ اخبار شریف'' کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اس سے مشائخ کمیٹی کے تقرر کا واحد مقصد یہی ہوسکتا تھا کہ صوبے کے اہم سیاسی لیڈروں کو مسلمہ حیثیت کے مذہبی پیشواؤں میں خلط ملط کر دیا جائے اور انہیں مذہب کے نمائندوں کی حیثیت دے دی جائے تا کہ موقع آنے پر وہ عوام کو آسانی سے متاثر کر سکیں۔ اور موجودہ شورش ہی کے دوران میں احراری ''اخبار'' ''آزاد'' کے دو پرچوں میں (۷ دسمبر اور ۱۶ دسمبر ۱۹۵۲ء دو تقریریں درج ہوئیں ہیں۔ ایک حافظ قمر الدین سجادہ نشین سیال شریف کی اور دوسری قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی جن میں نہ صرف مذہبی بغاوت کو جائز بلکہ کار ثواب قرار دیا گیا۔

396

جہاں تک احراریوں کا تعلق ہے انہوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لے مذہب کا مسلسل استعمال کیا ہے۔ انہوں نے کانگرس کو ترک کیا تو مذہبی وجوہ کی بنا پر کیا اور مسلم لیگ اور پاکستان کی مخالفت کی تو وہ بھی مذہبی بنا پر کی۔ مولانا مظہر علی اظہر نے ۱۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو امرتسر میں ایک بیان دیا کہ مسلم لیگ کا نعرہ پاکستان محض ایک سٹنٹ ہے اور میں نہ مسٹر جناح کو قائد اعظم مانتا ہوں نہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ تسلیم کرتا ہوں کیونکہ مسٹر جناح کی زندگی غیر اسلامی ہے۔ انھوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ پاکستان کے نعروں سے گمراہ نہ ہوں اور آئندہ الیکشن میں ان لوگوں کو ووٹ دیں جو جمہور کی خدمت کر رہے ہیں۔ ''ملاپ'' (لاہور) نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۵ء میں

احراری لیڈر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ایک تقریر شائع کی جو انہوں نے علی پور کی احرار کانفرنس میں کی تھی۔ اس تقریر میں امیر شریعت نے ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کہ مسلم لیگ کے لیڈر ''بے عملوں کی ٹولی'' ہیں جنہیں اپنی عاقبت بھی یاد نہیں۔ اور جو دوسروں کی عاقبت بھی خراب کر رہے ہیں اور وہ جس مملکت کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں وہ پاکستان نہیں بلکہ ''خاکستان'' ہے۔ اسی رہبر محترم نے پسرور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اب تک کسی ماں نے ایسا بچہ نہیں جنا جو پاکستان کی ''پ'' بھی بنا سکے (حوالہ استقلال نمبر روزنامہ جدید نظام ۱۹۵۰ء) چودھری افضل حق احراری لیڈر نے مسلم لیگ کے تصور پاکستان کے خلاف بہت طنزیہ اور توہین آمیز باتیں کہیں جو ''خطبات احرار'' کے صفحات ۴۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ اور ۹۹ پر درج ہیں۔ مولوی محمد علی جالندھری نے ۱۵ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور میں تقریر کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ احرار پاکستان کے مخالف تھے اور ان کے اس عقیدے کی وجوہ عنقریب لوگوں پر ظاہر ہو جائیں گی۔ اس مقرر نے تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد بھی پاکستان کے لیے ''پلیدستان'' کا لفظ استعمال کیا اور ہمارے سامنے کیپٹن عبدالحی کی جو شہادت پیش ہوئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فسادات کے دوران میں احراری لیڈر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور میں جو تقریریں کیں ان میں سے ایک تقریر میں انہوں نے کہا کہ پاکستان ایک بازاری عورت جس کو احرار نے مجبوراً قبول کیا ہے۔

تقسیم کے موقع پر احراری ایک دل شکستہ اور مایوس جماعت کی حیثیت میں پاکستان آئے بعض احراری لیڈر وہیں رہ گئے۔ اور ''زمیندار'' مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کی شائع کردہ ایک رپورٹ کی رو سے آل انڈیا مجلس احرار نے ایک قرارداد منظور کی جس میں قرار دیا گیا کہ آج احراری تنظیم ختم کی جاتی ہے کیونکہ ہندوستان میں کانگرس کے سوا کسی دوسری سیاسی تنظیم کا وجود مناسب نہیں۔ اس قرارداد میں مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ کانگرس میں شامل ہو جائیں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت کو تسلیم کر لیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی آئندہ سرگرمیاں خدمت خلق تک محدود رہیں گی۔ اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے مذہبی حقوق کی حفاظت کے لیے جمعیۃ العلماء کی تنظیم میں شامل ہو جائیں۔ پاکستان میں وہ کچھ مدت تک خاموش رہے اور اپنے لیے کوئی نیا نظریہ سوچنے کی کوشش

کرتے رہے۔ انہوں بار بار کہا کہ وہ سیاسیات سے دستبردار نہیں ہوئے اور ان کا ارادہ ہے کہ پاکستان میں حزب اختلاف کی شکل اختیار کریں (حوالہ ''آزاد'' ۲۶ دسمبر ۱۹۵۰ء، ۲۷ مئی ۱۹۵۲ء اور تعمیر نو ۵ دسمبر ۱۹۴۹ء۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ احراری ایک مدت تک بے حرکت رہنے کے بعد ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے بیدار ہونے لگے تھے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ پاکستان میں ان کے پرانے نظریات کے لیے کوئی گنجائش نہیں اور مسلم لیگ انہیں ابھرنے کا موقع نہ دے گی تو انہوں نے سیاسی میدان میں مسلم لیگ کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور اعلان کیا کہ آئندہ وہ تبلیغ میں مصروف رہیں گے لیکن ہمارے سامنے تسلیم کیا گیا ہے کہ احمدیوں کے سوا دوسرے غیر مسلموں کو مسلمان بنانا ان کے لائحہ عمل میں شامل نہ تھا اور تبلیغی سرگرمی کو صرف احمدیوں کے خلاف جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ احمدیوں کے ساتھ احرار کی دشمنی ایک چوتھائی صدی سے چلی آ رہی ہے اور اگرچہ یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ تقسیم سے پہلے انہیں احمدیوں سے اور ان کے عقیدوں اور ان کی سرگرمیوں سے بہت زیادہ سروکار نہ تھا لیکن یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اب احراریوں نے احمدیوں کے خلاف نزاع کو اپنے اسلحہ خانے سے ایک سیاسی حربے کے طور پر باہر نکالا اور جو واقعات اس کے بعد پیش آئے وہ اس امر کی شہادت ہیں کہ وہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے انتہائی فہم اور چالاک ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ اگر وہ عوام کے جذبات کو احمدیوں کے خلاف برانگیختہ کر دیں گے تو کوئی ان کی مخالفت کی جرات نہ کرے گا۔ اور ان کی اس سرگرمی کی جتنی بھی مخالفت کی جائے گی اسی قدر وہ ہر دلعزیز اور مقبول عام ہو جائیں گے اور بعد کے واقعات سے ظاہر ہو گیا کہ ان کا یہ مفروضہ بالکل صحیح تھا۔ لہذا انہوں نے اپنی پوری توجہ احمدیوں پر مرتکز کر دی اس کے بعد خواہ تبلیغ کانفرنس یا دفاع کانفرنس یا استحکام کانفرنس یا یوم تشکر یا یوم مطالبات کی تقریبات ہوں یا محض مویشیوں کا میلہ ہو۔ ان کانفرنسوں اور یوموں وغیرہ کے نام محض دھوکا تھے اور ان کا سب سے بڑا موضوع احمدی اور احمدیت ہوتا تھا۔ اگر وہ اس مذہبی نزاع کو دوسرے مذہبی نزاعات کی طرح جاری رکھتے تو غالباً ان کو بہت زیادہ تائید و حمایت حاصل نہ ہوتی۔ لیکن وہ اپنی عیاری کی وجہ سے خوب جانتے تھے کہ مسلمانوں کے جذبات کسی موضوع پر اس

اطلاع احرار میں سے صرف انہی کو تھی جنہوں نے وہ پیمان کیا تھا) کہ وہ احمدیوں کو نہ قتل کریں گے نہ لوٹیں گے۔ نہ بے آبرو کریں گے تو حکومت نے جھٹ اس یقین دہانی کو تسلیم کر لیا۔ لہٰذا جن احراری مجرموں کو سزائیں ہو چکی تھیں وہ رہا کر دیے گئے اور زیر سماعت مقدمے اور دفعہ ۱۴۴ کے احکام واپس لے لیے گئے۔ اس کے بعد احرار نے اپنی روایات کے مطابق اپنی سرگرمیاں زیادہ زور وشور سے شروع کر دیں اور چونکہ دفعہ ۱۴۴ کے احکام نافذ ہی نہ تھے جن کی خلاف ورزی کا سوال پیدا ہوتا اس لیے ان کے خلاف کوئی مقدمات دائر نہ ہوئے۔ اور حکام اضلاع نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔

خواجہ ناظم الدین سے گفت وشنید شروع ہوئی اور جنوری کی کراچی کنونشن اور اس کی قائم کردہ مجلس عمل کی طرح یہاں بھی احرار ہی کا غلبہ وتسلط رہا۔ رضا کاروں کی بھرتی اور سرمایے کی فراہمی کا کام تمام تر احرار ہی کر رہے تھے اور جب مولانا اختر علی خاں نے تحفظ ختم نبوت کے نام پر خود روپیہ جمع کرنے کی کوشش کی تو اس پر بہت کم لوگوں نے لبیک کہی۔ لہٰذا سول بغاوت کا سارا سروسامان احرار ہی کا کیا دھرا تھا۔

آل مسلم پارٹیز کانفرنس بھی احرار ہی کی ساختہ پرداختہ تھی اور اس کی کارروائیوں پر بھی انہی کا غلبہ رہتا تھا مجلس عمل میں ان کو ان کے حصے سے زیادہ نمائندگی حاصل تھی اور مجلس کے بعض ممبر جو دوسری جماعتوں کے نامزد کیے ہوئے تھے وہ بھی اصل میں احراری ہی تھے۔ بالآخر گرفتاری اور قید میں بھی احراریوں کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ پس وہ فسادات کے لیے براہ راست ذمہ دار تھے۔

احرار کے رویے کے متعلق ہم نرم الفاظ استعمال کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کا طرز عمل بطور خاص مکروہ اور قابل نفرین تھا۔ اس لیے کہ انہوں نے ایک دنیاوی مقصد کے لیے ایک مذہبی مسئلے کو استعمال کر کے اس مسئلے کی توہین کی اور اپنے ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے عوام کے مذہبی جذبات و حسیات سے فائدہ اٹھایا۔ اس بات پر صرف احرار ہی یقین رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال میں مخلص تھے کیونکہ ان کی گزشتہ تاریخ اس قدر واضح طور پر غیر مستقل رہی ہے کہ کوئی احمق ہی ان کے دعوئے مذہبیت سے دھوکا کھا سکتا ہے۔ خواجہ ناظم الدین نے ان کو دشمنان پاکستان قرار دیا اور وہ اپنی گزشتہ سرگرمیوں کی وجہ سے اسی لقب کے مستحق تھے۔ ان کے بعد کے رویے سے یہ واضح ہو گیا کہ نئی مملکت

MunirReport.pdf

کے وجود میں آنے کے بعد وہ اس کے مخالف ثابت ہوئے، جو پارٹی پاکستان اور مسلم لیگ اور اس کے تمام لیڈروں کی مخالفت اور کانگرس کی محض ایک کنیز تھی۔ اس کے لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنے گزشتہ نظریات کو ترک کر دیتی اور قیام پاکستان پر جو اس کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود وجود میں آ گیا تھا۔ راتوں رات اپنے عقائد کو بدل کر اس مملکت میں اسلام کی واحد اجارہ دار بن بیٹھتی جس کے قیام کے خلاف اس نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور دیا تھا۔ کیا احرار پر اپنے نصب العین کا انکشاف تقسیم کے بعد ہی ہوا تھا؟ پاکستان کے لیے اسلامی مملکت کا جو نعرہ وہ لگا رہے تھے وہ اس وقت کہاں تھا۔ جب وہ ان جماعتوں اور ان لوگوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے جو مسلمانوں کے لیے صرف ایک وطن کا مطالبہ کر رہے تھے؟ کیا ان کے ہندوستانی ساتھیوں کو جواب تک احرار ہی کہلاتے ہیں۔ کانگرس نے یہ کام سپرد نہیں کیا کہ وہ کشمیریوں کو بخشی کی حکومت گوارا کرنے پر آمادہ کریں؟

اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو صرف پاکستان کے سادہ لوح لوگ ہی احراریوں کے مذہبی جوش کے اظہار سے دھوکا کھا کر بے وقوف بن سکتے ہیں۔ وہ جن نظریات کو پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہیں ان کو اختیار کرنے کے متعلق ذرا ان کے صدر کے خیالات سنیے:

سوال۔ کیا آپ کو اقبال اور نہرو کے اختلاف کا کچھ علم ہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ از راہ کرم بیان فرمائیے کہ ان دونوں کے درمیان کس موضوع پر اختلاف تھا؟

جواب۔ نہرو وطن پر زور دیتے تھے لیکن علامہ اقبال مذہب پر اصرار کرتے تھے۔

سوال۔ تو گویا احرار کے اور علامہ اقبال کے نظریوں کے درمیان کھلا ہوا تصادم موجود تھا؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال۔ پھر احرار نے اپنا نظریہ تبدیل کیوں کر لیا؟

جواب۔ جب تک ہم کانگرس کے ساتھ تھے ہم سیاسی پارٹی تھے لیکن جب پاکستان وجود میں آ گیا تو ہم نے اپنے آپ کو ایک مذہبی پارٹی میں تبدیل کر لیا۔

سوال۔ جب احراری کانگرس کا ساتھ دے رہے تھے تو کیا وہ اس امر کو جزو مذہب سمجھتے تھے

402

اس تبصرے کی کوئی ضرورت نہیں کہ پاکستان میں احرار کا سا ماضی رکھنے والی جماعت بھی اگر ایک بظاہر معقول مذہبی شاخسانہ کھڑا کر دے تو وہ حکومت کا تختہ الٹ سکتی ہے۔

احمدی

احمدی براہ راست فسادات کے لیے ذمہ دار نہ تھے۔ کیونکہ فسادات حکومت کے اس اقدام کا نتیجہ تھے جو حکومت نے اس پروگرام کے خلاف کیا تھا جو ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد کے ماتحت آل مسلم پارٹیز کنونشن نے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن مطالبات کا تعلق احمدیوں سے تھا اور وہ مطالبات اس لیے وجود میں آئے تھے کہ احمدیوں کے بعض عقائد اور ان کی سرگرمیاں مخصوص انداز کی تھیں اور وہ دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ اور ممیز ہونے پر زور دے رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مطالبات احمدیوں کے عقائد اور ان کی سرگرمیوں ہی کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ لہٰذا یہ معین کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ آیا فسادات کے اشتعال میں احمدیوں کا بھی کوئی حصہ تھا۔ عامتہ المسلمین کے ساتھ ان کے اختلافات نصف صدی سے زیادہ مدت سے چلے آ رہے تھے۔ اور تقسیم سے پیشتر وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اپنے پروپیگنڈے اور اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف تھے تاہم قیام پاکستان سے صورت حالات بالکل بدل گئی۔ اس کے بعد اگر احمدی یہ سمجھتے تھے کہ اب اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کی تلقین یا اسلام کے اندر فرقہ وار عقائد کی تبلیغ کی اجازت جن حدود کے اندر دی جائے گی۔ ان کے متعلق اگر وہ کوئی پالیسی وضع نہ کریں گے جب بھی ان کی سرگرمیوں کے خلاف کوئی برہمی پیدا نہ ہوگی اور نئی مملکت میں ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا تو وہ گویا اپنے آپ کو دھوکا دے رہے تھے۔ تاہم بدلے ہوئے حالات کے مطابق ان کی سرگرمیوں اور ان کی جارحانہ نشر و اشاعت میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوا اور غیر احمدی مسلمانوں کے خلاف دل آزار باتیں برابر کہی جاتی رہیں۔

کوئٹہ میں مرزا بشیر الدین محمود احمد نے جو تقریر کی وہ نہ صرف نامناسب بلکہ غیر مآل اندیشانہ اور اشتعال انگیز تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے بلوچستان کے صوبے کی پوری آبادی کو احمدی بنا لینے

404

اوراس صوبے کومزید جدوجہد کے مرکز کی حیثیت سے استعمال کرنے کی علی الاعلان حمایت کی۔اسی طرح جب انہوں نے اپنے پیروؤں کو یہ ہدایت کی کہ تبلیغ احمدیت کے پروپیگنڈے کو تیز کردیں تاکہ ۱۹۵۲ء کے آخر تک پوری مسلم آبادی احمدیت کی آغوش میں آجائے تو گویا مسلمانوں کو تبدیلی مذہب کے متعلق سرگرمیوں کا کھلا نوٹس دے دیا اور جب مرزا غلام احمد کو نہ ماننے والوں کے متعلق ''دشمن'' یا ''مجرم'' یا محض ''مسلمان'' کے الفاظ استعمال کیے گئے تو جن لوگوں کی توجہ ان اشارات کی طرف مبذول کرائی گئی ان کا مشتعل ہونا لازمی تھا۔احمدی افسروں نے لوگوں کو احمدی بنانے کی مہم میں ازسرتاپا مصروف ہوجانا اپنا مذہبی فریضہ خیال کیا۔ان کے اس رویے کی وجہ سے احمدیوں کو اس امر کا حوصلہ ہوا کہ جہاں کہیں انہیں افسروں کی حمایت حاصل تھی یا حاصل ہونے کی توقع تھی وہاں اپنے مقصد کے حصول میں زوروشور سے مصروف ہوجائیں۔ہمیں پورا یقین ہے کہ اگر ضلع منٹگمری کا حاکم اعلیٰ احمدی نہ ہوتا تو احمدیوں کو ہرگز جرات نہ ہوتی کہ غیر احمدی دیہات کے علاقے میں کھلم کھلا اپنے تبلیغی مشن پر روانہ ہوجاتے۔جب کوئی سرکاری افسر اپنے فرقہ ورانہ عقائد کا علےٰ لاعلان اظہار کرتا ہے۔جیسے کہ بعض احمدی افسروں نے کیا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ جن تنازعات میں اس کی جماعت کا کوئی فرد ایک فریق ہو ان میں اس کی غیر جانب داری پر کسی کو اعتماد نہیں رہتا۔اس کا فیصلہ کتنا ہی صحیح اور دیانت دارانہ ہو لیکن اگر وہ فیصلہ اس فریق کے خلاف ہو جو اس افسر کی جماعت سے تعلق نہ رکھتا ہو تو اس فریق کو یہ یقین دلانا غیر ممکن ہے کہ اس کو فرقہ وارو جوہ کی بنا پر ناانصافی کا شکار نہیں بنایا گیا۔لہٰذا ان افسروں کا طرز عمل نہایت افسوسناک تھا اور اس امر کا مظہر تھا کہ وہ اس اصول کے فہم سے بالکل قاصر ہیں جس کے ماتحت کسی سرکاری افسر کو اپنا ظاہری رویہ معین کرنا چاہیے۔لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ اگرچہ احمدی براہ راست فسادات کے ذمے دار نہیں ہیں لیکن ان کے خلاف عام شورش کا موقع خود انہی کے طرز عمل نے بہم پہنچایا۔اگر ان کے خلاف احساسات اتنے شدید نہ ہوتے تو ہم نہیں سمجھتے کہ احراری اس حالت میں بھی ہر قسم کی مختلف مذہبی جماعتوں کو اپنے گرد جمع کرنے میں کامیاب ہوجاتے۔

ڈھالے مفہوم میں نہ لیا جائے بلکہ اس کا شدید اور معین مطلب سمجھا جائے لیکن متعدد اضلاع میں مسلم لیگ کے ممبروں نے دل و جان سے تحفظ ختم نبوت کی تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا۔اس ہدایت کی طرف بھی کوئی توجہ نہ کی گئی کہ مسلم لیگ کو ایسی سرگرمیوں میں حصہ نہ لینا چاہیے جن سے پاکستانی شہریوں کے مختلف طبقوں کے درمیان بیگانگی یا دشمنی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔اور لیگ کے عہدہ دار اور ممبر بلکہ مجلس قانون ساز کے وہ ممبر جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔بے تکلف اس تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔اگر کبھی ان سرگرمیوں کی اطلاع صوبائی مسلم لیگ کو موصول بھی ہوئی تو اس نے اس کی پروا نہ کی اور بعض ممبروں نے جو استفسارات اس سلسلے میں کیے ان کا بھی کوئی قطعی جواب نہ دیا گیا۔سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ نے اپنے ایک اجلاس منعقدہ ۱۷ جولائی ۱۹۵۲ء میں ایک قرارداد منظور کی۔جس میں اعلان کیا کہ ختم نبوت اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے۔مساجد پر دفعہ ۱۴۴ کے احکام کے اطلاق کی مخالفت کی ان احکام کو مداخلت فی الدین قرار دیا۔اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ نہ صرف ان احکام کو واپس لے بلکہ ان کی خلاف ورزی کی وجہ سے جو مقدمات دائر کیے گئے ہیں ان کو بھی واپس لے لے۔سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ کی قرارداد کے بعد ۲۰ جولائی کو سٹی مسلم لیگ سرگودہا نے بھی ایک قرارداد منظور کی جس میں مطالبہ کیا کہ احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔اور صوبائی مسلم لیگ اور آل پاکستان مسلم لیگ سے استدعا کی کہ وہ اس قسم کا اعلان کرانے کی غرض سے عملی تدابیر اختیار کریں اسی قسم کی ایک قرارداد میں سٹی مسلم لیگ کامونکے نے قادیانیوں کو مسلم لیگ کی ممبری کے حق سے محروم قرار دیا۔اور لیگ سے انکے اخراج کا مطالبہ کیا۔جن اہم لیگی اشخاص نے احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے متعلق قراردادوں کی حمایت کی (اور وہ قراردادیں صوبائی مسلم لیگ کے اس سالانہ اجلاس میں ۲۶۔۲۷ جولائی ۱۹۵۲ء میں منعقد ہونے والا تھا میں پیش کرنے کے لیے بھیج دی گئیں) ان اشخاص کے نام درج ذیل ہیں:

قاضی مرید احمد ایم ایل اے کونسلر پنجاب مسلم لیگ

صاحبزادہ محمود شاہ (گجرات) کونسلر پنجاب مسلم لیگ

محمد اسلام الدین ایم ایل اے

کے تسلیم کرانے کے لیے ضروری تدابیر اختیار کر سکتا ہے اس کے بعد کسی شخص کو یہ کہنے کی جرات نہ ہو سکتی تھی کہ احمدی ایک الگ قوم نہیں ہیں بلکہ دائرہ اسلام کے اندر ہیں اور ان کے خلاف جو مطالبات کیے جا رہے ہیں وہ بے بنیاد اور غیر حق بجانب ہیں اور مسترد کر دینے چاہیں۔ جب مطالبات کو جائز و حق کو جائز وحق بجانب قرار دیا جا چکا تو اس کے بعد یہ لازم ہو گیا کہ ان کے متعلق ہر قسم کے معروضات اور دعوے مرکز میں پیش ہونے چاہیں اور ان مطالبات کو تسلیم کرانے کے لیے ہر قسم کی سرگرمیوں کا رخ مرکزی ارباب اختیار کی طرف ہونا چاہیے۔ یعنی خواجہ ناظم الدین کی طرف جو آل پاکستان مسلم لیگ کے لیڈر اور پاکستان کے وزیر اعظم ہیں کیونکہ اگر وہ چاہیں تو پارٹی کے اجلاس میں ان مطالبات کو تسلیم کرا کر دستور ساز اسمبلی سے بھی منظور کرا سکتے ہیں۔ لہٰذا حالات نے یہی صورت اختیار کر لی اور خواجہ ناظم الدین اپنے آپ کو ایک دشوار حالت میں پا کر بے حد مضطرب ہوئے بالکل اسی طرح جیسے دولتانہ صاحب اس صورت میں مضطرب ہوتے، اگر مطالبات کا تعلق صوبائی حکومت سے ہوتا۔

اب سرگرمیوں کا مرکز کراچی میں منتقل ہو گیا اور علما کے وفد پر خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کر کے مطالبات پر گفتگو کرنے لگے۔ علما کے ساتھ ان ملاقاتوں اور ان کی سرگزشتوں کے تفصیلی حالات اس سے قبل بیان کیے جا چکے ہیں۔ چونکہ خواجہ صاحب نہایت مذہبی آدمی اور مخلص و راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ اس لیے انہوں نے اس موقع پر اپنے آپ کو عجب گومگو کی حالت میں پایا۔ وہ جلیل القدر علما کے دلائل کو رد نہ کر سکتے تھے کیونکہ وہ دلائل خود ان کے عقائد کے مطابق تھے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ قائد اعظم کے انتقال، قرارداد مقاصد کی منظوری اور مجلس اصول اساسی کی سفارشات کے وقت سے علماء کو مملکت میں بڑا اقتدار حاصل ہو چکا ہے۔ اگر وہ مطالبات کو رد کر دیتے تو خود ان کے بیان کے مطابق علماء سے ان کا کھلم کھلا تصادم ہو جاتا اور وہ اس صورت سے ہر حال میں بچنا چاہتے تھے۔ وہ ان مطالبات کو تسلیم بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پاکستان ضحوکۂ روزگار بن جاتا اور بین الاقوامی دنیا پر اس دعوے کی حقیقت کھل جاتی کہ پاکستان ایک ترقی پذیر روشن خیال اور جمہوریت پسند مملکت ہے۔ تسہیل اور مفاہمت کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اگرچہ مسئلہ بالکل

ذیل فہرست سے معلوم ہوگا کہ ہر ضلع میں مسلم لیگ کے کتنے ممبر اس شورش میں شامل ہوئے۔

لاہور	۲۶	منٹگمری	۱۸
سیالکوٹ	۲۸	جھنگ	۱۰
شیخوپورہ	۲۱	ڈیرہ غازی خان	۳
گجرات	۳۷	مظفر گڑھ	۱۶
سرگودھا	۵۸	ملتان	۲۱
جہلم	۹	گوجرانوالا	۴۳
راولپنڈی	۳۱	لائل پور	۶۱
کیمبل پور	۵	کل میزان	۳۷۷

ان حضرات نے جلوسوں میں حصہ لیا۔ پر تشدد ہجوموں کی قیادت کی۔ دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی خلاف ورزی کی۔ اور تحریک کی مالی امداد کے لیے سرمایہ فراہم کیا۔ اس فہرست میں جن اشخاص کے نام درج ہیں ان میں صوبے کی مختلف مسلم لیگیوں کے صدر، سینئر نائب صدر، نائب صدر، سیکرٹری، خزانچی اور دوسرے عہدہ دار شامل ہیں۔ ان میں سے چار صوبائی مسلم لیگ کے کونسلر ہیں۔ پانچ مسلم نیشنل گارڈ کے ممبر ہیں، دو ایڈووکیٹ ہیں اور ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر ہے۔ ان میں سے چوالیس زیر دفعہ ۳ (۳) اور چھ زیر دفعہ ۲۱ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ گیارہ زیر دفعہ ۱۸۸ تعزیرات پاکستان چھ زیر ضوابط مارشل لا، دو، لوٹ مار، آتش زنی اور قتل کے لیے اور ایک صاحب زیر دفعہ ۱۲۴الف ۱۵۳ الف تعزیرات پاکستان گرفتار کیے گئے۔ ان میں سے دو مفرور ہو گئے اور ایک کو تنبیہ کر کے چھوڑ دیا گیا۔ ایک نمبردار تھا جو اس عہدے سے برخاست کر دیا گیا اور ایک کے ریوالور کا لائسنس معطل کر دیا گیا۔

صوبائی مسلم لیگ ان تمام سرگرمیوں کو بالکل اطمینان سے دیکھتی رہی۔ اور ہمارے سامنے کاغذات کا جو بھاری ریکارڈ موجود ہے اس میں کہیں بھی اس امر کی شہادت موجود نہیں کہ صوبائی مسلم لیگ نے ایسی سرگرمیوں کو ناپسند کیا ہو بلکہ متعدد حلقوں کی طرف سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس تحریک

"پینتیس لاکھ مسلمان کشمیر میں موت کا سامنا کر رہے ہیں۔ اور یہ شخص (یعنی وزیراعظم پاکستان) اپنے آپ کو نہرو کا چھوٹا بھائی کہتا ہے۔ میں کہوں گا 'سگ باش برخوردمباش'

اس تقریر میں اس نے حکام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب انگریزوں کے چیلے اور بد اخلاق لوگ ہیں۔ قمار بازی کرتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ مسٹر نون چیف منسٹر سے ذکر کیا کہ ایک ضلع کا ڈپٹی کمشنر ساری رات جوا کھیلتا ہے۔ اور دن بھر عدالت میں اونگھتا رہتا ہے۔ یہ بارہ لاکھ انسانوں کا نمائندہ قمار باز اور زنا کار ہے۔ اس کا چال چلن نہایت مکروہ ہے۔ لیکن وہ صاحب بہادر ہے۔ اس شکایت پر کوئی کاروائی نہ کی گئی۔ عدالت میں اس گواہ کی شہادت اس طرح جاری رہی:

سوال۔ آپ نے اس قرارداد کا مسودہ تیار کیا تھا جو صوبہ مسلم لیگ کی کونسل کو بھیجی گئی تھی؟

جواب۔ قرارداد کا مسودہ کونسل کے اجلاس سے دس پندرہ دن پہلے تیار کیا گیا ہوگا۔

سوال۔ آپ نے اس قرارداد کا مسودہ تیار کرتے وقت کسی سے مشورہ کیا تھا؟

جواب۔ یہ میرا انفرادی فعل تھا۔

سوال۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس قرارداد میں خطرناک امکانات مضمر تھے؟

جواب۔ جی نہیں۔ میں جو قرارداد پیش کرنا چاہتا تھا اس میں مجھے کوئی خطرہ نظر نہ آتا تھا۔

سوال۔ کیا آپ نے قرارداد بھیجنے سے پہلے مسلم لیگ کے کسی اعلیٰ صاحب اختیار سے مشورہ کیا تھا؟

جواب۔ جی نہیں۔

سوال۔ کیا آپ ڈائریکٹ ایکشن کے حامی تھے؟

جواب۔ میں نہیں جانتا ڈائریکٹ ایکشن کی چیز ہے۔ جس عمل کا فیصلہ ہوا تھا وہ راست اقدام تھا۔

سوال۔ آپ نے راست اقدام کا لفظ پہلے پہل کب سنا؟

جواب۔ مجھے یاد نہیں۔

جواب۔ اگر کوئی مذہبی معاملہ پیش آجائے تو میں مسلم لیگ یا مسلم لیگی حکومت کی کوئی پروانہ کروں گا۔

اب ان اشخاص کی شہادتوں سے جو نتائج مترتب ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔ سٹی مسلم لیگ گوجرانوالہ میں دو حریف گروہ ہیں۔ یعنی مسٹر آفتاب احمد اور مسٹر منظور حسن کا گروہ۔ اور شیخ برکت علی اور شیخ محمد عاشق کا گروہ۔ پہلا گروہ برسر اقتدار ہے۔ اور بین السطور سے ظاہر ہے کہ ضلع کے انتظام حکومت پر اپنا قابو رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرا گروہ جو لیگ میں برسر اقتدار نہیں لیکن حکام ضلع کا پسندیدہ ہے پہلے گروہ کو بے دخل کرنے کا خواہش مند ہے۔ لہٰذا پہلا گروہ اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کی غرض سے کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہے جس سے اس کو مقبولیت عامہ حاصل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس گروہ کو ہر دلعزیز ہونے کے لیے ختم نبوت کی تحریک اور احمدیوں کے خلاف شورش سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا۔ لہٰذا اس گروہ کے نزدیک یہ بالکل جائز تھا کہ مساجد کے جلسوں پر دفعہ ۱۴۴ کے احکام کے اطلاق پر حکومت کی مذمت کرے۔ اس کے نزدیک وہ لوگ ہیرو تھے جن پر ان احکام کی خلاف ورزی کا الزام عائد ہوا۔ لہٰذا اس نے ان کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس نے حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ان احکام کو واپس لے لے کیونکہ ان سے مداخلت فی الدین لازم آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں سٹی مسلم لیگ نے مسلم لیگی حکومت کی تائید کرنے اور لوگوں کو یہ سمجھانے کے بجائے کہ مساجد کو ایک ایسی پارٹی کی جلسہ گاہ بنا دینا جو مسلم لیگ کی مخالف ہے، مساجد کی توہین ہے۔ حکومت کی مذمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اس مذمت سے برسر اقتدار گروہ زیادہ ہر دلعزیز ہوتا تھا۔ اور اس کے مخالف گروہ کی چالیں ناکام ہوتی تھیں۔ اسی مقصد سے مسٹر منظور حسن سیکرٹری سٹی مسلم لیگ نے احراریوں کے حلف نامے پر دستخط کیے۔ سرمایہ فراہم کیا۔ جلوسوں کی قیادت کی۔ اور ڈائریکٹ ایکشن کے پروگرام کے ماتحت ہر دوسری سرگرمی میں حصہ لیا۔ جب یہ گواہ کہتا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ جبر کے ماتحت کیا تو ہمیں اس کے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں آتا۔

قاضی مرید احمد سرگودھا میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ کوئی انکم ٹیکس ادا نہیں کرتا اور صرف بیس کنال زمین کا مالک ہے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح مسلم لیگ نے اس کو قانون ساز اسمبلی میں منتخب کرا

کوخوب سمجھنے لگا تھا کہ صوبجات میں پروپیگنڈا کرنا بے سود ہے۔ اور جب تک یہ مطالبات باقاعدہ طور پر دستور ساز اسمبلی میں پیش نہ کیے جائیں گے۔ اس شورش کا کوئی محسوس نتیجہ نہ نکلے گا۔ لہٰذا تمام جماعتوں نے جو مطالبات کی منظوری کے لیے چیخ پکار کر رہی تھیں اپنی تمام سرگرمیوں کا رخ مرکزی حکومت کی طرف کر دیا جس کے رئیس خواجہ ناظم الدین تھے۔ اس لیے اگر خواجہ ناظم الدین ان مطالبات کو تسلیم نہ کر سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ڈائریکٹ ایکشن شروع ہو گیا اور فسادات پھوٹ پڑے تو واقعات کی ذمہ داری واضح طور پر مسلم لیگ پر بھی اس طرح عائد ہوتی ہے۔ جس طرح آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس پر جس نے مطالبات وضع کیے تھے اور خواجہ ناظم الدین کے سینے پر پستول رکھ کر ان کے سامنے وہ مطالبات پیش کیے تھے۔ اس تمام دوران مسلم لیگ یا اس کے کسی لیڈر نے نہ تحریک کی مزاحمت کے لیے کچھ کیا اور نہ عوام کے سامنے کوئی مقابلے کا نظریہ پیش کیا۔ بلکہ اس کے برعکس مسلم لیگ نے اپنی قرارداد کے ذریعے سے اپنے آپ کو اس قدر ناقابل انکار طور پر پابند کر لیا تھا کہ وہ بعد میں اس رائے سے روگرداں نہ ہو سکتی تھی جو اس نے رسمی حیثیت سے اپنی قرارداد میں ظاہر کر دی تھی اور جس کے بہترین مفسر خود لیگ کے صدر صاحب تھے۔ اگر وہ ایسا کرتی تو انتہائی تحقیر اور غیر ہر دلعزیزی کا شکار ہو جاتی۔

ہمیں اس امر میں ذرا سا شبہ بھی نہیں ہے کہ اس تمام جھگڑے کے ایک سے زیادہ معقول [illegible]ب دیے جا سکتے تھے۔ اگر مسلم لیگ کے لیڈروں کو ان مطالبات کے نتائج کو پوری طرح سمجھنے کی [illegible]ی توفیق ہوتی اور وہ صوبے کو ذلت اور تباہی سے بچانے کے قابل اور اس کے خواہشمند ہوتے تو وہ ضرور اس میں کامیاب ہو جاتے۔ گوجرانوالہ اور سرگودھا کے مقدمات اور کیپ کے واقعہ میں بہت بڑے سبق پوشیدہ تھے۔ اگر وہ سبق صحیح طور پر پڑھائے جاتے تو عوام کی آنکھیں کھل جاتیں اور ان کو اس شورش سے باز رکھا جا سکتا تھا۔ جو چند سیاسی طالع آزماؤں نے ان کی حکومت کو شکست دینے کے لیے برپا کر رکھی تھی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمارا عام آدمی لازمی طور پر صحیح الدماغ ہے اور اگرچہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح بلکہ شاید ان سے زیادہ مذہبی واقع ہوا ہے لیکن اگر معاملات کو موزوں طریق پر اس کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ ان کی حقیقی صورت کو سمجھنے کی بھی پوری اہلیت رکھتا ہے وہ ایک نئی

مملکت کا دیانتدار اور محب وطن شہری ہے۔ اور اگر اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی کہ چند سیاسی مایوسین نے اپنے پرانے گناہوں کو دھونے کی غرض سے جس عمومی جذبے کو برانگیختہ کیا ہے اس کے امکانات نہایت خطرناک ہیں تو وہ اپنے لیڈروں کی بات ضرور سنتا۔ اگر بازار کے عام آدمی کو موزوں طریق پر بتایا جاتا کہ ایک سیاسی جماعت جو مسلم لیگ کے حریف کی حیثیت سے میدان میں آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مذہب کو محض ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کر کے عوام میں مقبول ہونا چاہتی ہے اور عام آدمی کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ تو وہ آدمی یقیناً اس بات کو سمجھ جاتا۔ گوجرانوالہ اور سرگودھا میں دفعہ ۱۴۴ کے احکام کی جو خلاف ورزیاں کی گئیں وہ اس امر کا واضح نمونہ تھی کیونکہ مذہب کو کس طرح سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ سرگودھا میں ایک باقاعدہ جلسہ عام جمعہ دن ایک مسجد میں دس بجے قبل دوپہر منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر ضرورت صرف اس کی تھی کہ اس جلسے کے منتظمین کو چیلنج دیا جاتا کہ آیا جمعہ کی نماز دس بجے ہوا کرتی ہے؟ اور پھر لطف یہ ہے کہ اس جلسے کے صدو راور اس کے مقررین کے ناموں کا اعلان اس سے پیشتر رسمی طور پر کیا جا چکا تھا۔ یہی کیفیت گوجرانوالہ میں ہوئی۔ احرار نے جلسے سے ایک دن پیشتر پوسٹروں اور لاؤڈ سپیکروں سے اس جلسے کا اعلان کیا اور ان اعلانات میں بیان کیا گیا کہ فلاں فلاں احراری لیڈر مختلف مقامات سے جلسے میں تقریریں کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ جب خطیب خطبہ پڑھ رہا تھا اس وقت پھر ایک شخص نے جلسے کا اعلان کیا اور یہ جلسہ اصل میں اس وقت منعقد ہوا جب نماز جمعہ ہو چکی۔ اگر مسلم لیگ کے لیڈر احراریوں کی ان چالوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے تو ہمیں ذرا بھی شبہ نہیں کہ لوگ اپنے رویے میں ترمیم کر لیتے اور حکومت کا نقطہ نگاہ کو سمجھ کر اس کی قدر کرتے۔

ہمارے سامنے جماعتوں کے فاضل وکیل نے بار بار جمہوریت کے اصولوں کا اعادہ کیا ہے۔ اور اس پر بہت زور دیا ہے کہ مطالبات متفقہ ہیں اور کسی جمہوری ملک میں جب کسی مطالبے کی حمایت و تائید قوی اور عالمگیر ہو جائے تو حکومت اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گی۔ خواہ اس تسلیم کے نتائج کچھ بھی ہوں یہ بھی کہا گیا کہ ہمارے سیاسی لیڈر چونکہ عوام کے ووٹ سے منتخب ہوئے ہیں۔ اور اپنی موجودہ کرسیوں پر محض اس لیے متمکن ہیں کہ عوام نے ان کو وہاں بٹھایا ہے۔ اس لیے ان کا

جماعت سے ان کا تعلق ہے اس کی حیثیت پر اس جذبے کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اب ٹپ کے واقعہ کو لیجیے۔ اس میں پولیس نے قوت کا استعمال کیا جس سے کچھ جانی نقصانات بھی ہوئے۔ بعد میں قوت کے اس استعمال کو ہائیکورٹ کے ایک جج نے جو اس واقعہ کی تحقیقات پر مامور ہوا تھا حق بجانب قرار دیا۔ لیکن جب اس واقعہ کی اطلاع موصول ہوئی اور اس پر عوام کے غیظ و غضب کا اندازہ کیا گیا تو حاکم نے سیاسی آدمی کے سامنے بالکل ہتھیار ڈال دیے اور صرف سزا یافتہ مجرمین ہی رہا نہ کر دیے گئے بلکہ زیر سماعت مقدمات اور دفعہ ۱۴۴ کے احکام بھی واپس لے لیے گئے۔ اس کے بعد احراریوں یا دوسرے شورش پسندوں کے خلاف کسی قسم کی موثر کاروائی نہ کی گئی۔ اور انہیں حسب منشا ہر مشکل اور ہر وسعت کا پروپیگنڈا کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ تنبیہ سے زیادہ کسی قسم کی موثر کاروائی نہ کی گئی اور تنبیہوں کا قصہ یہ ہے کہ وہ احراریوں کو بے شمار دفعہ کی گئیں، یہاں تک کہ ان کا اعادہ مذاق معلوم ہونے لگا اور ان کے علاوہ بھی مختلف افسروں نے مختلف موقعوں پر انہی لوگوں کو بار ہا تنبیہ کی اور اسی پر اکتفا کیا۔

بہت سے افسروں نے زیر دفعہ ۱۵۳ الف اور زیر دفعہ ۲۹۵ الف تعزیرات پاکستان بہت سے مقدمات چلانے کی سفارش کی۔ اور اس باب میں کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ جن لوگوں کے خلاف یہ قانونی کاروائی تجویز کی گئی تھی وہ ان دونوں دفعات کے ماتحت جرائم کے مرتکب ہوئے تھے لیکن نہ کسی مقدمے کے دائر کرنے کا حکم دیا گیا اور نہ کوئی مقدمہ دائر کیا گیا۔ گو بہت ہی آخری مرحلے پر ایک پر اسرار سا حکم دیا گیا تھا کہ جہاں معمولی قانون کے خلاف کسی جرم کا ارتکاب کیا جائے وہاں ملزموں کے خلاف قانونی کاروائی کی جائے۔ جو لوگ احمدیوں اور ان کے لیڈروں [illegible] انتہائی نفرت پھیلا رہے تھے ان کے خلاف مضبوط اور موثر کاروائی نہ ہونے کا نتیجہ ظاہر ہے۔ عقیدہ فرد کا ایک ذاتی معاملہ ہے اور خواہ وہ دوسروں کو کتنا ہی جھوٹا، غیر دیانت دارانہ اور مضحکہ خیز معلوم ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ اس عقیدے کے لوگ نہایت خلوص و دیانت سے اس پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور ہمیں اس حقیقت میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ احمدی اپنی جماعت کے بانی کا اور بعد کے لیڈروں کا جن میں موجودہ امام جماعت بھی شامل ہے انتہائی احترام کرتے ہیں لہٰذا ان شخصیتوں پر حملہ ہونے سے

اخبارات

ہم زمانہ زیر بحث کے دوران میں اخباروں کی سرگرمیوں کا ذکر اور ان پر تبصرہ تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ اس اعتبار سے بدترین مجرم ''آزاد''، ''زمیندار''، ''احسان''، ''آفاق'' اور ''مغربی پاکستان'' تھے۔ ان میں سے پہلا تو خالص احراری اخبار تھا۔ لیکن باقی چار یقیناً حکومت کے اثر کو قبول کر سکتے تھے کیونکہ وہ حکومت سے بڑی بڑی رقمیں وصول کر چکے تھے۔ ''آفاق'' عملاً مسٹر دولتانہ کا اپنا اخبار تھا۔ بہر کیف وہ براہ راست میر نور احمد کے اختیار اور نگرانی کے ماتحت تھا۔ جو ڈائریکٹر تعلقات عامہ کی حیثیت سے پالیسی کے معاملات میں مسٹر دولتانہ کے زیر اثر تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی طرح ہم بھی اس امر کا تصور نہیں کر سکتے کہ مسٹر دولتانہ اس مواد کی نوعیت اور مقدار سے بے خبر تھے جس کو اس طویل مدت کے دوران میں یہ اخبارات شائع کرتے رہے۔ اگر ''آفاق'' مورخہ یکم جون کا مقالہ تحریک کے متعلق اس کے گزشتہ رویے کا مظہر تھا تو اس وقت تک یہ اخبار اس نزاع کے متعلق معقول رائے ظاہر کر رہا تھا۔ لیکن جولائی کے اوائل میں اس کی پالیسی میں دفعتہً ایک انقلاب آیا اور اس نے نہ صرف اس شورش کی طرف غیر معمولی توجہ شروع کر دی بلکہ اس موضوع پر اپنے خیالات بالکل تبدیل کر لیے اور اس کے مضامین اپنی پالیسی اور دلائل کے اعتبار سے کاملاً مسلم لیگ کی قرارداد اور مسٹر دولتانہ کی تقریروں سے ہم آہنگ ہو گئے۔ غالباً اس نے اپنے خیالات قرارداد اور تقریروں سے مستعار لیے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے گو اس کی براہ راست کوئی شہادت نہیں کہ مسٹر دولتانہ اور میر نور احمد کے درمیان جو اس اخبار کی پالیسی کے نگراں تھے کچھ اشتراک عمل موجود ہو۔ تاکہ اس طوفان کا رخ کراچی کی طرف پھیر دیا جائے۔ بہرحال اس اخبار نے صوبہ مسلم لیگ کی قرارداد مورخہ ۲۷ جولائی کے بعد جو مضامین لکھے ان کا قدرتی اثر یہی تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ''زمیندار'' کی مقبولیت اور اشاعت کی وجہ یہ تھی کہ وہ احمدیوں کو متواتر دشنام و استہزا کا نشانہ بناتا رہا۔ تاہم ہمیں یقین نہیں ہے کہ اگر ڈائریکٹر تعلقات عامہ اس معقول مالی

نام لے کر جو عنقریب فاقہ کشی کا شکار ہونے والے تھے۔ علماء سے رحم کی درخواست کریں۔ لیکن اللہ کے منشا اور حکم کے سامنے وطن، قوم اور بھوک جیسی پست مصلحتیں کیا حقیقت رکھتی تھیں۔ اور اللہ ہی کے منشا اور حکم کے ماتحت علماء خواجہ ناظم الدین کے پاس آئے تھے۔ لہٰذا وہ اپنی ضد اور ہٹ پر پختگی سے قائم رہے۔ خواجہ ناظم الدین نے ان کو یاد دلایا کہ چودھری ظفر اللہ خان کو خود قائداعظم نے اس عہدے پر مقرر کیا تھا۔ کیا علما مملکت کے مرحوم بانی کے فیصلے کا احترام نہ کریں گے؟ لیکن دنیا کی ہر چیز بدل سکتی ہے مگر علما کی رائے جب ایک دفعہ قائم ہو جائے تو اس میں کوئی تغیر نہیں آ سکتا چنانچہ وہ اس دلیل سے بھی قائل نہ ہوئے۔ شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین نے ان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش بھی کی اور ایک فریق کو وزارت میں ایک عہدہ بھی پیش کیا۔ خواجہ ناظم الدین اس قدر بلند اخلاق اور عزت دار آدمی ہیں کہ ان سے ایسی چالوں کی توقع نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہ سیاسی آدمی بھی ہیں اور سیاسیات میں آدمی اکثر سیاسی آدمی ہو کر ہی رہ جاتا ہے اور علماء میں بھی ایسے آبرومند لوگ موجود ہیں جو جو عقائد کی پختگی اور جرات کے سرمایہ دار ہیں اور کسی دنیاوی کشش سے مسحور نہیں کیے جا سکتے لہٰذا پھوٹ ڈالنے اور رشوت دینے کی کوشش ناکام ہوگئی۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے ٹال مٹول کا طرزِ عمل اختیار کیا۔ بلکہ ایک دفعہ یہ ارادہ بھی کر لیا کہ پوری دنیائے اسلام کے علما کو جمع کر کے ان سے اس مشکل سے نجات دلانے کی استدعا کریں۔ لیکن علماء اب تک کافی انتظار کر چکے تھے اور مزید انتظار پر آمادہ نہ تھے چنانچہ انہوں نے ڈائریکٹ ایکشن کے پروگرام کا فیصلہ کر لیا۔

اب خواجہ ناظم الدین کے لیے اس کے سوا کوئی راہِ عمل باقی نہ رہی کہ اس چیلنج کو قبول کر لیں یا وزارت سے دست بردار ہو جائیں، انہوں نے پہلی راہ اختیار کی اور علما کو گرفتار کر لیا۔ اس واقعہ کے کئی ہفتے بعد جب پارلیمنٹ میں بجٹ پر عام مباحثہ ہو رہا تھا۔ خواجہ ناظم الدین نے ایک تقریر کی جس میں لاہور کے اندر مارشل لا کے اعلان کی وجہ بیان کرتے ہوئے علما کے اس فعل کو غیر جمہوری اور خلاف اسلام بتایا۔ آپ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اکثر علما ڈائریکٹ ایکشن کے خلاف ہیں اور صرف علما کے احراری گروہ نے یہ اقدام شروع کیا ہے لیکن ان کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ ڈائریکٹ ایکشن کی قرارداد ۱۸ جنوری ہی کی آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن میں اتفاق آرا

MunirReport.pdf

تقویت پہنچانے کی کوئی کوشش کی ۔ مولانا اختر علی خاں نے اس عدالت میں حاضر ہونے سے پہلے دو بیانات دیے تھے ۔ ایک اس وقت جب ان کا مقدمہ ایک خاص فوجی عدالت میں پیش تھا اور ایک درخواست کی شکل میں جو انہوں نے ۱۲ اپریل ۱۹۵۳ء کو موجودہ چیف منسٹر کو ارسال کی ۔ ان دونوں میں مولانا نے بیان کیا کہ مسٹر دولتانہ نے جن کے ساتھ ان کے خاصے گہرے تعلقات تھے ایک سے زیادہ دفعہ ان کو ہدایت کی کہ مرکزی حکومت کے خلاف تحریک کو چلائیں اور حکومت پنجاب کو اس سے باہر رکھیں ۔ فوجی عدالت والے بیان میں انہوں نے ماسٹر تاج الدین انصاری سے اپنی ایک گفتگو کا ذکر بھی کیا ۔ جس کے دوران میں انصاری نے بتایا تھا کہ مسٹر دولتانہ نے احمدیوں کے خلاف پراپیگنڈا سے اتفاق ظاہر کیا ہے ۔ اسی بیان میں آگے چل کر مولانا اختر علی خاں نے یہ بھی بتایا کہ ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا ابوالحسنات دونوں نے انہیں اطلاع دی تھی کہ ۱۶ فروری کو لاہور میں جو ہڑتال کی جارہی ہے اس کو ''برسراقتدار'' لوگوں کے زیر ہدایت منظم کر کے کامیاب بنایا جائے گا ۔

مولانا داؤد غزنوی نے بھی ایک فوجی افسر کے سامنے بیان دیتے ہوئے مسٹر دولتانہ کے خلاف اسی قسم کی باتیں کہیں ۔ مثلاً کہا کہ ایک دفعہ مولانا اختر علی خاں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ مسٹر دولتانہ نے تحریک کے لیے سرمایہ مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہے اور ایک اور موقع پر بعض لیڈروں نے جن میں ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا ابوالحسنات شامل تھے مجھے یہ بتایا تھا کہ اب وہ کراچی میں تحریک شروع کرنا چاہتے ہیں ۔ جب میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ جب تک ہم چیف منسٹر سے مشورہ نہ کر لیں لاہور میں ڈائریکٹ ایکشن کا آغاز نہیں کیا جاسکتا ۔ مولانا داؤد غزنوی نے اس بیان میں یہ بھی ذکر کیا کہ جو خیال ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا ابوالحسنات نے ظاہر کیا تھا اسکی تصدیق مولانا اختر علی خاں نے مجلس عمل کے اجلاسوں کے دوران میں کی اور مولانا اختر علی خاں نے مجلس عمل کے ایک بعد کے اجلاس میں اس امر کو تسلیم کیا تھا کہ مسٹر دولتانہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ پنجاب میں کوئی شخص احمدیوں کے خلاف تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے گرفتار نہیں کیا جائے گا ۔

اس تحقیقات میں جب ہم نے مولانا اختر علی خاں سے مسٹر دولتانہ کے ساتھ ان کی گفتگو کے

441

۱۹۵۳ء بھی شامل ہے اور جس کے اثرات کے متعلق ہم ''مسلم لیگ'' کے عنوان کے ماتحت اوپر پوری طرح بحث کر چکے ہیں۔ اخبارات کے بے شمار مضامین میر نور احمد ڈائریکٹر تعلقات عامہ کی سرگرمیاں اور دوسری کیفیاتی شہادت۔ خواجہ ناظم الدین نے اپنی شہادت میں ایک نہایت موزوں تشبیہ استعمال کی ہے اور شکایت کی ہے کہ مسٹر دولتانہ چاہتے تھے کہ میں ''ننھے کو لیے رہوں'' اگر مطالبات کو ایک ننھے بچے سے تشبیہ دی جائے تو ذمہ داری کے پورے موضوع کو ایک فقرے میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً احرار نے ایک بچہ جنا، جسے انہوں نے متبنیٰ بنانے کے لیے علماء کی خدمت میں پیش کیا۔ علماء نے اس کا باپ بننا منظور کر لیا۔ لیکن مسٹر دولتانہ نے سمجھ لیا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر پنجاب میں شرارت کرے گا۔ لہٰذا انہوں نے اس کو ایک نہر میں بہا دیا۔ جو میر نور احمد کی مدد سے کھودی گئی تھی اور جس کو پانی اخباروں نے اور خود مسٹر دولتانہ نے مہیا کیا تھا۔ جب یہ بچہ حضرت موسیٰ کی طرح بہتا ہوا خواجہ ناظم الدین تک پہنچا تو انہوں نے دیکھا کہ بچہ خوبصورت تو ہے لیکن اس کے چہرے پر ایک چین جبین اور غیر معلوم سی ناگواری نظر آتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو گود میں لینے سے انکار کیا۔ اور پرے پھینک دیا اس پر بچے نے ایڑیاں رگڑنا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ اس شور نے اس کی پیدائش کے صوبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور خواجہ ناظم الدین اور مسٹر دولتانہ دونوں کو موقوف کرا دیا۔ یہ بچہ ابھی زندہ ہے اور راہ دیکھ رہا ہے کہ کوئی آئے اور اسے اٹھا کر گود میں لے لے۔ اس مملکت خداداد کو پاکستان میں سیاسی ڈاکوؤں، طالع آزماؤں اور گمنام و بے حیثیت آدمیوں، غرض سب کے لیے کوئی نہ کوئی روزگار موجود ہے۔ ہمارے سامنے صرف دو ایسے آدمی ہیں جنہوں نے اس قسم کا روزگار قبول کرنے سے انکار کیا ہے یعنی سردار بہادر خان وزیر مواصلات اور مسٹر حمید نظامی ایڈیٹر ''نوائے وقت''۔ انہوں نے اس بچے کو اور اس کے تمام نتائج کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

نے عہد و پیمان کر لیا تھا اور مرکز علما سے مذاکرات کر رہا تھا۔

ختم نبوت۔ احمدیوں کے جنونی رجحانات

خود شورش کے متعلق مسٹر دولتانہ کا خیال یہ تھا کہ ختم نبوت کا عقیدہ اسلام کا ایک مقدس اصول ہے اور احمدی غیر مسلم ہیں۔ اس شورش کو خود احمدیوں کے مخصوص علیحدگی پسندانہ، ناقابل مفاہمت اور جنونی رجحانات سے تقویت پہنچی۔ احرار نے اپنے کھوئے ہوئے اعتماد اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے احمدیوں کے اس رویے سے فائدہ اٹھایا۔ بہر حال یہ تحریک ایک ایسے وقت پر بالکل بے موقع تھی جب ملک اندرونی اور بیرونی خطرات سے دوچار تھا بین الاقوامی حالات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ نہایت قابل بحث قضیہ تھا اور اس کے خلاف نہایت دقیع سیاسی اور عملی دلائل دیے جا سکتے تھے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر تحریک جو فرقہ وار تلخی کو اکسانے والی ہو سنگین نتائج کی حامل ہوا کرتی ہے۔

لیکن مختصراً ہم سب کو رد کے بغیر اس کے اثر پر قابو نہ پا سکتے تھے۔

خواجہ ناظم الدین کا دفاعی جواب:

صوبے نے شورش کا رخ مرکز کی طرف پھیر دیا

خواجہ ناظم الدین نے یہ تسلیم کیا کہ مسٹر دولتانہ نے مرکز سے کوئی فیصلہ کرنے کے لیے اصرار کیا تھا لیکن اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ ذمہ داری مرکز کی طرف منتقل ہو جائے۔ خواجہ صاحب نے مارچ ۱۹۵۳ء میں دستور ساز اسمبلی کو بھی یہ بتا دیا تھا کہ یہ شورش سیاسیات اقتدار کی بھڑکائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ انہوں اس امر سے انکار کیا کہ کراچی کی اگست کانفرنس میں کوئی ایسا فیصلہ ہوا تھا کہ علماء سے براہ راست تصادم پیدا کرنے سے گریز کیا جائے۔ اس گفتگو کا عام رجحان یہ تھا کہ صورت حالات کا مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان اصولوں کو اختیار کیا جائے جو ۱۴ اگست کے کمیونک (اعلان نامہ) میں قائم کیے گئے تھے اگر ان اصولوں پر مناسب طریق سے عمل درآمد کیا جائے تو اس سے اصل شورش کی بنیاد ختم ہو جائے گی۔ اور وہ بنیاد اس شکایت پر ہے کہ مذہبی پراپیگنڈا

سرکاری سرپرستی میں کیا جارہا ہے۔خواجہ صاحب اس خیال پر قائم تھے کہ اس کمیونک (اعلان نامہ) میں مطالبات کے متعلق مرکز کے رویے کی وضاحت ہوگئی تھی۔ باقی رہا علما کا معاملہ تو چونکہ خواجہ صاحب نے ہمیشہ ان مطالبات کو ناقابل عمل قرار دیا تھا، اس لیے علما نے یہی اثر قبول کیا ہوگا کہ وہ ناقابل تسلیم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے قطعی اور آخری طور پر انہیں مسترد نہیں کیا۔لیکن علما کو یہ مشورہ دیا کہ ان پر زور نہ دیں اور ان کو یہ بھی بتایا کہ انسانی دانشمندی ضرور کوئی ایسا حل تلاش کرسکتی ہے جس میں مطالبات کے منظور یا مسترد کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔انہوں نے علماء سے یہ بھی کہہ دیا کہ آبادی کے کسی حصے کو اقلیت قرار دینا حکومت کے فرائض میں داخل نہیں ہے اور یہ وظیفہ دستور ساز اسمبلی کا ہے خواجہ صاحب نے بیان کیا کہ وہ خود بھی احمدیوں کو اقلیت قرار دلانے کے لیے تیار نہیں تھے۔لیکن وہ یہ بات علما سے کہنے پر آمادہ نہ تھے تاہم انہوں نے علما کو بتادیا کہ ان مطالبات پر زور دینا مفاد ملکی کے منافی ہے اور ان کو تسلیم کرنا بے حد مشکل ہے بلکہ دستوری دستاویز میں بھی لفظ ''مسلم'' کی ایسی تعریف کرنا آسان نہ ہوگا جو احمدیوں کو تو اس تعریف سے خارج کردے اور کسی دوسرے طبقے کو خارج نہ کرے۔

فتاویٰ کفر اور اس کا اثر

خواجہ صاحب کا اپنا عقیدہ یہ تھا کہ اگر نوے فیصد علما اس پر اتفاق کرلیں کہ مرزا غلام احمد کو ماننے والا کافر ہے اور اس کو سنگسار کرکے ہلاک کردینا چاہیے تو وہ اس فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کردیں گے۔لیکن کفر کا فتوے کسی جماعت کو لازماً ایک غیر مسلم اقلیت نہیں بنادیتا۔لہٰذا مطالبات کی بنیاد ایک اسلامی مملکت کے مطالبہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔خلفائے اربعہ کے بعد سے تاریخ اسلام میں کفر کے فتوؤں کا رواج عام رہا ہے لیکن ان کا نتیجہ کبھی نہیں ہوا کہ ان افراد یا جماعت کو جن کے خلاف فتویٰ دیا گیا ہو شہری حقوق سے محروم کردیا جائے۔یہ بیان ایک ایسی مملکت میں واقعی بے حد غنیمت اور تسلی بخش ہے جس میں فتویٰ غالباً توپ اور مکھن کی مانند ضروری بننے والے ہیں۔یہ آخری فقرہ ہمارا ہے۔

اسلامی مملکت کے متعلق خواجہ صاحب کا تصور

اور حقیقت میں پاکستان اسی یقین کی بنا پر حاصل کیا گیا تھا خواجہ صاحب نے اس خیال کو تسلیم نہیں کیا کہ قائد اعظم پاکستان میں مسلموں اور غیر مسلموں کو واحد قوم بنانا چاہتے تھے جس میں سب کے شہری حقوق مساوی ہوں کیونکہ اگر ان کا نقطہء نگاہ یہی ہوتا تو وہ مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم کا مشورہ نہ دیتے جب خواجہ صاحب کو یاد دلایا گیا کہ قائد اعظم نے ۱۱/ اگست ۱۹۴۷ء کو دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی تھی کہ ''کچھ وقت گزر جانے پر ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے مذہبی مفہوم کے اعتبار سے نہیں کیونکہ یہ ہر فرد کے ذاتی یقین و ایمان کا معاملہ ہے بلکہ وہ سب سیاسی مفہوم میں مملکت کے شہری ہوں گے''۔ تو خواجہ صاحب نے صاف کہا کہ مذہب یا اسلامی مملکت کے متعلق ان کا یہ نقطہ نگاہ نہیں ہے انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ خان لیاقت علی خاں کی زندگی میں آئندہ دستور کے متعلق مجلس اصول اساسی کی جو عبوری رپورٹ پیش کی گئی تھی اس میں جو نظام مدنظر تھا وہ مذہبی مملکت کا نہ تھا۔ آپ نے مزید یہ بیان کیا کہ موجودہ رپورٹ علما کے ساتھ طویل مذاکرات کے بعد تیار کی گئی تھی جن میں تین دوسرے وزرا بھی شامل تھے اور ان میں سے ایک سردار عبدالرب نشتر تھے مختصر یہ کہ جس فضا میں موجودہ رپورٹ نے جنم لیا وہ خشک مذہبیت کی فضا تھی بھلا جو حکومت مذہب میں از سر تا پا مستغرق ہو اس کے لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ مطالبات کو رد کر دیتی۔

علما پر خواجہ صاحب کے رویے کا کیا اثر مترتب ہوا

اس دلیل میں یقیناً قوت ہے اور دوسرے کوائف کی عدم موجودگی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین کے رویے سے علما پر یہ اثر پڑا کہ شاید وہ کچھ مدت کے بعد ان مطالبات کو منظور کر لیں گے لیکن بعض علما نے جو بحیثیت وفد خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ہمارے سامنے ایسے بیانات دیے ہیں جن سے ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ خواجہ صاحب کا رویہ ہر ذہین آدمی پر روشن ہو جانا چاہیے تھا۔ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے ۱۳ اور ۱۶ اگست ۱۹۵۲ء کو دو دفعہ تین چار دوسرے اشخاص کی معیت میں خواجہ صاحب سے ملاقات کی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ آپ لوگوں

MunirReport.pdf

نے سب باتیں خود شخص متعلق کے منہ سے سنی تھیں۔ لہٰذا علما کے ساتھ مذاکرات کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ انکو جھکنے کی ترغیب دی جائے اور انہیں دو ٹوک جواب دے کر ناراض نہ کیا جائے مزید برآں اگرچہ یہ صحیح ہے کہ وزیراعظم نے آزادی اظہار (خصوصاً مذہبی فکر کے معاملے میں) کی حمایت کی لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ تقریریں حدود قانون کے اندر نہ رہیں اور اس کے باوجود انہیں ممنوع قرار نہ دیا گیا۔ عنقریب یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ دعویٰ بلاوجہ نہ تھا۔

مقصد بظاہر تشدد کے حق میں نہ تھا

یہ دلیل دی گئی ہے کہ وزیراعظم نے علما کے ساتھ تصادم سے بچنے کی جو ہدایات دی تھیں ان کی وجہ سے صوبائی دائرے میں کوئی اقدام نہ کیا جا سکا۔ اس دلیل میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ علما گویا شوریدہ سر اور دشنام باز دیوانوں کا ایک گروہ تھے جو تشدد کی تلقین کرتے تھے اور خون کے نظارے دیکھنا چاہتے تھے۔ شاید وہ ''مذہبی دیوانہ'' کہلانے سے تو انکار نہ کریں لیکن ان میں سے ایک بھی ہمارے سامنے یہ اعتراف کرنے پر تیار نہ ہوا کہ اس نے تشدد کی مذمت نہیں کی۔ مولانا میکش نے علما کے کیس پر نمایاں زور بیان سے بحث کی لیکن احمدیوں کے خلاف خود اپنے مجنونانہ جوش کے باوجود انہوں نے ان تمام دشنام آمیز تقریروں کی مذمت کی جو ادنیٰ درجے کے لیڈروں نے کی تھیں۔ بیان واقعات سے معلوم ہو گا کہ ایسی تقریریں سید عطا اللہ شاہ بخاری، مولوی محمد علی جالندھری، سید مظفر علی شاہ شمسی، ماسٹر تاج الدین اور چند دیگر اشخاص نے کی تھی (اور ہمیں مولانا اختر علی خان کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے) لیکن ان حضرات کو یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ انہیں مذہب کے متعلق کوئی گہرا علم حاصل ہے یا وہ علما کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری سے جب یہ سوال کیا گیا کہ آپ کے تصور میں آئندہ حکومت کی کیا شکل ہونی چاہیے تو آپ نے جواب دیا کہ اس سوال کا جواب علما ہی دے سکتے ہیں اس لیے وہ تنہا ''امیر شریعت'' ہیں جو مذہب کے قلمدان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

علما سے تصادم کے متعلق خواجہ ناظم الدین کے اندیشے غیر حقیقی تھے

لیکن مسٹر دولتانہ کو مرکز کے خلاف جو شکایات تھیں ان کے جواب میں سب کچھ کہنے کے بعد

464

MunirReport.pdf

اس شدت خوف کو سمجھنا مشکل ہے جو خواجہ ناظم الدین کو علما کے ساتھ تصادم کے متعلق لاحق تھا۔ ''اگر مطالبات کو رد کرنے کا فیصلہ کر دیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ بے شمار مسلمان ذبح ہو جاتے جو نیک نیتی سے اپنی جانیں دے دیتے اور سمجھتے کہ وہ درجہ شہادت پر فائز ہو رہے ہیں۔ اگر اب تک کوئی خونریزی ہوئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں اللہ کے حضور میں اس کا جواب دہ قرار نہ دیا جاؤں گا لیکن اگر میں نے جارحانہ رویہ اختیار کیا ہوتا اور ملک کو ایک مذہبی جنگ کے حوالے کر دیا ہوتا تو یقین ہے کہ میں دنیا و عقبیٰ دونوں میں روسیاہ ہو جاتا۔ اگر یہ جنگ قانون و انتظام کے سوال پر نہیں بلکہ صرف اپنے مالہ و ماعلیہ کی بنا پر لڑی جاتی تو صورت حالت دس گنا زیادہ بدتر ہو گئی ہوتی اور یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ آخر میں ہم کامیاب ہو جاتے''۔

ہم بڑے احترام کے ساتھ یہ کہیں گے کہ ہمیں خواجہ صاحب کا یہ ارشاد اپنے روشن خلوص کے باوجود جذبات سے متاثر معلوم ہوتا ہے کہ احمدیوں اور سرکاری افسروں کے سوا جو دوسرے لوگ فسادات کا شکار ہوئے وہ دو طبقوں سے تعلق رکھتے تھے ایک وہ لوگ جنھوں نے درجہ شہادت حاصل کرنے کی کوشش کی اور دوسرے وہ جو اپنے مجرمانہ منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے ایسے موقعوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو قانون و انتظام کی صورت حالات اور مقاصد کی جنگ میں کوئی امتیاز کر سکتا۔ مذہبی دیوانہ تمام حالت میں یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک بلند مقصد کے لیے لڑ رہا ہے ضرورت صرف اسکی ہے کہ کوئی بخاری اسے اسکا یقین دلا دے۔ چور اور بدمعاش کو اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ وہ جس چیز کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہا ہے وہ ناموس رسولؐ ہے یا بائیسکل کی درجن بھر ٹیوبیں ہیں۔ یہاں بھی صرف کسی بخاری کا یہ اعلان چاہیے کہ ناموس رسولؐ خطرے میں ہے۔ ۲۷ فروری کی صبح کو لاہور کے بہت ہی کم لوگوں کو اسکی خبر تھی کہ علما اس لیے گرفتار کیے گئے ہیں کہ انہوں نے وزیراعظم کی کوٹھی پر رضاکاروں کے دستے بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ گرفتاریاں اس لیے ہوئی ہیں کہ مطالبات منظور نہیں کیے گئے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خان عبدالقیوم خاں نے خواجہ ناظم الدین کو سرحد اور قبائل کے متعلق کچھ بتایا تھا اور خواجہ ناظم الدین سمجھتے تھے کہ اگر مطالبات رد کر دیے گئے تو جہاد کا اعلان ہو جائے گا۔

465

کہہ دیا کہ اگر اس تنبیہ پر توجہ نہ کی گئی تو حکومت مجبوراً اشد ید اقدام کرے گی۔ یہ دوسری تنبیہ تھی۔

احرار نے الشہاب کو دوبارہ چھاپا

اس اثنا میں احراریوں نے ایک گمنام کتابچہ جو اصلاً پاکستان کے لاٹ پادری مولانا شبیر احمد عثمانی کا لکھا ہوا تھا بظاہر مصنف کی اجازت سے دوبارہ چھاپ لیا۔ اس کتابچے میں حکومت افغانستان کے اس فعل کو حق بجانب قرار دیا گیا تھا کہ اس نے کئی سال پیشتر دو احمدیوں کو سنگسار کر دیا تھا۔ جون ۱۹۵۰ء میں مسٹر انور علی نے لکھا کہ "بعض بین وجوہ کی بنا پر" اس پمفلٹ کو ممنوع قرار دینا تو مناسب نہ ہوگا لیکن ماسٹر تاج دین اور دوسرے لیڈروں کو تنبیہ کرنی چاہیے۔ چیف سیکرٹری (حافظ عبدالمجید) چیف ایڈوائیزر اور گورنر نے اس سے اتفاق کیا اور گورنر نے یہ بھی کہا کہ سابقہ تنبیہات چونکہ موثر ثابت نہ ہوئیں، اس لیے ان لوگوں کو بتا دینا چاہیے کہ اگر وہ اپنی سرگرمیوں سے باز نہ آئے تو حکومت کاروائی کرنے پر مجبور ہوگی۔ مسٹر انور علی نے ۲۸ مئی ۱۹۵۰ء کو ایک اور سلسلے میں ایک مزید یادداشت لکھی جس میں تقسیم کے بعد احراریوں کی سرگرمیوں کی تفصیل بیان کر کے موثر اقدام کی تجویز پیش کی۔ اس یادداشت میں لکھا تھا کہ ایک احمدی فوجی افسر کوئٹہ میں ہلاک کیا جا چکا ہے۔ امام جماعت احمدیہ اور ان کے والد کو زناکار کہا گیا ہے۔ چودھری محمد ظفر اللہ خاں کو گدھا، مکار اور غدار کی سی گالیاں دی گئی ہیں اور کہا گیا ہے کہ انہوں نے قادیان کی خاطر کشمیر کو بیچ دیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی ایک تقریر میں یہ اعلان کیا ہے کہ اگر مرزا غلام احمد نے آجکل کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دیتے۔ اس جلسے کے حاضرین میں سے ایک آدمی سچ مچ اٹھ کر کہنے لگا کہ میں چودھری ظفر اللہ خاں کو ہلاک کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ایک اور موقع پر مرزا بشیر الدین محمود احمد کو ہلاک کر دینے پر بھی آمادگی ظاہر کی گئی۔

مسٹر انور علی کی تجویز کہ احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دیا جائے

مسٹر انور علی نے تجویز کی کہ

(۱) جہاں عملی تشدد کی تلقین کی جائے وہاں سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۱۳ استعمال کی جائے۔

ذکر بھی کیا۔

جھوٹا پروپیگنڈا

یہ واضح طور پر نفرت کی تلقین تھی اور نفرت بھی نہایت مکروہ قسم کی کیونکہ نہ تو مولوی محمد علی ایسے اہم تھے کہ ایسی شہادت ان کے قبضے میں ہوتی اور نہ کوئی ایسی تحریر اس کے بعد مقدمہ سازش کے ٹربیونل کے سامنے پیش کی گئی لیکن اس قسم کی شبہ انگیز خبر نہایت آسانی سے لوگوں کے دماغوں میں گھر کر لیتی ہے اور اس کا کوئی ثبوت پیش کیا جائے یا نہ کیا جائے، سامعین اسکو بالکل صحیح اور شک وشبہ سے بالاتر سمجھ لیتے ہیں۔ ڈی آئی جی نے حسب سابق تنبیہ کرنے کی تجویز کی لیکن حسب سابق کوئی تنبیہ نہ کی گئی۔ مسٹر دولتانہ نے انکی یاداشت پر محض اپنے مختصر دستخط ثبت کر دیے۔ انہوں نے اپنی شہادت میں (موجودہ یاداشت کی نسبت نہیں) یہ صراحت کی ہے کہ جو فائلیں ان کے پاس بغیر اطلاع بھیجیں جاتی تھی۔ ان پر وہ صرف اپنے مختصر دستخط کر دیا کرتے تھے لیکن یہ فائل تو کسی قطعی اقدام کی متقاضی تھی۔

(۲) ۱۹ اگست ۱۹۵۱ء کو سید عطا اللہ شاہ بخاری نے موچی دروازے کے باہر ایک تقریر کی جس میں بعض مخصوص فقروں کا مفہوم ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

عطا اللہ شاہ بخاری لاہور میں: ۱۹ اگست ۱۹۵۱ء

''ہمارا ایک دشمن تو سرحد پر ہمارے سامنے ہے اور دوسرا دشمن ہمارے درمیان موجود ہے تم اس سانپ سے بالکل بے خبر ہو جو تمہاری آستین میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے بار ہا بتایا ہے کہ احمدی پاکستان کے وفادار نہیں ہیں، ڈسکہ میں چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے بھتیجے کی شادی کے موقع پر مرزا صاحب کہہ چکے ہیں کہ احمدیوں کا بھلا اکھنڈ ہندوستان ہی میں ہے اور اگر تقسیم ہو بھی جائے تو دونوں حصے کسی نہ کسی طرح پھر مل جائیں گے۔ کیا تم اس سے زیادہ غداری کا تصور کر سکتے ہو؟ مجھے اور مرزا صاحب دونوں کو ہتھکڑیاں لگا دو اور ایک کمرے میں بند کر دو۔ صبح سے پہلے پہلے جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے گا اگر وہ صبح تک زندہ رہیں اور مجرم ثابت ہو جائیں تو تم کو چاہیے کہ

476

قادیان اور ربوہ کے درمیان ہر درخت پر ایک ایک احمدی کو پھانسی دے دو۔ ساغر نے کہا ہے کہ مرزا صاحب اور چودھری محمد ظفر اللہ خاں نے کشمیر کا بیڑا غرق کر دیا اگر یہ جھوٹ ہے تو اسکو جیل میں بھیجو اور اگر یہ سچ ہے تو ظفر اللہ خاں کو جیل میں بھیجو۔

شیخ بشیر احمد کا احتجاج

اس پر شیخ بشیر احمد ایڈوکیٹ امیر جماعت احمدیہ لاہور نے ایک شکایت ڈپٹی کمشنر کو بھیجی جس نے وہ کمشنر کے پاس بھیج دی اور کمشنر نے ہوم سیکرٹری (سید احمد علی) کے پاس ارسال کی اور ہوم سیکرٹری نے اس پر لکھا کہ میں نے اس معاملے کے متعلق چیف منسٹر سے گفتگو کی ہے۔ جنھوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں انسپکٹر جنرل کی وساطت سے احراری لیڈروں کو یہ تنبیہ کر دوں کہ وہ حدود سے تجاوز کر رہے ہیں (انکو یہ بھی بتا دیا جائے کہ اگر انہوں نے اس تنبیہ کو قبول نہ کیا تو حکومت کو ان کے خلاف کاروائی کرنی پڑے گی۔ چنانچہ انسپکٹر جنرل نے شیخ حسام الدین سیکرٹری مجلس احرار کو تنبیہ کر دی جنھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس تنبیہ کو مناسب حلقوں تک پہنچا دیں گے۔

مرکزی حکومت کی تشویش

مسٹر جی احمد سیکرٹری وزارت داخلہ نے بھی ۴ ستمبر ۱۹۵۱ء کو چیف سیکرٹری سے پوچھا کہ آیا تقریر کی یہ رپورٹ صحیح ہے کہ وزیر خارجہ قادیان کے لیے کشمیر کو فروخت کر رہے ہیں چیف منسٹر نے جواب دیا کہ یہ صحیح ہے اور مقرر کو تنبیہ کی جا چکی ہے۔

بخاری مظفر گڑھ میں: اکتوبر ۱۹۵۱ء

(۳) لیکن اس تنبیہ کا نتیجہ ملاحظہ ہو۔ دو مہینے بعد اکتوبر ۱۹۵۱ء میں سید عطا اللہ شاہ بخاری نے مظفر گڑھ میں تقریر کی جس میں تقسیم کے متعلق احمدیوں کے رویے کی نسبت اپنے اکثر خیالات کا اعادہ کیا اور ایک نیا راگ اس میں شامل کر دیا۔ "ایک احمدی جاسوس ایک شخص گوپال داس کی معیت میں گرفتار کیا گیا ہے اور میں نے حکومت کو اس سلسلے میں عمدہ معلومات مہیا کی ہیں"۔ کیا عام سیدھے سادے لوگ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ بزرگ جو اپنی کہن سالی کے بوجھ سے زیر بار ہونے کے باوجود

شمشیر کی طرح تیز ہے گوپال داس کے ساتھی کے متعلق ایسی کہانی تصنیف کرلے گا جس کو سچائی سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں؟ اگر یہ سچ ہو تو کیا اس سے غداروں کے خلاف شدید جذبات مشتعل نہ ہو جائینگے؟ اگر آپ یہ جانتے ہوئے کہ اس تقریر کی بنا جھوٹ پر ہے، اس کو نظرانداز کررہے ہیں تو یہ مقرر کے سفید بالوں کا احترام تو شاید ہو لیکن آپ اس مرض سے تغافل کررہے ہیں جو اس نے آپ کی قوم میں پھیلا دیا ہے۔

ڈی آئی جی نے کاروائی کی سفارش کی

اس پر مسٹر انور علی نے تجویز کی کہ (۱) ایک دو احراریوں کی زبان بندی کی جائے (۲) سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی نقل وحرکت اسکے گاؤں کے اندر محدود کردی جائے اور (۳) مجرمانہ تقریروں کے لیے قانون کے ماتحت مقدمات چلائے جائیں۔

انسپکٹر جنرل نے مضبوط اقدام کی تجویز کی

خان قربان علی خاں نے بھی ایسا ہی زوردار نوٹ لکھا۔ انہوں نے کہا کہ احرار نے اتنا کچھ کیا ہے کہ ان کے خلاف مضبوط اقدام بالکل حق بجانب ہے۔ آخری تنبیہ وہ تھی جو انہوں نے خود شیخ حسام الدین کو کی۔ لیکن یہ واضح تھا کہ تنبیہات بالکل بےکار ہیں اور اگر احراری من حیث الجماعت باز بھی آجائیں تو سید عطاءاللہ شاہ بخاری کبھی باز نہیں رہ سکتے۔ ان کے ذہن میں تو گالی کے سوا اور کچھ نہیں۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ان کی زبان بندی کے باعث ایک مرتی ہوئی پارٹی میں نئی جان پڑ جائے لیکن اس کا فیصلہ ارباب سیاست کا کام ہے۔ خاں صاحب نے لکھا کہ ذاتی طور پر وہ مضبوط اقدام کے حامی ہیں تاکہ رواداری کی فضا پیدا ہو سکے کہ چیف سیکرٹری نے اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے یہ تجویز کی کہ چیف منسٹران سب افسروں کی معروضات سن لیں اور پھر کسی فیصلے پر پہنچیں۔

افسروں کی کانفرنس: نتیجہ: پالیسی کی چٹھی مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء

۲۱ نومبر ۱۹۵۱ء کو چیف منسٹر کے سیکرٹری نے ظاہراً چیف منسٹر کی ہدایت کے ماتحت یہ یادداشت لکھی کہ جب تک چیف منسٹر فلاں جگہ سے واپس نہ آجائیں کوئی کاروائی نہ کی جائے۔ اسکے بعد ۶

کے کردار میں موجود نہیں ہے تو ان کو دوسری اسامیوں پر مقرر کیجیے اور ان کی جگہ ایسے آدمی مہیا کیجیے جن کے کندھے ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لیے کافی فراخ ہوں۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں

۶ دسمبر ۱۹۵۱ء کی کانفرنس میں اس سوال پر بھی غور ہونا چاہیے تھا کہ لاہور اور مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنروں سے کیوں جواب طلب نہ کیا جائے کہ جس حالت میں انہیں ۳ نومبر کی گشتی چٹھی پہنچ چکی تھی انہوں نے قانون کے ماتحت کوئی اقدام کیوں نہ کیا۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے خوابیدہ افسروں کو بیدار کر کے انہیں ذمہ داری کا احساس دلایا جاسکتا ہے یہ زیادہ تر چیف سیکرٹری کا کام ہے لیکن یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ جب ایک کانفرنس ایک یا دو تقریروں پر غور کرنے کے لیے منعقد کی جائے تو چیف منسٹر کو یہ خیال ہی نہ آئے کہ مقامی افسر نے کچھ بھی نہیں کیا۔

بھلوال میں احمدی کانفرنس ۲۲ ستمبر ۱۹۵۱ء

(۴) ۲۲ اور ۲۳ ستمبر ۱۹۵۱ء کو بھلوال میں ایک احمدی تبلیغ کانفرنس منعقد ہوئی اس کے مقابلے پر محض چڑانے کے لیے سامنے کی مسجد میں ایک سنی کانفرنس فی البدیہہ کر لی گئی۔ پولیس کی رپورٹ مظہر ہے کہ احمدیوں نے کوئی ناگوار بات نہیں کی لیکن احراریوں نے ایسی باتیں کیں۔ مسٹر انور علی نے تجویز کی کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس مقامی لیڈروں کو تنبیہ کرے۔ خان قربان علی خاں نے ۴ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو یہ بھی کہا کہ ''اگر وہ فرقہ وارانہ شرارت کریں تو قانونی کاروائی کی جائے''۔ یہ محض احراریوں کے طرزِ عمل کی مثال پیش کرنے کے لیے بیان کیا گیا ہے۔

ملتان میں احمدی کانفرنس ۱۸ نومبر ۱۹۵۱ء

482

(۵) ۱۸ نومبر ۱۹۵۱ء کو احرار نے ملتان میں احمدیوں کے ایک جلسے کو درہم برہم کر دیا۔ شیخ بشیر احمد نے پھر شکایت کی اور اس دفعہ حکومت کو بھیجی کہ لائلپور میں ایک اور جلسہ بھی اسی طرح درہم برہم کیا گیا ہے۔ انہوں نے حکومت کو یاد دلایا کہ ہفتے کے آخر میں احمدیوں کا ایک اور سالانہ جلسہ سیالکوٹ میں ہونے والا ہے اور حفاظت کا مطالبہ کیا۔ مسٹر قربان علی نے کہا کہ میں اس چٹھی کے ایک

ایک لفظ سے اتفاق کرتا ہوں اور اسکے ساتھ ہی ''مضبوط پالیسی'' کی استدعا کی۔

ملتان کے جلسے کو درہم برہم کرنے کا واقعہ خاص طور پر مسٹر دولتانہ کے علم میں لایا گیا۔ چنانچہ انہوں نے اس معاملے کے متعلق اپنے افسروں سے بات چیت کی اور معاملہ ڈپٹی ہوم سیکرٹری کی ایک یادداشت پر ختم ہو گیا۔ جو چیف منسٹر کی جانب سے لکھی گئی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ ''اس اطلاع پر کوئی علیحدہ کاروائی ضروری نہیں ہے''۔

سیالکوٹ میں ۱۶ فروری ۱۹۵۱ء

سیالکوٹ کا جلسہ خود احمدیوں کی رضامندی سے ملتوی کرنا پڑا۔ کیونکہ فضا میں بہت تناؤ تھا آخر یہ جلسہ ۱۶۔ ۷ افروری ۱۹۵۲ء کو منعقد ہوا لیکن اس وقت بھی پولیس کو اس جلسے کے گرد خاردار تار کا جنگلہ لگانا پڑا۔ احراری کچھ دور کھڑے رہے اور انہوں نے جلسے کے بعد احمدیوں پر پتھر پھینکے۔ ڈپٹی کمشنر نے قوت کی نمائش کر کے صورت حال کو بد سے بدتر نہ ہونے دیا اور احمدیوں کو پولیس کے پہرے کے ساتھ ٹرکوں میں بٹھا کر گھروں کو روانہ کر دیا۔ ۷ افروری کو جلسہ ہونے والا تھا اس کے متعلق خود احمدیوں ہی نے سوچا کہ اس کا انعقاد خطرے سے خالی نہیں چنانچہ انہوں نے اس دن جلسہ نہ کیا۔

احرار کانفرنس اوکاڑہ میں ۲۴ نومبر ۱۹۵۱ء

(۶) ۲۴۔ ۲۵ نومبر ۱۹۵۱ء کو اوکاڑہ میں ایک احرار کانفرنس منعقد ہونے والی تھی اور چونکہ احمدیوں اور احراریوں کے نزاع کا ایک اڈا تھا۔ (۱۹۵۰ء میں یہاں ایک احمدی مارا گیا تھا) اس لیے چیف منسٹر نے ڈی آئی جی کا یہ مشورہ قبول کر لیا کہ یہ جلسہ ممنوع قرار دیا جائے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ منٹگمری کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مشتاق احمد چیمہ اس شرط پر اس جلسے کے انعقاد کی اجازت دے چکے ہیں کہ اس میں کوئی قابل اعتراض تقریر نہیں کی جائے گی۔ مسٹر دولتانہ اس وقت کراچی میں تھے اور چونکہ مسٹر قربان علی کے نزدیک بہترین رویہ یہی تھا کہ وعدے کا ایفا کیا جائے۔ لہٰذا انہوں نے ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دی کہ اگر آپ کو اعتماد ہو کہ کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آئے گا تو آپ جلسے کی

اجازت دے سکتے ہیں۔

منٹگمری کا ڈپٹی کمشنر

اس جلسے کا افتتاح خود مسٹر چیمہ نے کیا اور دوسرے دن اختتامی تقریر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کی جس میں انہوں نے احرار کا شکریہ ادا کیا کیونکہ اس جلسے کا نام ''دفاع کانفرنس'' رکھا گیا تھا۔مندرجہ ذیل دو تقریروں کے اقتباسات قابل ملاحظہ ہیں:۔

ا: قاضی احسان احمد شجاع آبادی: مرزائیوں سے خبردار رہو یہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور حکومت پاکستان کو چاہیے کہ خان لیاقت علی خان کے قتل کی تحقیقات کرتے وقت انکو ذہن میں رکھیں ،انکو پاکستان میں اپنے مذہب کی تبلیغ کا کوئی حق نہیں ہے۔

(ان لوگوں کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ یہ تمام قومی مصائب کی تحقیقات کے گم شدہ سلسلے دریافت کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں)

۲۔سید عطاء اللہ شاہ بخاری: ملک کے دفاع کو مضبوط کرنے کی ضرورت پر زور دینے کے بعد آپ نے کہا ایک غدار ایک کروڑ سوروں سے بدتر ہے اگر حکومت مجھے غدار سمجھے تو اس چاہیے کہ مجھے گولی مار دے۔نہایت افسوس ہے کہ مرزا بشیر الدین نے ایک دفعہ پاکستان کو ہندوستان سے متحد کرنے کی کوششوں کی کھلم کھلا حمایت کی تھی یہ پاکستان سے غداری تھی۔

ڈپٹی کمشنر اور چیف سیکرٹری کے درمیان اس مسئلے پر کچھ خط و کتابت بھی ہوئی کہ ایسی کانفرنس کی صدارت کرنا کس حد تک جائز تھا۔ہمیں بحیثیت مجموعی اتفاق ہے کہ مسٹر چیمہ کے طرز عمل کے خلاف ایک سے زیادہ وجوہ کی بنا پر اعتراض ہونا چاہیے تھا لیکن تاہم یہ امر موجب اطمینان ہے کہ حکومت سے استصواب کیے بغیر ڈپٹی کمشنر نے بعض شرائط کے ماتحت ایک جلسے کے انعقاد کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ان کو فیصلے کی غلطیاں کرنے دو،وہ کچھ تو کریں جس سے یہی ظاہر ہو سکے کہ وہ فیصلہ کی غلطیاں کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

رگڑا مست قلندر دا۔ مارچ ۱۹۵۲ء محض ایک تنبیہ

(۷) مارچ ۱۹۵۲ء میں ایک کتابچہ مسٹر انور علی کے علم میں آیا جس کا نام تھا۔ ''رگڑا مست قلندر دا''۔ جو سائیں آزاد قلندر بھیروی نے لکھا تھا جس میں سی آئی ڈی کے بیان کے مطابق بانی احمدیت پر ''دشنام آمیز اور توہین انگیز'' نکتہ چینی کی گئی تھی۔ جس کے خلاف زیر دفعہ ۲۹۵ الف تعزیرات پاکستان اور زیر دفعہ ۹۴ الف ضابطہ فوجداری کاروائی ہوسکتی تھی مسٹر انور علی نے ایک یادداشت میں لکھا کہ اگرچہ تازہ ہدایات کے مطابق ایسے اشخاص کے خلاف ''مضبوط'' کاروائی ہونی چاہیے لیکن اس کتابچے کا مصنف کوئی خاص ممتاز حیثیت نہیں رکھتا اور اگر اس کے خلاف قانونی کاروائی کی گئی تو رسوائے عالم ہو جائے گا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجرموں کو رسوائی عام سے کیوں محروم کیا جائے۔ لیکن ہمیں تو اس مشورے کی پشت پر وہی خیال کارفرما نظر آتا ہے جس کے ماتحت ۱۹۵۰ء میں چیف ایڈوائزر نے احرار کو بہ حیثیت مجموعی ''سستی شہادت'' کا مرتبہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

مجرموں کو ''رسوائی عام'' اور سستی شہادت کا حق دینے سے انکار

یعنی اندیشہ یہ تھا کہ پیمانہ اقدار میں ان کا رتبہ بلند ہو جائیگا اور وہ قید ہونے کے بعد اہم اشخاص بن جائیں گے لیکن لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اقدام نہ ہونے کی صورت میں لوگ بدگوئی اور گالی گلوچ کو زندگی کا عام منظر سمجھ لیتے ہیں اور بالآخر جب یہ دشنام طرازی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور اس کو روکنے کے لیے کوئی کوشش کی جاتی ہے تو لوگ اس کو ''آزادی تقریر میں ناواجب مداخلت'' قرار دینے لگتے ہیں یہی جولائی ۱۹۵۲ء میں ملتان میں ہوا۔ مہینہ بھر قانون کی خلاف ورزی میں جلوس نکلتے رہے اور جب آخر ان پر پابندی عائد کی گئی اور فرض شناس پولیس افسر نے اس پابندی کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔

جولائی ۱۹۵۲ء کو ملتان میں جو گولی چلی وہ احکام کے عدم نفاذ کا نتیجہ تھی

تو انسانی بھڑوں کا ایک چھتا اس کے تھانے کے گرد جمع ہو گیا جس نے آہنی کٹہرا توڑ ڈالا۔ انسانوں اور سامان پر اینٹیں پھینکیں آگ لگانے کی کوشش کی چند سرکاری افسروں کو زخمی کر دیا اور اس

وقت تک ٹھنڈے نہ ہوئے جب تک چھ گولیاں چھ سینوں میں ٹھنڈی نہیں ہوگئیں۔

اس پر ''تسنیم'' مورخہ ۲ جولائی ۱۹۵۲ء نے لکھا۔ ہم اس پولیس افسر کی غیر ذمہ داری کی مذمت کیے بغیر نہیں رہ سکتے جس نے ایک اجتماع پر محض اس لیے لاٹھی چارج کیا کہ وہ نعرے لگا رہے تھے اور دفعہ ۱۴۴ کے ایک حکم کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سرگودھا اور دوسرے مقامات پر بھی ایسے احکام توڑے گئے ہیں۔

تاہم ہوم سیکرٹری نے ڈی آئی جی سے اتفاق کیا اور کتابچے کے مصنف کو صرف تنبیہ کر دی گئی۔ چیف منسٹر نے دورے سے واپس آنے پر اس کاروائی کو پسند کیا۔ شاید یہ نظم ہی بہت اچھی تھی!

دو مہینے بعد مئی ۱۹۵۲ء میں احراریوں نے ایک پوسٹر شائع کیا جس کا عنوان یہ تھا:۔

''خلیفہ قادیان مرزا بشیر الدین کی گاندھی جی سے ہم بستری اور اکھنڈ ہندوستان''

ہم بستری والا پوسٹر تنبیہ بھی نہ کی گئی

ہم اس عنوان کا انگریزی میں ترجمہ نہیں کر سکتے اس لیے کہ لفظ 'ہم بستری'' کے دو معنی ہیں اس لفظ کو مرزا بشیر الدین نے ایک معنی میں استعمال کیا ہے اور احرار نے اس کا دوسرا مفہوم لیا ہے جو فحش ہے۔ یہ پوسٹر بھی فحش و ناشائستہ مواد سے لبریز ہے۔

اس میں جسٹس سکیمپ کے ایک فیصلے کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس میں جسٹس موصوف نے مرزا صاحب سے خرابی اخلاق منسوب کی ہے حالانکہ دراصل جسٹس سکیمپ نے ایک ایسی تحریر کا اقتباس نقل کیا ہے جسکے خلاف احمدیوں نے اعتراض کیا تھا۔ یہی تحریر اسی طریقے سے ایک اور قابل اس کتاب جانباز پاکٹ بک میں نقل کی گئی تھی اور ہم میں سے ایک نے اسی بنا پر کتاب کے مصنف کو توہین عدالت کی پاداش میں ایک ماہ قید کی سزا دی تھی۔ ڈی آئی جی نے اس کیس میں کوئی خاص سفارش نہ کی اور چیف منسٹر نے اس یادداشت پر محض مختصر دستخط کر دینے پر اکتفا کیا۔

سرگودھا کانفرنس ۲۴ مارچ ۱۹۵۲ء

(۸) اس کے بعد ایک اہم واقعہ ''استحکام پاکستان احرار کا نفرنس'' ہے جو ۲۴۔۲۵ مارچ

۱۹۵۲ءکوسرگودھامیں منعقد ہوئی۔سیکرٹری انجمن احمدیہ سرگودھانے مرکزی حکومت کوایک احتجاجی تار بھیجا جس میں تشدد کی اس کھلی تلقین اور لاقانونی کی شکایت کی جس نے احمدی جماعت کوشدید خطرے میں مبتلا کر رکھا تھا مرکزی حکومت نے چیف سیکرٹری سے رپورٹ طلب کی چنانچہ مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ کی ایک نقل بھیج دی گئی لیکن اس پر مسٹر انور علی نے اپنی حکومت سے پرزور احتجاج کیا۔

مرکزی حکومت نے رپورٹ طلب کی ڈی آئی جی نے احتجاج کیا

اور کہا کہ مرکزی حکومت کو تمام مختلف معاملات کے متعلق رپورٹیں طلب کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔اس سے کام میں خوامخواہ اضافہ ہوتا ہے حالانکہ مرکزی حکومت ان معاملات میں احکام صادر کرنے کی آئینی اہلیت نہیں رکھتی۔بہتر یہ ہوتا کہ مرکزی حکومت اس تار کوضروری کاروائی کی غرض سے صوبائی حکومت کے پاس بھیج دیتی۔قانون و انتظام کے معاملے میں صوبائی حکومت ''مختار کل'' ہے اور جب اس سے رپورٹیں طلب کی جائیں تو لوگوں کو جرأت ہو جاتی ہے کہ اس حکومت کونظرانداز کر کے مرکز کو مداخلت کی دعوت دیں۔

یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اس امر کے باوجود کہ مسٹر انور علی کے نزدیک قانون وانتظام کے معاملے میں صوبائی حکومت مختار کل تھی۔ ۲۱ فروری ۱۹۵۳ء کو ''مضبوط پالیسی'' والی چٹھی مرکزی حکومت کومسٹر انور علی ہی کے ایما پر بھیجی گئی تھی۔

تقریریں: جالندھری نے کہا زندیق واجب القتل ہیں بخاری

سی آئی ڈی نے جن تقریروں کوقلمبند کیاان میں مولوی محمد علی جالندھری کا یہ فقرہ بھی تھا کہ ''مرزائی'' زندیق ہیں اور زندیق شریعت اسلامی کے رو سے واجب القتل ہیں۔سید عطا اللہ شاہ بخاری نے کہا کہ چودھری ظفر اللہ خان جان بوجھ کر کشمیر کی گتھی کو الجھا رہے ہیں اور افغانستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کی تلخی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔اس مقرر نے اپنے سامعین کو حکم دیا کہ ایک جلوس نکالیں اور وزیر خارجہ کی برطرفی کا مطالبہ کریں۔اور نعرہ لگائیں ''مرزائیت مردہ باد۔''

کی دفعہ ۱۵۳ الف اور ۲۹۵ الف اور ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۰۸ کا اطلاق کیا جا سکتا ہے ۱۳ اپریل کو ڈی آئی جی نے ایک یادداشت لکھی کہ چیف منسٹر نے رپورٹ ملاحظہ کر لی ہے۔

لیکن چیف منسٹر سے ملاقات کے بعد ارادہ بدل لیا

اور پراسیکوٹنگ ایجنسی نے یہ مشورہ دیا ہے کہ تقریروں کے خلاف مقدمات نہیں چلائے جا سکتے۔ پراسیکوٹنگ انسپکٹر کے مشورے کی یہ تعبیر نہایت عجیب ہے لیکن اگر ڈی آئی جی نے چیف منسٹر کے ساتھ ملاقات کے بعد اپنی رائے ہی بدل لی تھی تو انہوں نے الزام پراسیکوٹنگ ایجنسی پر کیوں رکھا؟

مولوی محمد شفیع سرگودھا ۲۴ جون ۱۹۵۲ء

تین ماہ بعد مولوی محمد شفیع خطیب جامع مسجد سرگودھا نے ۲۴۔ جون ۱۹۵۲ء کو جمعۃ الوداع کے موقع پر ایک تقریر کی اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اس کی رپورٹ تیار کی جو کم و بیش ان الفاظ میں تھی:۔

اس کے متعلق ایس پی کی رپورٹ

۲۴ جون ۱۹۵۲ء کو عید گاہ میں مولوی محمد شفیع نے حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کی مہم جاری رکھی۔ یہ شخص واضح طور پر اور شدت کے ساتھ حکومت کا مخالف ہے۔ یہ مجلس احرار سے تعلق رکھتا تھا اور یونینسٹوں کی حمایت کیا کرتا تھا۔ اس نے ایک بہت بڑا اشتہاری تختہ مسجد کے اندر لگا رکھا ہے جس پر ہر روز حکومت کے خلاف مولانا مودودی کے خیالات چاک سے لکھ دیتا ہے۔ سرگودھا کے ایک شخص صابر علی نے جو زیر دفعہ ۳ پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کیا گیا تھا بیان کیا کہ ایک دفعہ کہ مولوی محمد شفیع نے اس اشتہاری تختے پر لکھا کہ سابق وزیر اعظم نے امریکہ کے دورے پر سرکاری روپے کا غلط [استعما]ل کیا۔ اس شخص سے کوئی توقع نہیں کہ اپنی اصلاح کر لے گا یہ شخص بلاشبہ تفرقہ انگیز ہے۔

ایس پی نے کوئی کاروائی نہ کی

تاہم ۲۶ جون کو ایس پی نے لکھا کہ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پراسیکوٹر ڈی ایس پی سے اس مسئلے پر گفت و شنید کی ہے کہ مولوی محمد شفیع کے خلاف ایک حکم امتناعی کی خلاف ورزی کے لیے زیر دفعہ ۱۸۸ تعزیرات پاکستان مقدمہ چلایا جائے لیکن اس سب نے یہ فیصلہ کیا کہ ان تقریروں کے

مئی میں ڈی آئی جی، سی آئی ڈی کی طرف سے

صورت حالات کا عمومی جائزہ اور پالیسی کی نئ چٹھیوں کا اجرا

۲۰ مئی ۱۹۵۲ء کو مسٹر انور علی نے ایک جامع یاداشت لکھی جس میں ۱۹۵۰ء سے لیکر احرار کے افعال اور ان کے اثرات کا خلاصہ درج کیا جس کا اختصار درج ذیل ہے:۔

(۱) اکتوبر ۵۰ء میں اوکاڑہ کے مقام پر احمدی مبلغین کو راستے میں روک کران کے منہ کالے کیے گئے (ظاہر ہے کہ یہ ''جارحانہ فرقہ پرستی'' کا نتیجہ تھا) ایک سکول کا مدرس ہلاک کر دیا گیا۔

(۲) قریب قریب اسی زمانے میں ایک احمدی پنڈی میں مارا گیا۔ گو اسکی ہلاکت کا فوری سبب مذہبی اختلافات سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔

(۳) جنوری ۱۹۵۱ء میں احراریوں نے سیالکوٹ میں احمدیوں کا ایک جلسہ درہم برہم کر دیا

(۴) فروری میں چک جھمرہ کے مقام پر مولوی عصمت اللہ احمدی کے بیٹے کو ریلوے سٹیشن پر احرار نے چھرا مار دیا۔

(۵) مارچ میں گوجرانوالہ کے مقام پر ایک احمدی دکاندار پر حملہ کیا گیا لیکن پولیس نے اسکی جان بچالی۔

(۶) اپریل میں لائل پور کے مقام پر غلام نبی جانباز کی دھمکی کے بعد ایک احمدی دکاندار پر حملہ کیا گیا۔

(۷) مئی سمندری کے مقام پر احمدیوں کی ایک مسجد جلا دی گئی۔

(۸) نومبر میں لائل پور میں احمدیوں کا ایک جلسہ درہم برہم کیا گیا جسکے باعث طرفین کو جانی نقصان اٹھانا پڑا۔

(۹) اسی مہینے میں احرار نے ملتان میں احمدیوں کے ایک جلسے کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔

(۱۰) مارچ ۱۹۵۲ء میں سرگودھا کے مقام پر حکم امتناعی کے باوجود احراریوں کا ایک جلوس

نکالا گیا ہم ابھی اس کا ذکر کر چکے ہیں۔

(۱۱) اپریل ۱۹۵۲ء میں راولپنڈی کے ایک جلسے میں ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر لوگوں کو چودھری ظفر اللہ خاں کے قتل کی ترغیب دی۔

(۱۲) اسی مہینے گوجرانوالہ میں چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے دو جنازے نکالے گئے جن کے ساتھ یہ توہین آمیز نعرے لگائے گئے "ظفر اللہ پتر چوردا۔ نعرہ مارو زوردا"۔

(۱۳) مئی ۱۹۵۱ء میں لائل پور کے مقام پر سید عطا اللہ شاہ بخاری نے بڑے پیمانے پر مظاہروں کا اعلان کیا۔

(۱۴) سی آئی ڈی نے دوران مراسلت میں ایک چٹھی پکڑی جس میں لکھا تھا کہ جو شخص وزیر خارجہ کو قتل کرے گا اسکو جنت الفردوس میں جگہ ملے گی۔

مسٹر انور علی نے کہا کہ احراری جو تقسیم کے بعد مسلمانوں کو اپنا منہ نہ دکھا سکتے تھے۔ اب جارحانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ لوگوں کو بتا رہے ہیں کہ انہوں نے مسلم لیگ کے اعلیٰ لیڈروں سے صلح کر لی ہے۔ گورنر، چیف سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل نے ان کو وقتاً فوقتاً تنبیہ کی۔ لیکن ان تنبیہات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اب انہوں نے متعدد مقامات پر اپنی شاخیں کھول دی ہیں اور ان کے ممبروں کی کل تعداد ۱۰۲۶ ہے۔ اگر انہیں قوت اور ہر دلعزیزی حاصل کرنے کا موقع دے دیا گیا تو ان کا تدارک روز بروز دشوار ہوتا چلا جائے گا آخر میں انہوں نے لکھا کہ "ہوم سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل سے بات چیت کرنے کے بعد ان کی سفارشات حسب ذیل ہیں:۔

ڈی آئی جی نے دوبارہ سفارش کی کہ احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دیا جائے

۲۰ مئی ۱۹۵۲ء (۱) جیسا کہ انہوں نے ۱۹۵۰ء میں تجویز کی تھی احراریوں کو خلاف قانون جماعت قرار دے دینا چاہیے۔

(۲) سید عطا اللہ شاہ بخاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولوی محمد علی جالندھری

کہ ان کو خلاف قانون جماعت قرار دینا حق بجانب ہو جاتا لیکن اس حالت میں مسٹر دولتانہ کو یہ کہنا پڑتا کہ ڈی آئی جی اور انسپکٹر جنرل پیشگو یانہ یا سیت یا یاس آمیز پیشگوئی کے عادی ہو چکے تھے۔

احرار کے متعلق مسٹر انور علی کا اندازہ صحیح تھا:

ہمارا نیک نیتی سے یقین ہے کہ مسٹر انور علی نے احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دینے کے اثر کے متعلق جو کچھ کہا اس سے ظاہر ہے کہ صورت حالات کے متعلق انکا اندازہ بالکل صحیح تھا اگر یہ تدبیر مئی ۱۹۵۲ء میں اختیار کر لی جاتی تو احرار علما سے مذہبی اپیل کرنے کے قابل نہ ہوتے اور جولائی ۱۹۵۲ء میں آل مسلم پارٹیز کنونشن منعقدہ نہ ہوئی ہوتی اور اگر علما بیچ میں نہ کود پڑے ہوتے تو احمدی نزاع کو دوسرے فرقہ وارانہ نزاعات سے (جن سے ہم واقف ہیں) مختلف حیثیت دینے کی نوبت نہ آتی۔

۵ جولائی ۱۹۵۲ء کے فیصلے

۲۸ جون ۱۹۵۲ء کو یا اس کے لگ بھگ مسٹر دولتانہ مجلس اصول اساسی کے ایک اجلاس میں شریک ہونے کے لیے نتھیا گلی گئے۔ ''زمیندار'' نے اپنی اشاعت مورخہ یکم جولائی میں یہ اطلاع شائع کی کہ مسٹر دولتانہ نے روانگی سے پہلے دو گھنٹے تک اپنے افسروں سے بات چیت کی۔ حکومت پنجاب کے وکیل فضل الٰہی نے کہا کہ اس بات چیت کے دوران مین مسٹر دولتانہ نے ان فیصلوں کے متعلق اپنے افسروں کو ہدایت دی تھی جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے اجلاس مجوزہ ۵ جولائی میں ہونے والے تھے۔ مسٹر دولتانہ کو یاد نہیں کہ آیا انہوں نے دو گھنٹے کی کوئی خاص گفتگو کی تھی لیکن تسلیم کیا کہ وہ یقیناً افسروں سے قریب قریب باقاعدہ ملاقات کرتے رہتے تھے وہ یہ کہنے سے بھی قاصر ہیں کہ انہوں نے افسروں سے مجوزہ کانفرنس کے موضوع پر کوئی بات چیت کی تھی۔

اس کانفرنس کی صدارت چیف سیکرٹری نے کی اور اس میں اضلاع کے مندوبین کے علاوہ انسپکٹر جنرل ڈی آئی جی، سی آئی ڈی ہوم سیکرٹری اور ڈائریکٹر تعلقات عامہ بھی شریک ہوئے اس کانفرنس میں یہ فیصلے کیے گئے:

۱۹ جولائی ۱۹۵۲ء کو احرار کی یقین دہانی

یہ زمانہ احرار کی اس مشہور ''یقین دہانی'' پر ختم ہوا جس میں امن قائم رکھنے کا وعدہ تو کیا لیکن اچھے برتاؤ کا عہد نہ کیا۔ اس یقین دہانی پر بحث کرنے سے پہلے ہم ڈی آئی جی کی اس یادداشت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یقین دہانی سے ذرا پہلے احراریوں کے ذہن کی کیا کیفیت تھی۔ اس وقت تک ماسٹر تاج الدین اور بعض دیگر اشخاص احکام امتناعی کی خلاف ورزی کے لیے گرفتار کیے جا چکے تھے۔ مسٹر انور علی نے ۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو ایک یادداشت لکھی جس کا مفاد یہ ہے:۔

۵ جولائی ڈی آئی جی سے دو احراری لیڈروں کی ملاقات

وہ انکی معافی کی تجویز کو تسلیم نہیں کرتے

مولانا اختر علی خاں آج مولوی غلام غوث کی معیت میں جو نئے صدر احرار ہیں، مجھ سے ملنے آئے۔ ان کا مقصد یہ یقین دلانا تھا کہ ایسی تقریریں نہیں کی جائیں گی جن سے نقص امن کا احتمال ہو بشرطیکہ گرفتار شدہ لوگ رہا کر دیے جائیں اور دفعہ ۱۴۴ واپس لے لی جائے۔ میں نے انکو وہ فیصلے سمجھائے جو آج افسروں کی گفت وشنید کے بعد ہوئے تھے اور ان کو بتایا کہ اگر وہ دونوں لیڈر معافی مانگ لیں تو حکومت رہائی وغیرہ کے مطالبات پر غور کر سکے گی۔

مسٹر انور علی کے اندیشے

مولوی غلام غوث سرحدی نے کہا کہ ان کے اور انکی جماعت کے خیال میں ماسٹر تاج الدین نے کوئی قصور نہیں کیا اگر ایک دفعہ احرار پر ثابت ہو جائے کہ حکومت اپنے فیصلوں کو نہیں بدلے گی تو وہ تصفیہ پر زیادہ مائل ہو جائیں گے۔

۷ جولائی ۱۹۵۲ء: مسٹر قربان علی خاں۔۔۔۔ ''میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں کہ حکومت قانون وانتظام کو بحال رکھنے کے متعلق اپنے فیصلوں کو بدلے۔ جو چیز بھی بدنظمی پیدا کرنے والی ہو

''آئینی طریق پر'' شورش کے جاری رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

قصور میں: ۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء

(ا) ۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو قصور میں نماز جمعہ کے بعد ایک جلسہ ہوا جس کے مقررین میں ایک عالم شاہ بدمعاش بھی تھا۔ اس کے بعد چھاتی پیٹتا ہوا ایک جلوس نکالا گیا ایک آدمی نعرہ لگاتا تھا ''ظفر اللہ کنجر'' اور دوسرے آواز ملا کر چلاتے تھے ''ہائے ہائے'' اس کے بعد عالم شاہ اور ایک اور آدمی کہیں سے ایک گدھی لے آئے۔ جس پر ''بیگم ظفر اللہ'' کے الفاظ لکھ دیئے پھر اس پر ایک آدمی کو سوار کرایا اور اس آدمی کو جوتوں کا ہار پہنا دیا یہ شخص ''ٹاپ ہیٹ'' سر پر رکھے ہوئے تھا جس پر ''غلام احمد مرزا'' لکھا تھا یہ جلوس احمدیوں کے ایک کارخانے کے سامنے رکا اور پندرہ منٹ تک یہ نعرہ لگاتا رہا ''مرزائیت کو تباہ کر دو'' ''ظفر اللہ کنجر''۔ ''ظفر اللہ کتا''۔ ''ظفر اللہ سور''۔

ڈی آئی جی اور آئی جی کے ریمارک

مسٹر انور علی نے قصور کے متعلق روزنامچے پر لکھا کہ مذہبی جنونیوں اور مولویوں نے طاقت پکڑ لی ہے اور غنڈے بھی میدان میں کود پڑے ہیں۔ مسٹر قربان علی خاں نے کہا ''قانون کی خلاف ورزی کی شورشوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ایک لاقانونی سے دوسری لاقانونی پیدا ہوتی ہے اور اگر کوئی انسدادی طریقہ ممکن نہ رہے تو اس کا انجام انقلاب ہے۔ یہ تاریخ کا سبق ہے جس میں تاخیر ہو سکتی ہے لیکن اسکو جھٹلایا نہیں جا سکتا''۔

چیف منسٹر نے اس یادداشت پر حسب معمول ۱۲ اگست ۱۹۵۲ء کو اپنے مختصر دستخط کر دیئے۔

لیکن کاروائی کچھ نہیں کی

515

لیکن اب ہم ان یادداشتوں پر زیادہ اعتبار نہیں کریں گے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریر سے محض خوش بیانی منظور تھی۔ ان میں یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ ''احراریوں کے وعدے کا کیا ہوا؟'' ان بیانات میں کسی اقدام کی تجویز نہیں کی جاتی اور مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ جہاں کسی اقدام کی تجویز نہ کی گئی ہو وہاں کوئی اقدام نہیں کرتا۔ کوئی صریح بے عملی نظر آجائے تو وہ اور بات ہے اور موجودہ معاملہ یقیناً

کر دیا جاتا ہے لیکن دفعہ ۲۳ کی حیثیت بالکل تعزیرات پاکستان کی دفعات کے برابر ہے اور اگر مسٹر دولتانہ ہوم سیکرٹری سے متفق تھے (کیونکہ ان کے تصور میں بھی دفعہ ۳ ہی تھی) تو حقیقت میں یہ قانون شکنوں کی خوش قسمتی تھی کہ چیف سیکرٹری اور ہوم سیکرٹری دونوں کا تصور دفعہ ۲۳ کے متعلق وہ تھا جو دفعہ ۳ کا تھا لیکن خود مسٹر دولتانہ نے بھی تسلیم کیا کہ ۱۹۵۲ء میں ۱۹۹ اشخاص سیفٹی ایکٹ کے ماتحت پابند کیے گئے تھے اور ان میں سے ایک بھی سیاسی نظر بند نہ تھا۔

کیونکہ سیفٹی ایکٹ ایک ہوّا ہے

انہوں نے یہ بھی کہا کہ باقی رہی ہوم سیکرٹری کی یہ سفارش کہ احرار کو وعدہ یاد دلایا جائے تو میرے نزدیک ان سے کوئی مزید ملاقات ضروری نہ تھی کیونکہ میں نے ۲۷۔۲۸ جولائی کو مسلم لیگ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے احراری لیڈروں سے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ انہیں اپنے قول وقرار پر قائم رہنا چاہیے۔

لیکن کوئی تنبیہ نہ کی گئی

اسکو کہتے ہیں صفائی کا جواب پیش کرنا! لیکن ایسے جواب پریس کانفرنس میں دیے جاتے ہیں قانونی عدالتوں میں نہیں۔

(۳) ۲۶۔۲۷ جولائی کو مسلم لیگ کے دفتر کے باہر بڑے پیمانے پر مظاہرے کیے گئے۔ ایک جلسہ منعقد کیا گیا موٹر کاروں پر پتھر پھینکے گئے۔ پولیس کے بہت سے ملازم اور بعض ممبر بھی زخمی ہوئے۔ بیگم جی اے خاں بھی مجروح ہوئیں اور وہاں سے اسی حالت میں لے جائی گئیں۔ پولیس کو اشک آور گیس اور لاٹھیوں کا استعمال کرنا پڑا۔

ایک قابل اعتراض کتابچہ ۴/اگست ۱۹۵۲ء

517

(۴) ۴/اگست ۱۹۵۲ء کو ایک کتابچہ سی آئی ڈی کے علم میں آیا جس کا نام تھا ''مرزائیوں کے ناپاک عزائم'' اس کے پہلے باب میں جو بنیادی عقائد سے متعلق ہے مرزا غلام احمد کی تحریروں کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ اقتباسات کا نمونہ یہ ہے: ''جو لوگ مجھے نہیں مانتے ان میں مرد سور اور

بڑے افسروں پر رشوت اور خویش پروری کا الزام لگایا۔ مرکزی حکومت قدرتی طور پر مضطرب ہوئی اس نے رپورٹ طلب کی اور سوال کیا کہ صوبائی حکومت کا الزام لگایا۔ مرکزی حکومت قدرتی طور پر مضطرب ہوئی اس نے رپورٹ طلب کی اور سوال کیا کہ صوبائی حکومت نے اس تقریر کے متعلق کیا کاروائی کی ہے۔

مقرر گمنام آدمی ہے

اس کا جواب ملا کہ اگرچہ مولوی نے فوج کے خلاف توہین آمیز الفاظ استعمال کیے ہیں اور اسکے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ وہ بالکل گمنام آدمی ہے اس لیے اسکو نظرانداز کرنا ہی بہتر ہے۔

(۷) ۲۵ اگست ۱۹۵۲ء منٹگمری میں احراریوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں مولوی محمد علی جالندھری نے سامعین کو بتایا کہ حکومت نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ اور دفعہ ۱۴۴ واپس لے لی ''مرزائیت کوئی مذہب نہیں بلکہ تماشا ہے اور مرزائی چوہڑوں چماتروں سے بدتر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ احرار قیام پاکستان کے سخت مخالف تھے لیکن اب وہ وفادار ہیں۔ مگر احمدی اب بھی ہندوستان سے دوبارہ مل جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مرزا قادیان بدچلن آدمی تھا اسکے حرم سرا کے معاملات کے سلسلے میں کئی آدمی قتل کیے گئے۔ مرزائیوں کو اپنے پانی کے نلوں سے پانی بھرنے کی اجازت نہ دینی چاہیے اور ان کے ساتھ ایک تانگے میں بھی نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ان کو مجبور کرنا چاہیے کہ دوبارہ اسلام قبول کرلیں۔ یہ صحیح ہے کہ وزیراعظم کے اعلان مورخہ ۱۴ اگست کے جواب میں چودھری محمد ظفر اللہ خاں کا جواب قابل اعتراض تھا لیکن چونکہ اسکے چوتڑوں پر بڑے زور کی لات پڑی تھی اس لیے اس کا چیخنا قدرتی تھا''۔

چیف منسٹر نے یہ رپورٹ ۱۸۔ ستمبر ۱۹۵۲ء و ملاحظہ فرمائی۔ 520

کوئی تجویز نہیں۔ کوئی کاروائی نہیں

شاید اس مرحلے پر بھی کسی عام تنبیہ کی فکر کرنا غیر ضروری تھا لیکن قانون ملکی کہاں تھا؟ کیا اس تقریر پر کسی شخص کو شرم نہ آئی؟ لیکن ہم بھول رہے ہیں حکومت کوئی کاروائی کر ہی نہ سکتی تھی کیونکہ سی

میں اس خوش فکری کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر نذیر احمد احراریوں کے دو گروہوں میں پھوٹ پڑنے کی اطلاع سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن دوسرے پولیس افسر ایسے بے فکر نہ تھے۔ مسٹر انور علی نے اس یادداشت پر لکھا کہ گو احراری لیڈر کسی قدر تھکے ہوئے ہیں لیکن جلسوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آئی اور ابھی شورش میں خطرناک امکانات پوشیدہ ہیں۔ انسپکٹر جنرل نے ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو کہا ''اگر شورش کو اسی طرح جاری رہنے دیا گیا تو ایک دن ہمیں نہایت شدید و سنگین گڑ بڑ سے دوچار ہونا پڑے گا اور ممکن ہے اس پر قابو پانا دشوار ہو جائے۔

انسپکٹر جنرل نے گورنر کو ایک یادداشت بھیجی، چیف منسٹر کو نہیں

آپ نے یہ یادداشت ہوم سیکرٹری یا چیف منسٹر کو نہیں بلکہ گورنر کو ارسال کی۔ مسٹر انور علی کا بیان ہے کہ یہ طریقہ غالباً اس یقین کی بنا پر اختیار کیا گیا کہ شاید گورنر اس معاملے سے مرکزی حکومت کو مطلع کر دیتے۔ چونکہ ہمارا احساس بھی یہ تھا اس لیے ہم نے مسٹر انور علی سے یہ سوال کیا تھا۔ مسٹر قربان علی خان کے نزدیک صورت حالات کے تدارک کے لیے صوبائی حکومت کا رویہ اطمینان بخش نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے یہ غیر معمولی طریقہ اختیار کر کے گورنر کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ گو وزارتی نقطہ نگاہ سے خاں صاحب کا یہ رویہ قابل اعتراض تھا لیکن گورنر صاحب نے اس یادداشت پر محض اپنے مختصر دستخط ثبت کر دیے۔

صورت حالات کا جائزہ۔ اگست ستمبر ۱۹۵۲ء

(۹) ۱۹ راگست اور ۹ ستمبر ۱۹۵۲ء کے درمیان ایس پی (B) نے صورت حالت اور احمدیوں پر اس کے اثر کا جائزہ ان الفاظ میں لیا:

جولائی ۱۹۵۲ء کے بعد سے زیادہ تر ملتان، لائل پور اور منٹگمری اور جھنگ میں ایک سو چودہ مدعی احمدیت سے تائب ہو چکے ہیں۔

گیارہ احمدیوں نے بظاہر مع اہل و عیال اپنے مسکن ترک کر دیے ہیں۔

۲۵۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو وزیر آباد میونسپلٹی نے دو احمدی مدرسوں اور چار احمدی استانیوں کو

522

ملازمت سے برطرف کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس حکم کو معطل کر دیا ہے۔

مسٹر انور علی نے رائے دی کہ ''پاکستان ازمنہ وسطیٰ کی طرف واپس چلا گیا ہے'' مسٹر دولتانہ نے اس یادداشت پر ۷ ستمبر ۱۹۵۲ء کو دستخط کر دیے۔ احمدیوں کے اس تبدیلی مذہب سے ہمیں یاد آیا کہ جب سردار عبدالرب نشتر اس صوبے کے گورنر تھے تو انکا خیال تھا کہ احمدی جماعت کی طرف سے نقص امن کا کوئی خطرہ نہیں کیونکہ یہ جماعت بہت قلیل التعداد ہے۔ اس لیے اگر احمدیوں کے خلاف تہدید آمیز تقریریں کی جائیں تو نقص امن کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ ہر وقت اپنے عقیدے سے دستبردار ہو سکتے ہیں۔

ڈسکہ کی تقریریں ۲۱ ستمبر ۱۹۵۲ء

(۱۰) ۲۱۔۲۲ ستمبر کو ڈسکہ میں آل مسلم پارٹیز کنونشن ہوئی۔ اس میں جو تقریریں کی گئیں ان کے قابل اعتراض حصوں کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

مرزا غلام نبی جانباز: مرزا غلام احمد ایک مداری تھا۔ بد بخت انسان۔ عورت باز

مولوی محمد علی جالندھری: کشمیر کی لاینحل صورت کا ذمہ دار چودھری ظفر اللہ خاں ہے۔

صاحبزادہ فیض الحسن: جس طرح گیدڑ کو خربوزوں کی اور بلی کو گوشت کی رکھوالی سپرد نہیں کی جاسکتی، اسی طرح ظفر اللہ اور دوسرے مرزائیوں پر پاکستان کے متعلق اعتبار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ غدار ہیں۔ مرزا غلام احمد واہیات تھا۔ اس نے گڑ کو مٹی سمجھ کر اس سے استنجا کر لیا تھا۔ اگر مرزائی اسلام قبول نہیں کرینگے تو ہم اس مقصد کے حصول کے لیے انتہائی کوشش کریں گے اور ایسی صورت میں یہ لوگ زمینوں، کارخانوں اور بنگلوں کی الاٹمنٹیں کھو بیٹھیں گے بلکہ ربوہ بھی انکے قبضے سے نکل جائے گا۔

سید مظہر علی شاہ شمسی: مرزائی ذلیل اور کمینے ہیں، انکو عزت آبرو کا کوئی احساس نہیں۔

شیخ حسام الدین: ظفر اللہ ہندوستان سے خفیہ تعلقات رکھتا ہے اس نے فلسطین کو اس لیے تقسیم کرایا ہے کہ یہودیوں کو ایک گڑھ مل جائے اور اینگلو امریکن بلاک کے مقاصد پورے ہوں۔

سید عطا اللہ شاہ بخاری: احمدی جاسوسوں کی ٹولی ہیں (اسکے علاوہ ملکہ وکٹوریا اور موجودہ ملکہ

کے بلکہ متعلق کچھ کہا گیا جس کو نقل نہ کرنا بہتر ہے)

(۱۱) ''احسان'' مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۵۲ء نے مرزا غلام احمد کو ''بنا سپتی نبی'' بتایا اور ''جانباز پاکٹ بک'' کا اشتہار دیا جس میں مذہبی نزاع کے متعلق ناشائستہ باتیں درج ہیں۔ یہ پاکٹ بک پہلے پہل فروری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔

شیخوپورہ کی تقریریں ۱۹ اکتوبر ۵۲ء

(۱۲) ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو شیخوپورہ میں اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو چوہڑ کانہ میں کنونشن کے اجلاس ہوئے۔

صاحبزادہ فیض الحسن: جو شخص نبوت کی عزت اور دختر رسول کی ناموس کو نہیں بچا سکتا وہ پاکستان کو بھی نہیں بچا سکتا۔ مرزا غلام احمد نے کہا ہے کہ جو لوگ اسکو نہیں مانتے وہ بازاری عورتوں کی اولاد ہیں۔ پنجاب کے وزیروں نے اور خواجہ ناظم الدین نے بھی اسکو نہیں مانا، انہیں چاہیے کہ اگر وہ ناموس رسول کی حفاظت نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنی ماؤں کی ناموس کی حفاظت تو کریں۔

مرزا غلام نبی جانباز: یہ تنکوں کا سانپ۔ ظفر اللہ بیرونی دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے۔

''ہم آئینی طریق پر لڑ رہے ہیں۔ میری کتابیں خریدو''

سید مظفر علی شاہ شمسی: خواجہ ناظم الدین اور دولتانہ کو چاہیے کہ لوگوں کے جذبات کا احترام کریں۔ عوام ہی نے انکو کرسیاں دی ہیں اور وہی ان کرسیوں کو ان سے چھین سکتے ہیں۔ گورداسپور ظفر اللہ کی وجہ سے جاتا رہا، مرزائی اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے اپنی لڑکیاں تک پیش کرنے میں تامل نہیں کرتے۔

شیخ حسام الدین: ظفر اللہ جاسوس اور غدار ہے۔

چیف منسٹر نے دستخط کر دیے

ڈی۔ آئی۔ جی نے اس یادداشت پر لکھا کہ احرار برابر نفرت وحقارت پھیلانے میں مصروف ہیں۔ چیف منسٹر نے اس پر دستخط کر دیے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء کا فیصلہ

اس عنوان کے ماتحت ہم متعدد ایسی فائلوں پر متوجہ ہوں گے جو چیف منسٹر کے ساتھ گفتگو کی خاطر معرض التوا میں پڑی تھیں اور جن کے متعلق آخر ۲۴۔ دسمبر کو ایک فیصلہ کیا گیا:۔

راولپنڈی کی تقریریں ۱۵ نومبر ۵۲ء

(الف) ۱۵، ۱۶ ر نومبر ۵۲ء کو راولپنڈی میں کنونشن تقریروں کے مندرجہ ذیل اقتباسات توجہ کے قابل ہیں:۔

(۱) ماسٹر تاج الدین: ظفر اللہ کے برطرف ہونے کے بعد اس پر ایک مقدمہ دائر کیا جائے گا جس میں اسے مملکت اور اسلام کے خلاف سرگرمیوں کی جوابدہی کرنی ہوگی۔

تشدد جائز ہے

(۲) قاضی احسان احمد: یہ کشمکش غدار اور وفادار یا سچ اور جھوٹ کے درمیان ہے۔۔۔ ۔۔۔آجکل کے دنوں میں سود اور نفع، رشوت اور فیس، جاسوسی اور نبی مترادف الفاظ ہیں۔ اسلام کی حفاظت کے لیے تشدد جائز ہے اسلام کی تبلیغ کے لیے نہیں۔ مرزائی پھر ہندوستان میں شامل ہونے کے خواہاں ہیں۔

محمد مسکین: مرزائیوں کو اپنے قبرستانوں میں دفن نہ ہونے دو۔

عبداللہ شاہ: مرزائی ہتھیاروں کی ناجائز درآمد کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ مرزا غلام احمد دجال تھا جھوٹا نبی تھا۔

ماسٹر تاج الدین: (دوسرے دن) (کشمیر میں) متارکہ جنگ مرزائیوں کی چالوں سے ہوا تھا۔ دفعہ ۱۴۴ کا اطلاق مسجدوں پر انگریزی راج میں بھی نہ ہوا تھا اگر حکومت احمدیوں کو اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں ہوتی تو ان سے مجلسی اور اقتصادی مقاطعہ کرو۔ ایک من، دس سیر چار چھٹانک گولی بارود ربوہ میں درآمد کی جا چکی ہے (کس قدر ٹھیک معلومات ہیں)

حافظ محمد سعید: گوجرانوالہ میں مرددکاندار مرزائیوں کے لیے الگ برتن رکھتے ہیں (مطلب یہ کہ تم بھی یہی کرو)

مولوی محمد علی جالندھری: مرزائی زندیق اور واجب القتل ہیں ہر مسلمان کو چاہیے کہ مرزا غلام کے نام کے ساتھ لفظ ''کذاب'' شامل کر دیا کرے جو شخص کسی جھوٹے نبی کو قتل کر دے اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔

حکیم فضل کریم: مرزا شریف انسان نہ تھا۔

سید عطاءاللہ شاہ بخاری: مرزا صاحب نے کہا ہے کہ ان کو خدا سے حمل ہو گیا گویا اس کے خدا نے زیر دفعہ ۳۷۶۔ تعزیرات پاکستان جرم کا ارتکاب کیا۔

جالندھری کے خلاف اقدام کی سفارش

۲۱۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو ایس پی (B) نے رپورٹ کی کہ اب مولوی محمد علی جالندھری کے خلاف یا مقدمہ چلانا چاہیے یا اسے نظر بند کر دینا چاہیے۔ یہ امر جالندھری کے لیے باعث عزت تھا کیونکہ اس کی تقریریں خاص طور پر اچھی تھیں اور ان میں سے انتخاب کرنا بے حد مشکل تھا لیکن آخر ''انتظام'' کا پہلو منتخب کر لیا گیا اور ''قانون'' کا پہلو نظر انداز کر دیا گیا۔ بہر حال ڈی آئی جی نے ۲۵۔ نومبر ۱۹۵۲ء کو لکھا کہ چیف منسٹر صاحب نے ہدایت کی ہے کہ وہ کراچی سے واپس آ کر ایک مجلس مذاکرہ میں بات چیت کر کے فیصلہ کریں گے کہ جنگجویانہ اور فرقہ پرستانہ تقریروں کا تدارک کیونکر کیا جائے۔

لائل پور کی تقریریں ۲۶ ستمبر ۵۲ء

(ب) ۲۶۔ ۲۷ ستمبر کو لائل پور میں اور ۲۸ ستمبر کو سمندری میں کنونشن ہوئی:۔

صاحبزادہ فیض الحسن: مرزا صاحب پست چال چلن کے آدمی تھے اور اس قابل تھے کہ ان پر غنڈا ایکٹ کے ماتحت مقدمہ چلایا جاتا کیونکہ اس نے دختر رسول کی عصمت کی توہین کی تھی اور ظفر اللہ دونوں غنڈے ہیں۔

526

شیخ حسام الدین: ظفر اللہ خبیث ہے اس پر مقدمہ چلانا چاہیے۔

سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے اپنی وہی پرانی کہانی ملکہ وکٹوریہ کے متعلق دہرائی اور ساتھ ہی یہ

کہا کہ جنگ شاہی اور کھوٹہ ہوائی حادثوں کے ذمہ دار مرزائی ہیں۔

عطاءاللہ شاہ بخاری پر پابندی عائد کرنیکی سفارش

ان تقریروں پر ۱۲۸ کتوبر۱۹۵۲ء کوڈی آئی جی نے تجویز کی کہ سید عطاءاللہ شاہ بخاری پر کسی نہ کسی قسم کی پابندی عائد کرنا ضروری ہے۔ مثلاً اسکی نقل و حرکت کو ایک ضلع تک محدود کر دیا جائے تقریریں قوم کوخراب کررہی ہیں۔ ہوم سیکرٹری نے کہا وقت آ گیا ہے کہ حکومت پوری پوزیشن کا از سرنو جائزہ لے۔ تقریروں کا موضوع اور لہجہ نہایت شر انگیز ہے تجویز کی گئی کہ گفتگو کے لیے ایک اجلاس منعقد کیا جائے۔

(ج) ۱۳ اکتوبر۱۹۵۲ء کو میلہ گلوشاہ (سیالکوٹ) پر تقریریں: مولوی بشیر احمد اور قاضی منظور احمد نے کہا کہ مرزا غلام احمد کذاب اور دجال تھا اور احمدیوں سے مقاطعہ کرنا چاہیے۔ آخرالذکر نے یہ بھی کہا کہ اگر مسٹر دولتانہ مرزا صاحب کی مدد کو آئے گا تو اس کا استقبال بھی جوتوں سے کیا جائے گا۔ ''اگر مرزا غلام احمد یہ کہہ دیتا کہ اس نے اپنا سر خواجہ ناظم الدین کی بیٹی کی گود میں رکھ دیا تھا تو آپ اس کا نتیجہ دیکھ لیتے''۔ (اس میں مرزا غلام احمد کے اس رویا کی طرف اشارہ ہے جس میں مرزا صاحب نے دیکھا کہ ان کا سر دختر رسول ؐ کی گود میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس میں مرزا صاحب نے دختر رسول کا ذکر بالکل اسطرح کیا تھا جیسے کوئی اپنی ماں کا ذکر کرے)

۷ اکتوبر کی تقریریں۔ مولوی بشیر احمد نے ۱۹۳۵ء کی ایک کہانی سنائی کہ ایک شخص ڈاکٹر احسان علی نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی ایک سالی سے زنا بالجبر کیا۔ اس پر مرزا صاحب نے یہ سزا دی کہ سالی کے ہاتھ سے ڈاکٹر کو دس جوتے لگوائے۔ محبوب کے جوتوں کی ضربیں تو پھولوں کی طرح پڑتی ہیں اسلام میں زنا کی سزا سنگساری ہے اگر۔۔۔ کے خاندان کی کسی عورت سے زنا بالجبر کیا جائے۔۔۔

مولوی کرامت علی نے کہا: مرزا غلام احمد کہتا ہے ''اٹھو سورو، نماز پڑھو'' یہ اس شخص کے اخلاق ہیں اگر خواجہ ناظم الدین سنی ہے تو مرزا غلام احمد کے قول کے مطابق وہ بھی بازاری عورتوں کی اولاد ہے اور اس کے گھر کی عورتیں کتیاں ہیں۔

۹ اور ۱۰ نومبر کی سیالکوٹ کنونشن:

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری: خواجہ ناظم الدین "اللہ لوک" ہے کھانے کا معاملہ علیحدہ ہے۔بعض پہلوان صرف کھانے کے لیے ہوتے ہیں۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خواجہ صاحب ایک مرغی کھاتے ہیں، دو کھاتے ہیں یا بیس کھاتے ہیں۔

صاحبزادہ فیض الحسن: میں مرزا صاحب کو دجال اور کذاب کہوں گا۔انہوں نے ان لوگوں کو سُور کی اولاد کہا ہے جو انہیں نہیں مانتے۔خواجہ ناظم الدین اور مسٹر دولتانہ بھی اس قبیل میں آتے ہیں۔

مولانا داؤد غزنوی: قادیان اور ننکانہ عنقریب کھلے شہر قرار پائیں گے ایک احمدیوں کے حوالے کیا جائے گا اور دوسرا سکھوں کو دیا جائے گا یہ سب کچھ چودھری محمد ظفر اللہ خاں کی کوششوں سے ہوگا اور ہمارے بے وقوف وزراء صرف دستخط کر دینگے۔

ماسٹر تاج الدین: یہ چھ فٹ دو انچ لمبا مرتد، وزیر خارجہ پاکستان، منڈل اور ظفر اللہ خاں دونوں غیر مسلم ہیں دونوں کو قائداعظم نے منتخب کیا تھا۔منڈل تو بھاگ گیا اب معلوم نہیں ظفر اللہ کب بھاگے گا۔ظفر اللہ نے خود ہی اعلان کر دیا ہے کہ اگر اس نے استعفادے دیا تو وہ پاکستان چھوڑ کر چلا جائے گا اسکو باہر جانے کی اجازت نہ دینی چاہیے بلکہ اس پر مقدمہ چلانا چاہیے۔

شیخ حسام الدین: انگریزوں نے جہاد کو ممنوع قرار دلوانے کے لیے مرزائیوں کو قائم کر دیا یہ لوگ انگریزوں کے جاسوس ہیں دو احمدی افسر جن میں ایک میجر تھا اور دوسرا لیفٹیننٹ کرنل اٹک کے قریب اسلحہ کی ناجائز درآمد کرتے ہوئے پکڑے گئے لیکن پھر بھی گورمانی اور دولتانہ کو مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد کی اس بات پر یقین نہیں آتا کہ مرزائی ربوہ میں اسلحہ جمع کر رہے ہیں۔

۱۹، ۲۰ نومبر ۱۹۵۲ء کو شجاع آباد میں کانفرنس

مولوی غلام غوث ہزاروی: مرزا غلام احمد اپنی ٹانگیں اور رانیں عورتوں سے دبوایا کرتے تھے اور ان میں سے ایک عورت بھانو تھی وہ برہنہ عورتوں کو دیکھا کرتے تھے۔اور ان کے بیٹے نے تسلیم کیا ہے کہ وہ شراب پیتے تھے (خدا جانے مولوی صاحب کو خاص طور پر بھانو کی فکر کیوں ہے: عدالت)

مولوی محمد علی جالندھری۔مرزا غلام احمد اپنی ماں کا لاڈلا تھا لیکن ساتھ ہی الو کا پٹھا بھی تھا۔

ملک بدقسمت ہے جسکو خواجہ ناظم الدین جیسا وزیراعظم ملا لیکن اس کی ماں خوش قسمت ہے جس کا بیٹا وزیراعظم بن گیا۔

سید عطا اللہ شاہ بخاری: مرزا محمود احمد کا باپ پاخانے میں مرا۔ اور میرا باپ اپنے گھر میں فوت ہوا۔ جب وہ پاخانے میں مرا تو اس نے دوسرے راستے سے قے کی۔ ملکہ وکٹوریہ۔۔۔ ۔۔(وہی پرانی کہانی) مرزا صاحب نے کہا ہے کہ انہیں احساس ہوا کہ وہ عورت ہیں اور اللہ نے ان کے ساتھ جماع کیا ان کو دس مہینے حمل رہا۔ پھر درد ہوا۔ انھوں نے ایک درخت کو پکڑ لیا اور پھر وہ پیدا ہو گئے۔۔۔۔وہ دن میں کئی کئی دفعہ پیشاب کرتے تھے۔

ڈی آئی جی کا مشورہ ہے کہ قانون وانتظام کے دائرے میں یکطرفہ کاروائی نہ کرنی چاہیے

ڈی آئی جی نے ۸ دسمبر ۱۹۵۲ء کو ان تقریروں کی ایک رپورٹ پر لکھا کہ مناسب تو یہ ہے کہ ان دونوں جماعتوں پر مقدمات چلائے جائیں (احمدیوں پر بھی؟) لیکن چونکہ مرکزی حکومت احرار کے متعلق اپنا رویہ واضح نہیں کرتی اور حکومت پنجاب یک طرفہ کاروائی نہیں کرسکتی اس لیے محض تنبیہ کافی ہے۔

ہمیں یہ پڑھ کر بے حد تعجب ہوا۔ آخر قانون وانتظام کے معاملے میں ''دوطرفہ کاروائی'' کیونکر ہوسکتی ہے؟ ان مقدمات کے علاوہ جن کا ذکر (ا۔ب۔ج۔داورہ) میں آیا ہے۔ مندرجہ ذیل فائلیں بھی ۲۴ دسمبر کی کانفرنس میں پیش کی گئیں۔

احمدی واجب القتل ہیں

ا۔کیمبلپور کے مولوی عبد الحنان کی تقریر کی فائل جس میں اس نے کہا کہ مرزائی واجب [القتل] ہیں اور خواجہ ناظم الدین کافر، مرتد، احمق اور جاہل آدمی ہے۔

۲۔اس پوسٹر کے متعلق فائل جس کا عنوان تھا ''ذرا سوچیں تو ختم نبوت کا منکر کون ہے''، یہ پوسٹر احمدیوں نے اکتوبر ۱۹۵۲ء کے اوائل میں شائع کیا تھا۔ اس کا مفاد یہ تھا کہ ''اگر تمھارا ایمان ہے کہ یسوع مسیح ایک دن ظاہر ہو جائے گا تو پھر تمھارا ختم نبوت کے عقیدے سے کیا مطلب ہے؟

مقدمات اس لیے واپس لے لیے گئے کہ لوگ بہت پریشان و مضطرب ہو گئے تھے لیکن بھیرہ کے مست قلندر کا ''رگڑا'' (بانی احمدیت کے خلاف نہایت توہین انگیز اور دشنام آمیز کتابچہ) نظر انداز کر دیا گیا کیونکہ اگر اس پر مقدمہ دائر کیا جاتا تو مصنف کی شہرت ہو جاتی۔

مذہبی اور ذاتی عزت کی طرف سے بے پروائی

حکومت نے احراریوں سے یہ اقرار حاصل کیا کہ وہ احمدیوں کے جان مال اور آبرو کی حفاظت کریں گے حکومت نے خود احمدیوں کی جماعتی حیثیت سے مذہبی عزت اور اس جماعت کے بعض اہم افراد کی ذاتی عزت کی کوئی پروانہ کی یہاں تک کہ اس نے وزیر اعظم کے سرکاری وقار کی بھی کوئی پروانہ کی۔

''آزاد'' مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۵۲ء کا ایک نہایت مکروہ افتتاحیہ

ہم کہہ چکے ہیں کہ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء کے بعد بھی عام قانون معطل رہا۔ مثال کے طور پر ''آزاد'' مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۵۲ء ملاحظہ ہو (احرار کا روز نامہ جسکے ایڈیٹر ماسٹر تاج الدین تھے)

> ''آخر کب تک اس ملک میں ایک زانی، شرابی، غنڈے، بدمعاش، جعلساز، جھوٹے اور دجال کے متعلق نبی، مسیح موعود، احمد اور محمد کے نام ہمارے کانوں ڈالے جائیں گے اور کب تک ایک ایسی عورت کے لیے جو ننگ انسانیت ہے امت کی پاک اور باعصمت ماؤں کو انکی قبروں میں بے چین اور مضطرب کیا جائے گا؟'' (یہ حوالہ مرزا غلام احمد اور ان کی اہلیہ کے متعلق ہے)

مرکزی حکومت سے احمدیوں کا احتجاج

منٹگمری کے احمدیوں کی ایک احتجاجی قرار داد پر حکومت پاکستان نے ۲۱ نومبر ۱۹۵۲ء کو حکومت پاکستان نے ۲۱ نومبر ۱۹۵۲ء کو حکومت پنجاب کو توجہ دلائی۔ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے تحریر زیر کا جائزہ لیا اور رپورٹ کی کہ وہ زیر دفعہ ۱۵۳ الف و ۲۹۵ الف تعزیرات پاکستان اور زیر دفعہ ۲۱ پبلک سیفٹی ایکٹ قابل اقدام ہے۔ ایس پی (B) نے ۲۲ دسمبر کو یہ رپورٹ کی کہ احمدیوں کے خلاف توہین آمیز مضامین لکھنا ایڈیٹر ''آزاد'' کا روزانہ معمول ہے۔ ۲۴۔ دسمبر کے فیصلے سے دو دن بعد

بغرض اطلاع پیش ہوتی تھی جو موقف ظاہر کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے یہ فائلیں محض بغرض احترام ان کی خدمت میں پیش نہ کی جاتی تھیں کہ وہ وزیر انچارج تھے۔ ان کے پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ صورت حالات سے مطلع رہیں اور انہیں اس کاروائی کا بھی علم رہے جو کی جارہی تھی تا کہ اگر وہ اس کاروائی کو ناکافی یا ضرورت سے زیادہ سمجھیں تو اسکی ترمیم یا تنسیخ کردیں۔

بے عملی کی دوسری مثالیں

اسی قسم کی بے عملی ان تقریروں کے متعلق بھی نظر آتی ہے جو چنیوٹ کی ختم نبوت کانفرنس میں ۲۶ دسمبر ۱۹۵۲ء کو اور بعد کے دو دنوں میں کی گئی جن کے مندرجہ ذیل اقتباسات کا نقل کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

ماسٹر تاج الدین: ظفر اللہ پاکستان کا نہیں بلکہ اپنے خلیفہ کا وفادار ہے۔ اس کی سرگرمیوں پر نگار رکھو اور اسکو برخاست کردو۔ چونکہ علما نے احراری لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے اس لیے سرکاری دفتروں میں مذہبی بحث ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔

مولوی محمد علی جالندھری: ایک احمدی افسر نے گولی بارود کا بھرا ہوا ایک ٹرک اٹک کی آرڈیننس فیکٹری سے ربوہ بھیج دیا۔ ظفر اللہ کشمیر میں ہندوستانی افسروں کو بحال رکھنے پر رضامند ہو گیا تھا۔ وہ غدار ہے اس نے گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کرادیا۔ احرار اور مرزائی دونوں ہی پاکستان قائم کرنے کے مخالف تھے لیکن دونوں کی وجوہ مختلف تھیں۔ اول الذکر تو اسکی مخالفت سیاسی وجوہ سے کرتے تھے۔ لیکن آخر الذکر کی مخالفت مرزا غلام احمد کے الہامات پر مبنی تھی۔

سید مظفر علی شمسی: مرزا غلام احمد فاسق و فاجر تھا۔ غفار خاں تو غدار پاکستان ہونے کی بنا پر قید کردیا گیا لیکن ظفر اللہ جو رسول پاک کا غدار ہے۔ وزیر خارجہ بنا بیٹھا ہے۔

سید عطا اللہ بخاری: اگر حکومت ظفر اللہ خاں کو برطرف نہ کرتی جس طرح مسلمانوں نے خضر وزارت کو توڑ دیا تھا اسی طرح وہ مرکزی حکومت کو بھی اقتدار سے محروم کرسکتے

535

انتخابات سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارا موجودہ مقصد صرف یہ ہے کہ تحریک کو ''راستے پر لگانے'' کے رجحانات کا جائزہ لیں۔ یہاں ہم یہ بتادیں کہ خواجہ ناظم الدین بھی اس امر سے آزردہ ہوئے چنانچہ انہوں نے بیان کیا کہ ''جس شخص نے بھی مرکز پر کسی فیصلے کے صدور کے لیے دباؤ ڈالا اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ذمہ داری مرکز کی طرف منتقل ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایسی حالت میں اگر فوج اور پولیس کسی پر گولی چلاتی۔تو صوبائی لیڈر کہہ دیتے کہ سب کچھ مرکز کے حکم سے ہو رہا ہے اگر اس ہنگامے میں مرکزی حکومت ختم ہو جاتی تو صوبائی حکومت لوگوں سے کہتی کہ ''ہم شروع سے آخر تک تمہاری تائید کرتے رہے ہیں''۔

چار اخبار حکومت کے تنخواہ دار

اخبارات کو تعلقات عامہ کی ڈائریکٹریٹ سے اشتہارات کی صورت میں وسیع امداد ملتی ہے لیکن اب یہ واضح ہو چکا ہے کہ اردو کے چار اخبارات کم وبیش حکومت کے تنخواہ دار تھے کیونکہ انہیں ناخواندگی کے خلاف مہم کی تکمیل کے لیے سکولوں ہسپتالوں اور جیلوں کو اخباروں کے پرچے مہیا کرنے کے عوض میں بڑی بڑی رقمیں پیشگی مل رہی تھی۔ لاہور کے بڑے بڑے اخباروں کی نسبت پوزیشن حسب ذیل تھی:

پاکستان ٹائمز اور نوائے وقت نے تحریک سے کوئی دلچسپی نہ لی۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ احمدیوں کے حامیوں کی ملکیت تھا

''آزاد'' احرریوں کا اخبار اور ''الفضل'' احمدیوں کا اخبار (اسکی اشاعت محدود تھی) اور ''زمیندار'' احراریوں کا مشہور حامی اخبار تھا۔

''زمیندار'' اور تین دوسرے اخباروں نے حکومت کی اس مد سے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں مندرجہ ذیل رقوم وصول کریں:

آفاق	ایک لاکھ روپے (۲۶۲۵۰ کی اس رقم کے علاوہ جو اشتہارات کے حساب میں وصول ہوئی)

میں کوئی ایسی راہ عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو سابقہ راہ عمل سے الگ تھی تو مناسب یہ تھا کہ آپ نتھیا گلی میں (جولائی میں مجلس اصول اساسی کے اجلاس کے موقع پر) مجھ سے گفتگو کر لیتے۔

مسٹر حمید نظامی نے ڈی پی آر کو ملزم ٹھہرایا

ڈاکٹر قریشی نے غیر رسمی طور پر مقامی ایڈیٹروں کو چائے پر بلایا اس موقع پر مسٹر حمید نظامی نے کہا کہ اخبارروں میں اس مہم کو جاری رکھنے کے ذمہ دار خود میر نور احمد ہیں۔ ڈاکٹر قریشی کا بیان ہے کہ میر نور احمد نے اس الزام دہی کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ مسٹر حمید نظامی جب بطور گواہ پیش ہوئے تو انہوں نے بیان کیا کہ انہوں نے انگلی سے میر نور احمد کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ یہ سب سے بڑے مجرم ہیں۔ ڈاکٹر قریشی کو اصل الفاظ تو یاد نہیں لیکن وہ اس بیان کے ساتھ عمومی حیثیت میں متفق ہیں۔

جب وہ کراچی واپس گئے تو انہوں نے وزیر اعظم کو بتایا کہ ان کی رائے میں تعلقات عامہ کی ڈائریکٹوریٹ شورش کی آگ کو ہوا دے رہی ہے۔ اور یہ نہایت عجیب بات ہے کہ صوبائی حکومت کا ایک محکمہ ایک ایسے اہم معاملے میں مرکزی حکومت کی واضح اجازت یا احکام کے بغیر ایک خاص پالیسی اختیار کر لے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر مسٹر دولتانہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ تعلقات عامہ کی ڈائریکٹریٹ شورش کو بھڑکا رہی ہے تو یہ بھی نہایت عجیب معاملہ ہے۔ اس لیے کہ اس اہم مسئلے کے متعلق اخباروں کے تراشے (ان کو ضرور مہیا کیے جاتے ہوں گے اور انہیں ضرور معلوم ہوگا کہ وہ اخبارات بھی جو براہ راست حکومت کے زیر نگرانی ہیں (مثلاً آفاق) اسی راہ عمل پر چل رہے ہیں۔ لہٰذا جب مجھے مسٹر دولتانہ نے یہ بتایا کہ یہ راہ عمل ان کے علم کے بغیر اختیار کی گئی تھی تو مجھے حقیقت میں بے حد تعجب ہوا مسٹر دولتانہ نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ وہ اس معاملے کی مزید تحقیق کرینگے۔ لیکن اسکے بعد ڈاکٹر قریشی کو کوئی مزید اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

ڈی پی آر کی طرف سے ڈاکٹر قریشی کی تردید

میر نور احمد اس سے انکار کرتے ہیں کہ مسٹر حمید نظامی نے انہیں ڈاکٹر قریشی کے سامنے (میری سماعت کے اندر) سب سے بڑا مجرم قرار دیا تھا میر نور احمد الفاظ کے استعمال میں بہت محتاط ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے انکار کو اپنی قوت سامعہ کے ذکر سے محدود کر دیا ہے۔ اس سے ہمیں یہ موقع

والا اس بات کو بھول گیا کہ جولائی کے تیسرے ہفتے ہی میں ڈاکٹر قریشی نے مسٹر دولتانہ سے کہا تھا کہ وہ اخباروں کو اس شورش کی اشاعت ترک کر دینے کی ترغیب دیں اور سابقہ جواب میں کم از کم تسلیم کیا گیا ہے کہ حکومت نے کسی مرحلے پر اس نزاع کو "بلیک آؤٹ" کرنے کا فیصلہ ضرور کیا تھا۔ لہٰذا حکومت کے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے تھا کہ جولائی کے بعد اس شورش کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنا ہے۔

لیکن پالیسی تو موجود تھی

یہ تو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ (کم از کم سی آئی ڈی کی فائلوں کے مطابق) جولائی میں اخبارات کو کنٹرول کرنے کی کوئی پالیسی موجود نہ تھی۔ ۴ جولائی کی یاداشت میں مسٹر غیاث الدین احمد نے مسٹر دولتانہ کو نتھیا گلی میں یہ اطلاع دی کہ آپ کی ٹیلیفونی ہدایات کی تعمیل میں میں نے مولانا اختر علی خاں کو طلب کر کے ان سے بات چیت کی ہے یا تو مسٹر دولتانہ ہوم سیکرٹری سے کچھ اور کہتے تھے اور ڈی پی آر سے دوسرے انداز میں بات کرتے تھے یا وہ بھول رہے ہیں کہ وہ جولائی کے آغاز میں بھی ہوم سیکرٹری کو اخباروں کی نگرانی کے طریقے سمجھا رہے تھے۔

مسٹر دولتانہ نے جو یہ دعویٰ کی ہے کہ جولائی اگست میں کوئی پالیسی ہی نہ تھی اس سے بالواسطہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخباروں کی ادائیگیوں کے مسئلے پر ان کے نتھیا گلی جانے سے پہلے ان کے ساتھ گفتگو ضرور ہوئی ہوگی لیکن اگر "روپیہ صرف کرنے کے بعد" کے الفاظ میں کچھ معنی ہیں تو کم از کم اس مرحلے پر مسٹر دولتانہ کو یہ واضح کر دینا چاہیے تھا کہ ان ادائیگیوں سے ۱۹۵۰ء کی پالیسی کا مقصد فوت ہو گیا اور انہیں چاہیے تھا کہ ان ادائیگیوں سے پہلے مشورہ کر لیتے۔

"زمیندار" نے پروپیگنڈا جاری رکھا

اس سلسلے میں جتنے جوابات دیے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس پر تنقید نہ ہو سکتی ہو۔ زمیندار کے ساتھ جو کاروباری معاہدہ تھا وہ شورش کی دیوانہ وار حمایت کے باوجود کالعدم نہ کیا گیا۔ کیونکہ کسی اخبار کی پوری پالیسی پر اقتدار قائم کرنا مقصود نہ تھا۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا اخبار کی

ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ یہ سفارش اس لیے کی گئی کہ مولانا اختر علی خاں کے بیٹے منصور علی خاں نے ایک اقرار نامہ لکھدیا تھا کہ وہ قطعی طور پر مختلف پالیسی پر کاربند ہوں گے۔ ایسے وقت میں جب مارشل لاء لاہور کو اس خامکارانہ جنگجوئی سے نجات دلانے کی کوشش کر رہا تھا جس کا حامی ''زمیندار'' تھا۔ میر نور احمد نہایت معصومانہ انداز سے اسکو بے اثر کرنے کی دوا پلا رہے تھے اور اگر مرکزی حکومت بروقت احتجاج نہ کرتی تو شاید وہ کامیاب ہو ہی جاتے۔ میر نور احمد انکار کر رہے تھے کہ مرکز سے کوئی احتجاج ہوا تھا۔ لیکن اسوقت خاموش ہوئے جب انہیں ایک یادداشت دکھائی گئی جس میں کراچی سے ایک ٹیلیفونی پیغام کے ارسال کا اندراج موجود تھا۔

مختلف اخباروں خصوصاً ''آزاد'' ''زمیندار'' (صفحات ۸۹، ۸۸، ۱۵، پیپر بک) میں بعض قابل اعتراض مضامین شائع ہوئے تھے۔ وہ میر نور احمد کو دکھائے گئے اور پوچھا گیا کہ آیا انہوں نے ان کے خلاف کوئی کاروائی تجویز کی تھی انہوں نے جواب دیا کہ ان کے متعلق وقتاً فوقتاً چیف منسٹر سے گفتگو ہوتی تھی اور ہر دفعہ وہ یہی کہتے تھے کہ کاروائی ملتوی کردی جائے تا آنکہ بعض فیصلے ہو جائیں کہ مجموعی حیثیت سے تحریک کا تدارک کیونکر کیا جائے گا۔ ''زمیندار'' کے خلاف کاروائی ملتوی کرنے کی سب سے بڑی وجہ ان کے نزدیک یہ تھی کہ ایسی کاروائی سے اتنے عقدے حل نہیں ہوں گے۔ جتنے اور پیدا ہو جائیں گے۔

ڈی پی آر ''زمیندار'' کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں

۸ فروری ۱۹۵۳ء کو مرکز سے ایک تار آیا جس میں ''زمیندار'' کے دو اور ''آزاد'' کے تین مضامین کی طرف (جو سب کے سب فروری میں شائع ہوئے تھے) توجہ دلائی گئی اور امید ظاہر کی گئی کہ اخبارات کو شورش کے بھڑکانے سے باز رکھنے کے لیے ضروری تدابیر اختیار کی جائیں گی۔

...دار'' کے تعلق میں میر نور احمد نے یہ یادداشت لکھی۔ زمیندار کا رویہ احمدی مسئلے پر خاصا ناگوار ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں انتظار کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ شورش کیا صورت اختیار کرتی ہے''۔ اب وہ کہتے ہیں کہ انکے نزدیک مناسب یہ تھا کہ جب حکومت مجموعی حیثیت سے تحریک کے

لغو

یعنی ایسی کاروائی جوصورت حالات کے مناسب ہو۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی تصریحات کے جواب میں کم سے کم جولفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وہ لغو ہے۔

زمیندار منظورنظر اخبار تھا

اس میں کوئی شک نہیں کہ زمیندار بہت لاڈلا اخبار تھا میر نور احمد نے ''زمیندار'' کے تعلق میں ہرقسم کی واضح اور ضمنی مہربانیوں کوتسلیم کرنے کے بعد مسٹر دولتانہ کے وکیل کے جواب میں یہ بتایا کہ مولانا اختر علی خاں کے تعلقات خواجہ ناظم الدین کے ساتھ بہت گہرے تھےلیکن کیا کوئی اور مولانا بھی ہیں جو اس عزت کے دعویدار نہ تھے؟ ہمارے نزدیک تو قاضی احسان احمد شجاع آبادی تک بھی جو احمدی لٹریچر کا ایک چوبی صندوق لیے پھرتے تھے اس اعزاز کے حامل تھے۔ خواجہ ناظم الدین اپنے مذاکرات کو کامیاب بنانے کی امید میں ان تمام حضرات سے بخوشی ملاقات کر لیتے تھے اور اگر مولانا اختر علی خاں نے اس صورت حالات سے فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ بہاول پور سے کراچی جانے کے لیے گورنر جنرل کا وائیکنگ طیارہ تک طلب کرلیا تو اس سے محض ان کے اپنے اوصاف عالیہ کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ اختر علی خاں نے حکومت اور عوام دونوں کوممنون کرنے کی کوششیں کیں۔ لیکن آخر خواجہ ناظم الدین نے ان کے متعلق یہی رائے دی کہ وہ ایک ڈھل مل یقین سے آدمی ہیں جو کراچی میں مجھ سے ایک بات کہتے ہیں اور لاہور میں پہنچ کر کرتے کچھ اور ہیں۔

تھا''۔کئی دن بعد مسٹر دولتانہ کے وکیل مسٹر یعقوب علی خاں نے ان کو یاد دلایا کہ میر اقبال احمد تقسیم سے پہلے حکومت ہند کے ماتحت تین سو روپے ماہوار پر پبلسٹی افسر بھی تو رہ چکے ہیں۔اس پر میر نور احمد نے کہا کہ میں نے سابق میں اس بات کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ مجھ سے جو سوال کیا گیا تھا وہ میرے خیال میں اس اسامی کی خاص ٹریننگ کے متعلق تھا۔ بہرحال میر نور احمد نے یہ بھی کہا کہ چیف منسٹر ''سیاسی اعتبار'' سے ''آفاق'' میں دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے پانچ ہزار روپے کا چیک ''آفاق'' کو بطور عطیہ بھی دیا تھا۔اس کے متعلق مسٹر دولتانہ نے کہا کہ یہ رقم بعض مسلم لیگی کارکنوں نے دی تھی تا کہ آفاق کو بطور عطیہ دے دی جائے۔ کیونکہ ''آفاق'' نے مسلم لیگ کے مقاصد کی خدمات انجام دی ہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو یہ رقم مسٹر اقبال احمد کے حساب میں داخل کر کے انہیں ''آفاق لمیٹڈ'' کا حصہ دار بنالیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ میر اقبال احمد ایک دن صبح کو سو کر جو اٹھے تو انہوں نے ایک پیسہ ادا کیے بغیر اپنے آپکو پانچ ہزار روپے کے حصوں کا مالک پایا۔ لیکن ان کے والد کا بیان ہے کہ یہ روپیہ وہ نہ تھا جو لائل پور سے یا مسٹر دولتانہ سے ملا تھا۔ ''گورننگ ڈائریکٹر نے اقبال احمد کو جنرل منیجر کا عہدہ پیش کیا اور مجھے یقین ہے (زور لفظ 'یقین' پر ہے) کہ اس کو ان مزید فرائض کے معاوضے میں جو اس پر عائد ہونے والے تھے ان حصوں کو قبول کرنے کے لیے کہا۔ ہمارا خیال ہے کہ میر نور احمد تصریح کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ کاش انہوں نے اپنی اس مہارت فن کو شورش کے خلاف نشر و اشاعت میں استعمال کیا ہوتا۔

اس کے بعد چند تحریری شہادتیں ان کو دکھائی گئیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف ''آفاق'' میں مضمون لکھتے تھے بلکہ اس کو مشورے دیتے تھے اور اسکی پالیسی کی رہنمائی بھی کرتے تھے۔

''مزدور''

اخبارات کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے دو ایسے اخباروں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو امداد یافتہ گروہ میں تو شامل نہ تھے لیکن ان سے انتہائی مہربانی اور مرحمت کا سلوک کیا جاتا تھا حالانکہ وہ انتہائی ناشائستہ لٹریچر کی اشاعت کر رہے تھے۔ان میں سے ایک اخبار ''مزدور'' تھا جسکو

حالانکہ وہ انتہائی ناشائستہ لٹریچر کی اشاعت کر رہے تھے۔ان میں سے ایک اخبار ''مزدور'' تھا جسکو

سید عطا اللہ شاہ بخاری کا ایک بیٹا ابوذر شائع کرتا تھا۔ جب اس نے ڈیکلریشن کی درخواست دی اس وقت بھی معلوم تھا کہ اس اخبار کی سرگرمیاں احمدیوں کے خلاف ہونگی لیکن اس کے باوجود ایک ہزار روپے کی ضمانت لے کر اس کا ڈیکلریشن منظور کر لیا گیا۔احمدیوں کے خلاف اکھاڑے میں ایک اور مکے باز کا کون خیر مقدم نہ کرے گا اور اگر ضمانت کی ضبطی کا موقع بھی آ گیا تو نا قابل فہم دلائل اور سفسطائیت پر مبنی ایک یاداشت فی الفور تیار کی جا سکے گی۔۱۳ جون ۱۹۵۲ء کو جب اس اخبار نے مرزا غلام احمد کے متعلق ذیل کے الفاظ استعمال کیے: ''حضرت خلیفہ المسی الزنی، یدھا، ھالہ تالہ''، تو میر نور احمد نے محض تنبیہ کی سفارش کی۔ میر صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کاروائی ناکافی تھی اور حسن تناسب کے فقدان کی مظہر تھی لیکن ان کا عذر یہ ہے کہ اسی کاروائی کی تجویز ڈی آئی جی نے کی تھی۔

''آزاد''

ایک اور اخبار ''آزاد'' تھا جس کے متعلق رپورٹ کے اس حصے میں اور دوسرے مقامات پر بھی کافی ذکر آ چکا ہے۔ زمانہ زیر تبصرہ میں اس اخبار نے اتنا قابل اعتراض اور فحش لٹریچر شائع کیا ہے کہ ہمارے لیے اسکے نمونے نقل کرنا مشکل ہے۔اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ان مضامین میں سے بعض کی طرف مرکزی حکومت تین یا چار موقعوں پر حکومت صوبہ کو توجہ دلا چکی تھی ہر دفعہ یہی جواب دیا جاتا تھا کہ تنبیہ کر دی گئی ہے۔ آخر وزارت داخلہ کو یہ کہنا پڑا کہ تنبیہات چونکہ غیر موثر ثابت ہوئی ہیں اس لیے اس اخبار کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ یہ ۱۰ دسمبر ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے حکومت پنجاب نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ ہم بتا چکے ہیں کہ اس مہینے کے اواخر میں اس اخبار کی اشاعت مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۵۲ء کے ایک نہایت مکروہ مضمون کو حکومت نے بالکل نظر انداز کر دیا۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں میر نور احمد نے مجبور ہو کر سفارش کی کہ اس اخبار کو چھ ماہ کے لیے بالکل بند کر دیا جائے۔لیکن چیف منسٹر نے ان سے اتفاق نہ کیا یہاں تک کہ مرکزی حکومت نے ۲۶ فروری کو کابینہ میں ایک فیصلہ کیا

مقاصد کے اعتبار ہیں تو نظر نہیں آتا کہ مسٹر دولتانہ کو اس اصرار سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

تفاوت کے بغیر امتیاز:

البتہ اگر لوگوں پر یہ واضح کرنا سیاسی اعتبار سے مفید ہے کہ مسٹر دولتانہ بدستور مطالبات کی مقبولیت کے قائل ہیں یا ان سے منکر نہیں ہیں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

مطالبات کے متعلق مرکز کا رویہ ۲۷ فروری ۵۲ء

لہٰذا ہم آگے چلتے ہیں اگرچہ اب خواجہ ناظم الدین یہ اعلان عام کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے کہ انہوں نے مطالبات کو رد کر دیا ہے لیکن اسی دن وہ اس بات پر رضامند ہو گئے کہ تمام صوبوں کے نام ایک خفیہ تار بھیجا جائے جس میں مطالبات کے متعلق مرکزی حکومت کا رویہ واضح کر دیا جائے اس تار میں کہا گیا کہ نہ تو جمہور کے کسی طبقے کو اس کی مرضی کے خلاف غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی احمدی افسر یا وزیر خارجہ کو محض مذہب کی بنا پر ان کے عہدوں سے برطرف کیا جا سکتا ہے۔ اس تار میں یہ بھی لکھا گیا کہ مرکزی حکومت کوئی سرکاری اعلان جاری نہیں کرنا چاہتی لیکن صوبائی حکومتوں کو چاہیے کہ فی الفور انہی خطوط پر پرزور نشر و اشاعت کو منظم کریں اور اخبارات کو بھی مناسب ہدایات دے دیں۔

اس کے ساتھ ہی اخباروں میں ایک سرکاری اعلان بھیجا گیا جس میں احراریوں کی تاریخ بیان کی گئی اور اس امر کو واضح کیا گیا کہ حکومت ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی سے مرعوب ہونے کا ارادہ نہیں رکھتی اور قانون و انتظام کو بحال رکھنے کے لیے اپنے پورے وسائل کو کام میں لائے گی۔

اس مرحلے پر دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں۔ اول مسٹر چٹھہ اور ان کے دو ساتھی افسروں نے یہ واضح کر دیا کہ وہ پنجاب کی صورت حالات کا تدارک کما حقہ کر سکتے ہیں۔ دوم: ۲۷ فروری کو انہیں مطالبات کے متعلق مرکز کا رویہ صاف طور پر معلوم ہو چکا تھا اور پنجاب کے دوسرے افسروں اور وزیروں کو اس کی اطلاع دوسرے دن ہو گئی تھی۔

ثابت ہوا کیونکہ وہ دوسرے ہی دن شام کو مسجد وزیر خاں کے دامن میں ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو بے شمار زخم لگا کر ہلاک کر دیا گیا۔

عبدالستار نیازی مسجد وزیر خاں میں

مسجد وزیر خاں اندرون فصیل حصہ شہر کی ایک نہایت اہم عبادت گاہ ہے جس میں چند روز پہلے مولانا عبدالستار نیازی قلعہ نشین ہو کر تشدد اور لاقانونیت کا وعظ کر رہے تھے اور حکام نے ان پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ سول کے حکام کا عام معمول یہ تھا کہ وہ چیرنگ کراس پر کھڑے رہتے تھے (تا کہ انھیں گورنمنٹ ہاؤس جانے سے روکیں) اور شام کو سول لائنز کے تھانے میں بیٹھ کر مشورے کیا کرتے تھے۔ اب وہ کوتوالی کی طرف بھاگے یہ مقام مسجد وزیر خاں سے مختلف جگہ پر فصیل شہر کے باہر واقع ہے قریب قریب روزانہ بعض اوقات دن میں متعدد بار سول اور فوجی افسر وزارت اور گورنر سے گورنمنٹ ہاؤس میں ملاقات کرتے تھے جو سول لائنز کے تھانے کے بعد محفوظ ترین مقام سمجھا جاتا تھا۔

گورنمنٹ ہاؤس کی تین کانفرنسیں

۵ مارچ کو اس پولیس افسر کے قتل کے بعد گورنمنٹ ہاؤس میں تین کانفرنسیں ہوئیں (قبل دوپہر، بعد دوپہر اور شام۔ پہلی کانفرنس میں چند اہم فیصلے کیے گئے ایک فیصلہ یہ تھا کہ پولیس کو کھلے دل سے قوت استعمال کرنی چاہیے اور اگر صورت حالت کے بعض کوائف مقتضی ہوں تو معاملات کو فوج کے حوالے بھی کیا جا سکتا ہے۔ دوسری کانفرنس بعض ممتاز شہریوں پر مشتمل تھی ان میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی بھی شامل تھے۔ جنہوں نے اس مطلب کا بیان شائع کرنے پر اصرار کیا کہ علما سے دوبارہ مذاکرات شروع کیے جائیں گے۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ مولانا کے ٹھیک ٹھیک الفاظ کیا تھے لیکن اس کا موجودہ موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ تیسری کانفرنس کا نتیجہ بعض افسروں کے نزدیک یہ تھا کہ فائرنگ کو نرم کر دینے کا حکم دے دیا گیا۔ اس کے لیے ''Let up'' کا لفظ استعمال کیا گیا قریب قریب تمام افسر جن میں چیف منسٹر بھی شامل ہیں یہی کہتے ہیں کہ پہلی دو کانفرنسوں کی طرح اس کانفرنس کی صدارت بھی مسٹر چندریگر نے کی تھی لیکن مسٹر چندریگر کا قول یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی کانفرنس ہوئی ہے تو وہ گورنمنٹ ہاؤس کے کسی حصے میں منعقد ہوئی ہوگی جس میں، مَیں حاضر نہ تھا۔

شہادت میں جو تفاوت ہے اس کا اثر صرف اس سوال پر پڑتا ہے کہ آیا فائرنگ میں نرمی کرنے کی تجویز مسٹر چندریگر نے پیش کی تھی یا کسی اور صاحب نے خیال کیا جاتا ہے کہ اس تجویز پر عمل کیا گیا اور اس سے پولیس کے حوصلے بے حد پست ہوئے۔

اس اثنا میں شہر کے لوگ سرکاری گاڑیاں، ڈاک خانے اور دکانیں نذر آتش کر رہے تھے ریلوے کے ملازم خود انجنوں کو لوکو شیڈ سے سٹیشن پہنچنے سے روک رہے تھے اور کلرکوں کا عملہ خصوصاً سیکریٹریٹ اور دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل (دو نہایت مذہبی ادارے) میں کام چھوڑ کر بیٹھا تھا اور گستاخ و شوریدہ سر ہو رہا تھا۔ ٹیلیفون پر نہایت خیرہ چشمی سے یہ دھمکی دی گئی تھی کہ گورنمنٹ ہاؤس کی بجلی کاٹ دی جائیگی۔ اور پیغمبر اسلام کے نام پر چند احمدی قتل بھی کر دیے گئے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ فائرنگ بند ہونی چاہیے اور بعض کا مطالبہ تھا کہ ایک بیان شائع ہونا چاہیے۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہاؤس اور شہر کی اس ابتری کے باوجود ٦ مارچ کی صبح طلوع ہوئی اور ہر اہم شخص گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچ گیا۔ یہ معلوم ہی ہے کہ اس سے قبل دو پہر مسٹر دولتانہ نے اپنا وہ مشہور بیان شائع کیا جس میں اپنی طرف سے مطالبات کی منظوری کا اعلان کر دیا اور مرکز سے بھی منظوری کی سفارش کر دی۔ اس کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر مرکز نے لاہور میں مارشل لا نافذ کر دیا اور پابند قانون شہریوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس مدت کے دوران میں جو اہم ترین نکات بحث کے محتاج ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

١۔ آیا ایک امتناعی حکم ۲ مارچ کی شام سے پہلے صادر ہونا چاہیے تھا۔

٢۔ آیا اس کا اطلاق اندرون فصیل کے شہر پر بھی ہونا چاہیے تھا۔

٣۔ آیا مسجد وزیر خاں کی صورت حالات کا تدارک مناسب طریق پر کیا گیا۔

٤۔ آیا فائرنگ کو نرم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اگر کیا گیا تھا تو اس کا اثر کیا ہوا۔

٥۔ آیا فوج کے ساتھ مناسب رابطہ موجود تھا اور آیا فوج نے کاروائی کرنے سے نارضا مندی ظاہر کی تھی۔

٦۔ آیا مارشل لا کے نفاذ سے بچنا ممکن تھا۔

نیازی کی گرفتاری

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کہتے ہیں کہ انہوں نے تجویز کی تھی

لیکن دوسرے حضرات مسجد میں گرفتاری کے خلاف تھے :غالباً یکم مارچ کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ اطلاع ملی کہ مولانا عبدالستار نیازی مسجد وزیر خاں میں مقیم ہیں ''لیکن ان کی کوئی تقریر ایسی نہیں تھی جس کی بنا پر ان کو گرفتار کرنا جائز ہوتا مجھے معلوم ہوا کہ یہ شورش پسندوں کا گڑھ ہے۔۔۔ جب میں نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی تو اس کے بعد پولیس کا کام تھا کہ۔۔۔ وہاں جاتی۔۔'' ہمارے خیال میں اس وقت وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ انہوں نے فصیلی شہر کو حکم میں شامل رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر اپنی دلیل کو اسی مفروضہ پر مبنی قرار دیتے ہیں۔۲ مارچ کو یہ اطلاع ملی کہ نیازی برابر حکومت پر نکتہ چینی کر رہے ہیں اور لوگوں کے جذبات کو بھڑکا رہے ہیں۔میرا خیال ہے اس دن مارچ کی تیسری تاریخ تھی میں ان کو گرفتار کرنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اسی اثنا میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں میں نے نیازی کو گرفتار کرنے کی تجویز پیش کی کیونکہ وہ تین دن سے عوام کو اشتعال دلا رہے تھے۔تین دن پیشتر کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ نیازی کم ازکم ۲۸ فروری سے صرف مسجد میں مقیم ہی نہ تھے بلکہ اسی وقت سے عوام کو مشتعل بھی کر رہے تھے جب انکو انہی کا تحریری بیان دکھایا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ تحریری بیان میں جو کہانی لکھی ہے وہ ''اس غیر واضح معلومات پر مبنی تھی جو مجھے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس سے حاصل ہوئی تھی''۔

ہمارے نزدیک یہ ایسی صورت حالات ہے جس میں کسی گواہ کو خصوصاً ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اپنے سابقہ بیان سے منحرف ہونے کی اجازت نہ دینی چاہیے اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ موجودہ معلومات سابقہ معلومات سے زیادہ مبہم اور غیر واضح نہیں ہوگی۔واقعہ یہ ہے کہ

گرفتار کیے جا سکتے تھے لیکن ان کو گرفتار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہماری نہایت واضح رائے یہ ہے کہ مسجد وزیر خاں کے حالات ۲۸ فروری ہی سے کاروائی کا تقاضا کر رہے تھے اور یہ کوئی دور دست گوشہ نہ تھا بلکہ ساری سرگرمی کا عصبی مرکز تھا آیا انسپکٹر جنرل کے ان اندیشوں کی کوئی صحیح بنیاد تھی۔

فصیلی شہر کے متعلق انسپکٹر جنرل کے اندیشے مضبوط بنیاد پر قائم نہ تھے

جن کی بنا پر وہ فصیلی شہر میں کرفیو آرڈر کے نفاذ کو غیر ممکن العمل سمجھتے تھے اس کے متعلق ان کے بعض اپنے جوابات سے خاصی امید افزائی کی گنجائش نظر آتی ہے۔ اور اگر ہمارے سامنے یہ حقیقت موجود نہ ہوتی کہ فوج نے کسی تکلف وتصنع کے بغیر اس کام کو انجام دے دیا تو شاید ہم اپنے سوالات اس قدر یقین واعتماد سے نہ کر سکتے تھے۔

جنرل اعظم نے فصیلی رقبے پر کاروائی کا مطالبہ کیا

جنرل اعظم نے شکایت کی کہ جو عمومی کام فوج کو تفویض کیا گیا اس میں ''ہمیں فصیلی شہر سے باہر رکھا گیا حالانکہ طوفان کا مرکز اندرون فصیل کا رقبہ ہی تھا۔ ہم اس میں نہایت آسانی سے گشت کر سکتے تھے نیم دلی کی تدابیر اور ناقص قیادت کا نتیجہ تباہی کی صورت میں نکلا'' پھر گورنمنٹ ہاؤس میں صبح کو جو کانفرنس ہوئی اس میں، میں نے تجویز کی کہ ڈی ایس پی کے قتل کا واقعہ چونکہ فصیلی شہر کے رقبے میں ہوا ہے اور یہی سب سے زیادہ فساد زدہ رقبہ ہے اس لیے ہمیں وہاں مضبوط اقدام کرنا چاہیے'' جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر فصیلی شہر میں بغاوت ہو جاتی تو آپ کیا کرتے انہوں نے جواب دیا ''میں اس رقبے کو اسی طرح پاک کر دیتا جس طرح میں نے ۶ مارچ کی شام چھ بجے تک کر دیا تھا۔ بلاشبہ مسجد وزیر خاں کے فولادی دروازے کو کھولنا مناسب نہ ہوتا جہاں لوگ بند ہو کر بیٹھ گئے تھے لیکن میں نے ان کی بجلی بند کر دی، ان کے لاؤڈ سپیکر کاٹ دیے، ان پر پانی بند کر دیا اور کسی شخص کو اندر نہ جانے دیا۔ بالکل یہی تجویز میں نے اس کانفرنس میں پیش کی تھی جو ۵ مارچ کی صبح کو چیف منسٹر کی کوٹھی پر ہوئی تھی۔ اس وقت انسپکٹر جنرل نے اعتراض کیا تھا کہ کئی سال پیشتر جب انگریز نے فصیلی شہر میں [illegible]ائی کی تھی تو انہوں نے تکلیف اٹھائی تھی۔ میری تجویز یہ نہ تھی کہ شہر فوج کے حوالے کر دیا جائے

اس حصے کے آخری نتائج

اب پوری صورت حالات پر تبصرہ کرنا مناسب ہے۔

ہر شخص اس پر متفق تھا کہ احراری ایک مخالف حکومت گروہ ہے یہ لوگ قیام پاکستان کے مخالف تھے اور سردار عبدالرب نشتر کا خیال بھی یہی ہے کہ وہ اپنے اعتماد کو دوبارہ بحال کرنے کی فکر میں ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں اور پھر ۱۹۵۲ء میں مسٹر انور علی نے جو اس زمانے میں ڈی آئی جی، سی آئی ڈی تھے پرزور سفارش کی کہ ان کو خلاف قانون امکانی نتائج سے آگاہ کیا۔ ایک لاقانونی سے دوسری لاقانونی پیدا ہوتی ہے۔ ایک مکروہ شے دوسرے مکروہ شے کا باعث ہوتی ہے لیکن جب کبھی کوئی کانفرنس ہوئی یا تو ان لوگوں کو اپنی پرزور رائے تبدیل کرنے پر آمادہ کرلیا گیا یا سرکاری اخلاق نے انہیں احتجاج سے باز رکھا۔ لہٰذا مسٹر دولتانہ کہتے ہیں کہ جو فیصلے فائلوں میں درج ہیں ان پر ہر شخص متفق تھا اور حکام متعلقہ نے اس بات کی کبھی تردید نہیں کی لہٰذا ہماری رائے یہ ہونی چاہیے کہ ذمہ داری مشترک تھی گو ہمارا احساس اس سے مختلف ہے۔ مزید براں ہمارا احساس یہ بھی کہ احراریوں سے جس کو اس کا باپ کسی اجنبی کو پیٹنے پر سزا کی دھمکی دیتا ہے اور وہ بچہ یہ جان کر کہ اسے سزا نہ دی جائیگی، اجنبی کو پھر پیٹنے لگتا ہے۔ اس کے بعد چونکہ دوسرے لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں اس لیے باپ محض پریشان ہو کر بیٹے کو مارتا ہے لیکن نرمی سے تاکہ اسے چوٹ نہ لگے۔

چونکہ مرکزی حکومت مسلسل دریافت حال کررہی تھی اور سی آئی ڈی کی یادداشتیں انبار در انبار جمع ہو رہی تھیں اس لیے ۲۵ مئی ۱۹۵۲ء کو ایک کانفرنس منعقد کی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ احراریوں اور احمدیوں کے تمام جلسے ممنوع قرار دے دیے جائیں یہ اقدام بہت خوب تھا لیکن ۵ جولائی تک اس کو کانٹ چھانٹ کر بالکل ہی نیست و نابود کر دیا گیا۔ حکم امتناعی کی خلاف ورزی میں جلوس نکلتے ہیں تو نکلنے دو، جلسے ہوتے ہیں تو ہونے دو، احراریوں کے سوا کسی کو گرفتار نہ کرو، کوئی احراری گرفتار نہ کیا جائے صرف ممتاز احراری گرفتار کیے جائیں اور اگر کوئی ممتاز احراری کسی ایسے جلسے میں تقریر کرے جو

اس کی جماعت نے منعقد کیا ہو تو اسے حکومت سے استصواب کیے بغیر گرفتار نہ کیا جائے۔

اور حکام ضلع نے قدرتی طور پر اس میں ایک چوتھی ہدایت کا اضافہ کر لیا حکومت سے استصواب کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ استصواب کرنے میں دیر لگتی ہے۔ آخر حکومت کو پولیس کے سول تھانوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے اور پھر مہاجرین اور استقبال معززین کو بھی مزید دو تھانے ہی سمجھنا چاہیے۔ یہ کیس ایک کانفرنس میں پیش کرنا ہوگا لیکن اس وقت جب ساتھ آٹھ اسی قسم کی مزید فائلیں جمع ہو جائیں پھر تین مہینے کے بعد تم سنتے ہو کہ عبداللہ اور نارائن صرف ادنیٰ قسم کے لوگ ہیں، ان کے خلاف مقدمات دائر کرنے سے کوئی مفید مقصد حاصل نہ ہوگا لیکن اگر عدالتی کاروائی کی منظوری بھی دے دی گئی تو تین مہینے گزارنے کے بعد اس کی امتناعی وقعت کیا رہ جائے گی؟

اگرچہ ۵ جولائی کے فیصلے اس وقت کیے گئے جب مسٹر دولتانہ نتھیا گلی میں تھے لیکن اس امر کے قرائن موجود ہیں کہ ان کے جانے سے پہلے ان فیصلوں کے متعلق ان سے بات چیت کی جا چکی تھی ہوم سیکرٹری نے ان سے ٹیلیفون کا رابطہ بھی برابر قائم رکھا تھا۔

جہاں ایک طرف افسروں پر یہ ظاہر کیا گیا کہ ان فیصلوں سے احراریوں کی باقی قوم سے منقطع کرنا مقصود ہے وہاں دوسری طرف احراریوں کو اس امر کا موقع دے دیا گیا کہ وہ ۱۳ جولائی کو کنونشن منعقد کر کے تمام مسلم جماعتوں کے علما سے اتحاد کر لیں۔ اس چال سے احرار نے جمہور کے ایک بہت بڑے طبقے کی ہمدردیاں حاصل کر لیں کیونکہ عوام احرار کی نسبت علما کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔

جب احراریوں نے دیکھا کہ ان کے جلسے ممنوع کیے جا چکے ہیں اور بعض احراریوں کے خلاف مقدمات بھی دائر ہو چکے ہیں تو انہوں نے ایک ٹکا دے کر اپنی آزادی خرید لی۔ انہوں نے ایک بیان جاری کیا کہ انہوں نے کبھی آج تک تشدد کی تلقین کی ہے نہ آئندہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حکومت کو معلوم تھا کہ انہوں نے تشدد کی تبلیغ کی ہے یا کم از کم ان کی تقریروں کا اثر یہی ہوا ہے۔ لیکن حکومت نے یہ جانتے ہوئے بھی ان کے بیان کو اس طرح قبول کر لیا گویا احراریوں نے معافی مانگ لی ہے۔ حالانکہ صرف پندرہ روز پیشتر جب مسٹر انور علی نے ان سے معافی مانگنے کو کہا تھا تو

آخر کار جب الٹی میٹم رد کر دیا گیا تو پوری صورت حالات کو بالکل تھیٹر کے ایک پرامن تماشے کی طرح سمجھا گیا جس میں مطمئن سامعین کی دل چسپی کے لیے سٹیج پر جلوس نکالے اور نعرے لگائے جا رہے ہوں۔ ''لاہور میں جلوس قریب قریب روزانہ نکلتے ہیں اور کوئی شخص ان کی پروا بھی نہیں کرتا'' جرگے بہت ہو رہے تھے اور کارروائی بالکل مفقود تھی ''پولیس بھی موجود تھی اور فوج بھی تھی'' اور جیسا کہ ایک افسر نے کہا ہر شخص صورت حالت کے متعلق گہرے غور خوض میں مصروف تھا اور ہر شخص کو معلوم تھا کہ کیا کرنا چاہیے ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ فوج خاصا کام انجام دے سکتی تھی لیکن کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ ایسا کیوں نہ ہوا۔

> ''بعض کہتے ہیں کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا دوسرے کہتے ہیں وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا، یہ لوگ یوں ہی قیاسی باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔۔تو کہہ دے کہ میرا خدا بہتر جانتا ہے (کہف)

ہمیں یقین واثق ہے کہ اگر احرار کے مسئلے کو سیاسی مصالح سے الگ ہو کر محض قانون و انتظام کا مسئلہ قرار دیا جاتا تو صرف ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس ان کے تدارک کے لیے کافی تھے۔ چنانچہ وہ طاقت جسے انسانی ضمیر کہتے ہیں ہمیں یہ سوال کرنے کی ترغیب دیتی ہے کہ آیا ہمارے سیاسی ارتقا کے مرحلے پر قانون و انتظام کا مسئلہ اس جمہوری ''ہم بستر'' سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جسے وزارتی حکومت کہتے ہیں اور جس کے سینے پر ہر وقت سیاسی کابوس سوار رہتا ہے لیکن اگر جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ قانون و انتظام کو سیاسی اغراض کے ماتحت کر دیا جائے تو اللہ تعالیٰ ہی علیم و خبیر ہے کہ کیا ہوگا اور یہاں ہم رپورٹ کو ختم کرتے ہیں۔

محمد منیر۔ پریزیڈنٹ

ایم آر کیانی۔ ممبر